تصورِ خدا

ارشد محمود

دیباچہ

تصورِ خدا پر کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ یہ سوال میں نے خود سے بھی کئی بار پوچھا، زندگی میں کیا اور سوال کم ہیں یا دیگر موضوعات کی کمی ہے کہ تصور خدا اور انسان کے مابین جو کچھ بیتا ہے اس کا احوال جمع کیا جائے۔ کیا ایسا کرنا آج کی ضرورت تھی؟

خدا پر قلم اٹھانا ہر لحاظ سے مشکل ترین ذمہ داری اور کٹھن فیصلہ تھا۔ خدائی ذات کا تصور جتنا عظیم و برتر ہے، عامتہ الناس کے اتنے ہی گہرے جذبات اور اہل دانش کی اتنی ہی ارفع بصیرت اس گتھی کے ساتھ وابستہ رہی ہے لیکن خدا کے بارے میں ہمارے ہاں غیر مذہبی حوالے سے کوئی زیادہ علم موجود نہیں۔ اس سلسلے میں مجلّہ ''نگار پاکستان'' کے دو خدا نمبر کو قابل تحسین کام کہا جاسکتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہمارے لٹریچر میں یہ بڑا علمی خلا ہے۔ ابھی تک اردو زبان کے علمی اثاثے کچھ نازک موضوعات کے حامل علم سے محروم ہیں۔ ہمارے ہاں فکر و عقل پر قدغن کی روایت اتنی شدید رہی ہے کہ بیک وقت ریاستی، معاشرتی اور سیلف سنسر شپ کارفرما ہوتے ہیں۔ ایسے میں کسی اتھارٹی کو بے لباس دیکھ کر بھی ننگا نہیں کہا جاتا بلکہ ایک دوسرے کے تال پر اسے لباس فاخرہ قرار دے کر واہ واہ کی صدائیں بلند کی جاتی ہیں کہ ہر ایک کو نہ صرف اپنی جان، مال اور عزت پیاری ہوتی ہے بلکہ ان میں اضافہ بھی درکار ہوتا ہے۔ جو قائم شدہ افکار اور اقدار حیات کی بڑھ چڑھ کر تحسین سے ہی ہوسکتا ہے مگر کسی کی سوچ پر تو کوئی قدغن نہیں لگا سکتا۔ اس لئے پابندی ہمیشہ اظہار پر لگتی ہے۔ اگر ریاستی پابندی نہ بھی ہو اور معاشرتی پابندیاں بھی وقت کے ہاتھوں اپنی موت آپ مر رہی ہوں تب بھی اندر کا خوف خود عائد کردہ سنسر شپ بن کر تخلیق علم اور تہذیب فکر کے عمل میں رکاوٹ بنا رہتا ہے۔ اس سے سماجی ترقی کا عمل سست پڑتا ہی ہے البتہ تحقیق و اصلاح کی مخالف قوتیں (Obscurant Forces) معاشرے کو جہالت کی تاریکی میں ڈبوئے رکھنے کے لئے مزید حوصلہ مند ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح کے حالات میں جامد معاشروں کے ذہین افراد (Intelligensia) میں بھی افسوس ناک رویے پیدا ہو جاتے ہیں جو وقت کا پہیہ الٹا چلانے کے مترادف ہوتا ہے۔

مثلاً ہمارے ہاں ''اپنی اقدار'' پر زور دینے کا بہت فیشن ہے۔ ذرائع ابلاغ پر کچھ بھی ایسا پیش کرنے پر سختی سے پابندی کی بات کی جاتی ہے جو ''ہماری'' اقدار کے خلاف ہو۔ اب یہ ''ہماری اقدار'' والی ترکیب بڑی عجیب ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا کہ اقدار کبھی مستقل طور پر جامد و ساکت ہوگئی ہوں۔ یا تو معاشرے اپنی پیاری قدروں سمیت فنا ہوگئے یا پھر وہ بدلتی اقدار کو اپنا کر فطرت و حیات کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھتے رہے۔ سوال یہ ہے یہ ''اقدار'' کب تک ''ہماری'' رہیں گی۔ تاریخ اور قوموں کے پیمانے تو بڑی بات ہے اگر ہر شخص خود اپنی زندگی کا جائزہ لے تو اسے احساس ہوگا

کہ کل کی کتنی عزیز اقدار اسے بتائے بغیر زندگی سے یوں خارج ہو گئیں کہ پتہ بھی نہیں چلا۔

ہمارے ہاں اس فکری جمود کے شاخسانے کا دوسرا فیشن یہ ہے کہ ہم اگر بڑی دانش ورانہ ترنگ میں آئیں تو تمام مسائل کا حل معاشرے سے زیادہ سے زیادہ کہنہ اقدار کی طرف لوٹ جانا تجویز کرتے ہیں۔ دلیل یہ کہ ہم نے پرانی اقدار چھوڑ دی ہیں اس لئے قوم اخلاقی طور پر بے راہ رو ہو گئی ہے! جب کہ مسئلہ الٹا ہے۔ پرانی اقدار تو اب لوٹ کر نہیں آ سکتیں۔ معاشرے کی بے راہ روی اس لئے ہے کہ ہم نئی اقدار پیدا نہیں کر رہے یا ان سے خوف زدہ ہیں اور انہیں قبول نہیں کر رہے۔

پتہ نہیں یہ بات صحیح ہے کہ نہیں کہ انسان بنیادی طور پر سہل پسند واقع ہوا ہے اسی لئے تو وہ افراد جو مشکل پسند ہوتے ہیں، وہ مثالی قرار پاتے ہیں، ہیرو اور دیوتا بن جاتے ہیں۔ تمام قائدین مذاہب، صوفیوں، فلافسروں، مفکروں، سائنسدانوں اور انقلابیوں کی جو بات انہیں عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کی مشکل پسندی تھی۔ وہ اپنے مروجہ حالات پر مطمئن نہیں ہوئے بلکہ نئے افکار، نئی اقدار، نئی راہوں اور نئی صداقتوں کی جستجو میں چل پڑے۔ یہ کام صاف ظاہر ہے بڑے جوکھم کا ہے۔ ایک تو بنی بنائی جگہ اور روایتی رشتوں کو چھوڑ دینا اور دوسرے ان دیکھی منزلوں کی طرف گامزن ہو جانا، جن کی طرف بنے بنائے راستے نہیں جاتے۔

نہ جانے ماہرین 'ذہانت' کی کیا تعریف کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی تعریف مشکل پسندی بھی کی جا سکتی ہے کیونکہ تمام ذہین افراد اصل میں مشکل پسند ہوتے ہیں۔ وہ خود کو انتہائی مشکل صورت حال میں ڈالتے اور انتہائی پیچیدہ گتھیوں میں خود کو الجھاتے ہیں تا کہ آنے والی نسلوں کے لئے نئی منزلوں کی جانب راہیں آسان ہو جائیں۔

ہمارے ہاں صورت حال مختلف ہے، معاشرے کا بیشتر ذہین و فطین طبقہ Middle Class Intelligensia and intellectuals جسے اپنی فطرت کے مطابق بے چین، مشکل اور اختراع پسند ہونا چاہیے، وہ سہل انگیزی کی راہ پر چل رہا ہے اور ان مصنوعی لیکن جذباتی اور مقدس مسائل کی زلفوں کا اسیر ہے جو Establishment نے اپنے مفادات کے لئے پیدا کر رکھے ہیں۔ وہ ایسی بات برملا کہنے کی جرات نہیں کرتا جس سے ''ہماری سماجی و قومی اقدار'' خطرے میں پڑ جائے حالانکہ اقدار ہوں یا نظریات وہ گزرتے وقت کے پہیے کے نیچے آ کر ہر آن دم توڑتے رہتے ہیں اور زندہ قومیں ہر وقت نیا انداز نظر وضع کرنے اور نئی اقدار کو پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔

مقدس چیز وہ ہوتی ہے، جس پر زیادہ سے زیادہ عرصے تک ہاں میں ہاں ملائی جاتی رہے اور کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کی جرات نہ ہو اور نہ خیال آئے لیکن فکر نو کے لئے کہیں نہ کہیں سے اور کبھی نہ کبھی تو Breakthrough ہونا ہی ہوتا ہے کہ فطرت کو ٹھراؤ قطعی نامنظور ہے۔ ہمارے معاشرے کے معزز ذہین افراد اور اہل دانش سے پوچھ لیجئے کہ ان کی فکر میں جو روشنی اور خوبصورتی پیدا ہوئی، کیا وہ ایسی تحریروں کے مطالعہ کی دین نہیں جو ہمارے قائم شدہ نظریات اور اقدار کے خلاف تھیں اور اگر ایسا ہے تو عوام کے سامنے ایسی باتوں کو کیوں نہ آنے دیا جائے تا کہ ان کے سوچنے کی سطح بھی بلند ہو اور معاشرہ صحت مند ترقی کی طرف بڑھ سکے۔ ہمارے ہاں عقل و خرد اور تبدیلی و ترقی کی مخاصمانہ قوتیں جو دندناتی پھر رہی ہیں، معاشرے میں برداشت

کی کمی، فاشزم اور تفرقہ بازی میں اضافہ کیا اس وجہ سے نہیں کہ ہماری سوسائٹی صدیوں سے تنگ کنوئیں کے اندر بند پڑی ہوئی ہے؟ کیا ذہن تک افکار کی تازہ ہوائیں آنے اور علم کی کرنیں پڑنے دی گئیں......؟

پس ماندہ اقوام میں ایک فکری ''رینے سانس'' (فکر نو کے احیاء کا عہد) برپا کرنے کی اشد ضرورت ہے لیکن یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک قوم کے افراد اور اداروں کو فکری اٹانومی (خود اختیاری) نہ دی جائے۔ فکری اٹانومی مہیا کئے بغیر ہماری قوم کے تخلیقی سوتے کبھی رواں نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ایک آزاد، خوشحال اور تعلیم یافتہ پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ کیا آج ہمارے ہاں علم اور دیانت کمزور ترین اقدار اور منافقت و جہالت طاقت ور ترین ادارے نہیں بن گئے......؟

پھر ریاست اور معاشرہ کن اقدار و نظریات کی حفاظت کے چرچے کرتا ہے۔ زیر نظر کتاب کا مقصد مروجہ فکری نظام کے ٹھہرے تالاب میں ایک کنکر پھینک کر سوال کرنے کے عمل کو تحریک دینے کی سعی کرنا ہے تاکہ لوگ جسے سچ مانتے ہیں، اسے پوری تفہیم اور واضح ایقان کے ساتھ سچ مانیں۔ عقل ہی فطرت کو سمجھنے کا واحد آلہ ہوسکتی ہے۔ عقل، فطرت اور خدا...... تینوں ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہوسکتے جب کہ مروجہ تصورِ خدا اور اس کے نام پر قائم شدہ نظام الافکار اور عقل کے درمیاں واضح اختلاف موجود ہے۔ جب بھی سوال اٹھایا جاتا ہے کہ مذہب، سائنس اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ تو نہیں؟ تو اس کے جواب میں ہمارے اہل دانش نے صاف اور ٹھوس موقف کبھی اختیار نہیں کیا۔ کیا موجودہ نام نہاد مذہبی تعلیم کا فروغ تفرقے بازی، تنگ نظری، متعصب اور غیر سائنسی فکر کا سبب نہیں ہے؟ کیا اس سوچ کے دائرے محدود نہیں ہوئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب سائنس کے فروغ میں کوئی رکاوٹ نہیں تو یہاں سائنس سے مراد صرف مشینیں اور ان سے متعلقہ علم ہی لیا جاتا ہے جب کہ سائنس صرف مشینیں پیدا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ سائنس سماجی دنیا، زندگی اور کائنات کے بارے میں اک مخصوص طرز فکر بھی پیدا کرتی ہے جو لازمی طور پر مذہب کے دیئے ہوئے نقطہ نظر سے اختلاف رکھتی ہے۔ اس کھلی حقیقت کو واضح طور تسلیم نہ کرنا صداقت سے گریز ہوگا۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد عقل کے دیئے ہوئے علم کے مطابق اپنے مذہبی عقائد کو پالش اور انہیں ایڈجسٹ کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

اگلے صفحات میں خدا کے تصور کی کہانی پیش کی جارہی ہے۔ خدا کی کہانی خود انسان کے شعور کے ارتقاء کی داستاں ہے۔ اگر گہری توجہ نہ دی گئی تو اس کتاب کے بعض مندرجات کچھ لوگوں کے لئے صدمہ کا باعث ہوسکتے ہیں۔ میں ان سے معافی کا خواستگار ہوں اور ان کے عقائد اور ان کے حق ایمان کا دل سے احترام کرتا ہوں لیکن کیا کیا جائے کہ ایسے صدمے سے دوچار خود ڈارون کو بھی ہونا پڑا تھا جب فطرت اسے ایسی کہانی سناتے ہوئے نظر آئی جو بڑے مذاہب کی پیش کردہ کہانی سے قطعی مختلف تھی...... لیکن خود فطرت کی بتائی ہوئی کہانی سے انکار ممکن نہ تھا۔

زیر نظر کتاب کا مقصد اس سوال کو اٹھانا ہے کہ کیا خدا کے ساتھ جذباتی اور اندھے عقیدے کی بجائے عقل و خرد کا رشتہ استوار نہیں کیا جاسکتا؟ دیکھا جائے تو جسے ہم خدا کہتے ہیں، وہ کسی کے ماننے یا نہ ماننے کا محتاج نہیں، پھر ہم اس کے نام پر کشت وخون کرنے پر آمادہ کیوں ہوجاتے ہیں؟ کیا خدا کی قوت و دانش ہم سے کم ہے؟ جس نے اثبات و نفی کی دنیا خود ہی تخلیق کی

ہے۔ ہم کیوں سوچتے ہیں کہ خدا کا وجود وتصور صرف جذباتی ایمان سے ہی قائم رہ سکتا ہے اور اسے لٹھ باز محافظوں اور ہر آن تشدد پر آمادہ دلالوں کی ضرورت ہے۔

کسی سے پوچھ کر دیکھیں۔ خدا یا مذہب کیا ہے؟ وہ اس سوال کا جواب خود اپنی علمی سطح کے مطابق دے گا۔ اس کے جواب سے پتہ چلے گا کہ خود اسے کتنا Exposure مل چکا ہے۔ ملا کا تصور خدا اور ہوگا اور ایک سائنس دان کا اور...... اس کا مطلب ہوا، خدا کیا ہے؟ کا تعین خود انسان اپنے علمی پس منظر کے حوالے سے ہی کرتا ہے۔

چنانچہ اس کتاب کا ایک مقصد ہزاروں سال پرانے تصور خدا کو آج کے انسانی علم کے مقابل رکھ کر اس کا از سر نو جائزہ لینا ہے کیونکہ وہ دن زیادہ دور نہیں لگتا جب کعبہ ارض سے سب مرئی اور غیر مرئی بت رخصت ہو جائیں گے۔

آخر میں ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حرف آخر نہیں ہے، محض سوچنے سمجھنے کی ایک کاوش ہے، نئے اور غیر روایتی رخ کو جانے بغیر صداقت اور علم کے دروازے نہیں کھل سکتے۔ ان دوستوں کو سامنے آنا چاہیے جو مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور اہلیت بھی تاکہ جو سوالات تشنہ رہ گئے ہیں یا صرف نظر ہو گئے ان پر مزید روشنی پڑ سکے۔

ارشد محمود

ابوظہبی

قدیم تہذیبیں اور تصورِ خدا!

کسی بھی چیز کے بارے حقیقت پسندانہ رائے تک پہنچنے کے لئے اس کے ماخذ (Origin) کی طرف لوٹنا پڑتا ہے یعنی اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ اس چیز کی اول اول ابتداء کیسے ہوئی اور وہ کن ارتقائی مراحل سے گزر کر اپنی موجودہ شکل و صورت میں ہم تک پہنچی ہے۔

معلوم انسانی تاریخ سے لے کر آج تک انسانوں کی کوئی ایسی بستی نہیں ملی جہاں مافوق الفطرت ہستی کا تصور موجود نہ رہا ہو۔ مختلف ادوار اور مختلف جغرافیائی خطوں کی ثقافتوں میں انسان نے اپنے شعور اور علمی سطح کے مطابق خدا کے بے شمار نظری اور مادی روپ تراشے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ انسانی ذہن میں خدا کا تصور کب پیدا ہوا، خود انسان کی عمر کا اندازہ لگانا ہوگا۔ آفرینش انسان کے علم (Anthropology) کے مطابق قابل امتیاز نیم انسانی نسل تیس لاکھ سال پہلے وجود رکھتی تھی جو سیدھا چلتا تھا۔ ہاتھوں کی ساخت مکمل طور پر ترقی پا چکی تھی۔ وہ پتھر کے اوزار استعمال کرتا تھا اور خوراک کا انتظام وطعام مل کر کیا کرتا تھا البتہ بہتر طور پر قابل شناخت انسان (Homo Erectus) 5 لاکھ سال پہلے ملتا ہے۔ جب وہ آگ کا استعمال سیکھ چکا تھا، کمیونٹی بنا کر غاروں میں رہتا تھا اور آپس میں یکساں زبان استعمال کرتا تھا۔ اس کے دماغ کا سائز تقریباً آج کے انسان کے برابر تھا۔

قدیم ترین مذہبی خیالات کے شواہد آثار قدیمہ کی کھوج کے مطابق عراق، چین اور یورپ کے کچھ حصوں میں صرف ایک لاکھ سال سے لے کر 35 ہزار سال پہلے تک ملتے ہیں۔ ان قدیم ترین انسانوں کی ایک قسم کو Neanderthal کہا جاتا ہے۔ ان کے مقامات تدفین سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے مذہبی خیالات رکھتے تھے۔ جن کا تعلق موت سے تھا۔ جن سے یہ شہادت ملتی ہے کہ موت کو کسی اگلی دنیا میں جانے کی راہ سمجھا جاتا تھا...... جو کہ ہمیشہ سے ایک بنیادی مذہبی عقیدہ رہا ہے۔ پچاس ہزار سال قبل جدید نوح انسانی Homo Sapien کا آغاز ہوا۔ اس دور کو جسے Paleolithic Period کہتے ہیں، بہت سے نسوانی مجسمے ملتے ہیں جن سے ایک ایسی ''عظیم ماں'' کا تصور ملتا ہے جو تمام زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اولین زمانے میں زیادہ تر نسوانی تصور خدا (دیوی) ہی پایا جاتا تھا، صاف ظاہر ہے انسان کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ تھا کہ عورت ہی پیدائش کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ دنیا کی دیگر اشیاء کو پیدا کرنے والی ہستی بھی نسوانی ہی ہوگی۔ ہماری زمین پر آخری برفانی دور 11000 سال قبل از مسیح ختم ہوا۔ 8000 سال سے 6000 سال قبل از مسیح میں انسان نے شرق قریب (Near East) میں فصل اگانا سیکھ لیا اور کاشتکاری کا یہ فن اگلے کچھ ہزار سال میں یورپ، ایشیاء اور افریقہ کے علاقوں میں پھیل گیا۔ اس دور کو

Neolithic Period کہتے ہیں۔ زراعت نے انسانی زندگی اور ان کے مذہبی خیالات کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ اب انسان اپنی بستیاں بسا سکتا تھا۔ چنانچہ گاؤں، شہر اور معاشرتی زندگی تشکیل پانے لگی۔ پیشوں میں تنوع پیدا ہوا۔ کچھ زراعت میں مشغول ہو گئے اور کچھ صنعت و حرفت اور دیگر فنون کو ایجاد کرنے لگے۔ ترقی کے اس مقام پر فرصت اور ضرورت نے تحریر کو ایجاد کیا جس سے قبل از تاریخ کا زمانہ ختم ہو گیا۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ اس دور کے انسان کے مذہبی خیالات کی زیادہ تر دلچسپی ''مادر ارض'' (Mother Earth) کے ساتھ ہی تھی۔ شہری تہذیب کا آغاز ساڑھے تین ہزار سال قبل از مسیح شروع ہوا اور عظیم دریاؤں کے کناروں پر شرق قریب، مصر، ہندوستان اور کچھ دیر بعد چین میں تہذیبیں آباد ہونے لگیں۔ اسے (Bronze Age) کہتے ہیں۔ پھر 1200 قبل از مسیح میں لوہے کا زمانہ (Iron Age) شروع ہوتا ہے۔ جب کلاسیکل مذاہب کی عظیم مملکتیں (Empires) وجود میں آئیں اور یہی وہ وقت تھا جب آج کے زمانے کے موجودہ مذاہب کا بیج پھوٹا۔

اب اگر مجموعی انسانی تاریخ کو دیکھا جائے تو موجودہ مذاہب کی عمر انسانی عمر کے مقابلے میں انتہائی قلیل نظر آتی ہے ......اور یہ بالکل ایک حالیہ وقعہ Recent Phenomenon دکھائی دیتا ہے۔ گویا لاکھوں سال انسان کی زندگی یا تو کسی بھی طرح کے مذہبی خیالات کے بغیر گزری یا پھر ان کا آج کے منظّم مذاہب کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ کلاسیکل مذاہب کی خصوصیات میں فطرت کے کثیر دیوتاؤں کا وجود، مقدس بادشاہتیں، طاقت ور ملائیت اور بعض اوقات مقدس تحریروں کا وجود شامل ہے۔ اس دوران مذہبی مراکز یعنی عبادت گاہیں تعمیر ہونے لگیں اور لوگ چھوٹی چھوٹی عبادت گاہوں میں پوجا کرنے لگے۔ قدیم مصر کے غیر سامی لوگ تین ہزار سال قبل از مسیح درجنوں شہری ریاستوں میں رہتے تھے۔ ہر شہر کا اپنا ایک سردار اور دیوتا ہوتا تھا۔ شروع شروع میں ریاست کا انتظام بزرگوں کے ہاتھ تھا۔ جس نے بالآخر بادشاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ ان لوگوں کی ساری زندگی کا تانا بانا معبد کے گرد گھومتا تھا۔ بادشاہ سب سے بڑے مذہبی پیشوا کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ معبد کی عمارت پر ایک مینار بنایا جاتا جس پر اس وقت کا ملا (پروہت) چڑھ کر دیوتاؤں سے سیلابوں کے نہ آنے کی دعا مانگا کرتا تھا۔ جو دریائے نیل کے کنارے ان بسنے والے لوگوں کی زمینوں کو برباد کر دیا کرتے تھے، ہر فرد معبد کمیونٹی کا رکن ہوتا تھا جو اپنے اپنے مقامی دیوتا سے وابستہ ہوتے اور اپنے ہی معبود کے گن گاتے ان لوگوں کے تمام فنون اور ادب بنیادی طور پر مذہبی نوعیت کے تھے۔ ان عراقی سمیری (Summerians) لوگوں کا عقیدہ تھا کہ انسان دیوتاؤں کی خدمت کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور اس میں ناکامی سزا کی مستوجب ہوگی۔ زندگی کے سب پہلو انہی دیوتاؤں کی تنظیم و ترتیب پر چل رہے تھے۔ فطرت کے ہر مظہر کے نام پر ایک دیوتا تھا جو انسانوں جیسی زندگی گزارتا تھا۔ مثلاً آینلل بارش دیوتا سب سے اہم تھا کیونکہ وہ سیلاب لاتا، جس سے لوگ نہایت خوفزدہ رہتے تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ بائبل کی سیلاب نوح کی داستان پرانی عراقی تہذیب (Mesopotamian) کے لوگوں کی ایک سیلابی متھ (Myth) کا ہو بہو چربہ ہے۔ اس زمانے کے دیگر دیوتاؤں میں خالق دیوتا (Atum) تھا جو نہایت قدیم سمندر سے اٹھا تھا اور کسی ابتدائی چٹان پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ہوا (Shu) اور پانی Tefnut کے دیوتا پیدا کئے اور انہیں سے زمین کی دیوی Geb اور آسمانوں کا دیوتا Nut پیدا ہوئے۔ پھر وہ حیات یعنی

دریائے نیل کے دیوتا اوسیریز (Osiris) اور تخلیق نو کی ملکہ آئی سس (Isis) کے والدین بنے اور انہیں سے موت دیوتا Set اور مردوں کے محافظ دیوتا Nephthys پیدا ہوئے۔ اس سمیری قوم کے دور کا خاتمہ اس وقت ہوا جب شمال سے سامی قوم نے انہیں زیر کر کے 2340 قبل مسیح میں غلبہ حاصل کر کے دنیا کی پہلی شہنشاہیت (ایمپائیر) کی تشکیل کی۔ اور شہر بابل کو عروج ملنا شروع ہوا۔ ادھر مصر میں انسانی صورت وصفات والے دیوتاؤں کی پرستش عام تھی۔ ایک تخمینے کے مطابق اہل مصر کے دو ہزار دو سو معبود تھے۔ مصریوں میں ہمیشہ سے سب سے بڑے خدا کا تصور سورج دیوتا سے وابستہ رہا ہے۔ اسی لئے بادشاہوں کو سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ بادشاہ کی حیثیت خود خدا جیسی ہی تھی۔ تصور کیا جاتا تھا کہ وہ اس دنیا میں ایک اچھا دیوتا ہے اور مرنے کے بعد وہ عظیم دیوتا میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ انسانوں اور دیوتاؤں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرتا۔ دنیاوی معاملات میں اس کی حیثیت سپریم مذہبی پیشوا کی تھی۔ دیگر مذہبی پیشوا شرعی معاملات میں اس کی مدد کرتے تھے۔ ابھی اسے فرعون کا لقب نہیں ملا تھا۔ عوام کو اس تک رسائی میسر نہیں ہوتی تھی۔ یہ عقیدہ تھا کہ بعد از موت زندگی صرف بادشاہ کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ اس سے عام مصریوں کی تسلی ہو جاتی تھی کہ بہر حال ان کی تہذیب باقی رہے گی۔ مصری کثیر دیوتاؤں کے علاوہ بادشاہ کی بھی پوجا کرتے تھے۔ دیوتاؤں کے واضح قسم کے فرائض اور اختیارات نہیں تھے۔ وہ فطرت (Nature) کی قوتوں کی نمائندگی کرتے اور انہیں حیوانی اشکال میں پیش کیا جاتا تھا۔ مصری تہذیب پہلی تہذیب ہے جس نے بعد از موت زندگی کا تصور دیا تھا۔ دو ہزار سال قبل مسیح میں دیگر سیاسی اور اقتصادی حالات تبدیل ہونے کی وجہ سے دنیائے مذہب میں بڑی اہم تبدیلیاں آئیں۔ مصری اس عقیدے پر پہنچ گئے کہ ایک خوش کن بعد از موت زندگی تک ان کی رسائی ہو سکتی ہے۔ بعد از موت زندگی کا تصور ان کے ہاں اس وجہ سے آیا کہ سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد زرخیزی اور بار آوری حیات کے دیوتا اوسیریز (Osiris) کے مرنے اور پھر پیدا ہو جانے سے یہ امید پیدا ہوئی کہ حیات جاودانی ہر ایک کو مل سکتی ہے! یعنی حیات بعد از موت کا اولین تصور سیلاب میں تباہ ہونے، پھر سے کھیتوں میں زرخیزی وشادابی بحال ہو جانے اور موسموں کے لوٹ آنے سے پیدا ہوا۔ انسان نے دیکھا کہ وہ پتے جو سوکھ جاتے ہیں وہ پھر سے ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے انسان بھی مرنے کے بعد پھر زندہ ہو جائے گا۔ اوسیریز دیوتا نے منصف اعلیٰ کا منصب بھی سنبھال لیا۔ اس کی منشا و مرضی پر تھا کہ وہ جسے چاہے ''مقدس اور متبرک میدان'' میں داخل ہونے کی اجازت دے۔ ایسی تحریریں بھی وجود میں آنے لگیں جن میں بااخلاق اور راست باز زندگی کے اصول بیان کئے جانے لگے۔

1400 سے 1200 سال قبل از مسیح میں دور کانسی کے بعد لوہے کے دور کا آغاز شرق قریب (Near East) کی تہذیب میں ایک نقطہ انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں ایک کنعان قوم ابھری۔ عہد نامہ قدیم Old Testament کے بیان کردہ بہت سے واقعات انہی کنعانیوں کے اساطیری قصوں (Myths) سے ماخوذ کئے گئے ہیں۔ کنعانیوں کا سب سے بڑا دیوتا ''ایل'' (EL) تھا۔ وہ اسے مادے سے بالکل جدا مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس نے سب مادی چیزوں کو پیدا کیا ہے لیکن ایل (برتر ہستی) کا تصور بعد ازاں پارہ پارہ ہو کر کثیر معبودوں میں منقسم ہو گیا۔ ان کے ہاں بعل (BA,AL) دیوتا کی بڑی اہمیت

تھی۔ جو زندگی اور موت کا دیوتا تھا۔ اس کا بت بیل پر سوار دکھایا جاتا، جو تولیدی قوت کا مظہر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ زمین کی زرخیزی بعل اور اس کی شریک حیات آستارتہ Astarte دیوی کے جنسی اختلاط کے عمل کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ زمین کی زرخیزی کو یقینی بنانے کے لئے وہ دیوتاؤں کے مقدس جنسی اختلاط (Prostitution) کی نقل بھی کیا کرتے تھے۔ بعل دیوتا کے لئے بچوں کی قربانی بھی دی جاتی تھی۔ یہ رسم اس تخیل پر مبنی تھی کہ پاک اور معصوم ہونے کی بنا پر ان کی قربانی دیوتا کا غصہ فرو کرنے کے لئے زیادہ کارگر ہوتی تھی۔ گویا بچے کو خدا کی راہ میں قربان کر دینے کا تصور اس زمانے میں موجود تھا۔ جس کا پرتو ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ اسرائیلی انبیاء سختی سے ان قدیم مذہبی روایات کی مذمت کرتے تھے لیکن اسرائیلی اکثر بعل دیوتا کی طرف رجوع ہو جاتے تھے تاکہ ان کی فصلیں اچھی طرح اگ سکیں۔ دراصل اسرائیلیوں کا یہ عمل ان کے اور کنعانیوں کی ثقافتوں کے تضاد کا نتیجہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسرائیلی بنیادی طور پر نیم خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھے جو زراعت کے پیشے سے منسلک نہ تھے چنانچہ اسرائیل کے روایتی تصور خدا کے ذمے ایسا کوئی فرض (Function) سرے سے موجود ہی نہ تھا جو زراعت سے متعلق ہو۔ جب اسرائیلی فلسطین میں کنعانیوں کے ساتھ مل کر سکونت پذیر ہو گئے اور انہوں نے بھی زراعت پیشہ اختیار کر لیا تو اسرائیلی اپنی اچھی فصلوں کیلئے زرخیزی کے دیوتا بعل کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جاتے، چاہے ایسا کرنے سے ان کا نبی ناراض ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ادھر جہاں آج کل عراق ہے۔ وہاں اسی دور میں Mesopotamia کی تہذیب تھی۔ یہاں سیلاب مصر کے مقابلے میں زیادہ آیا کرتے تھے۔ کبھی قحط، کبھی سیلاب اور کبھی بیرونی قوموں کے حملوں نے زندگی کو بڑا غیر یقینی بنا رکھا تھا۔ چنانچہ یہیں پر انسانی تاریخ کی سب سے پہلی سیلاب عظیم کی کہانی ملتی ہے۔ جب دیوتاؤں نے سیلاب عظیم کے ذریعے انسانوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اس وقت ان کے علاقے میں آیا ہوا کوئی بہت ہی تباہ کن سیلاب انہیں ایسا ہی دکھائی دیا ہوگا کہ جیسے ساری دنیا میں سیلاب آ گیا ہو۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ یہ زمین کتنی بڑی ہے اور دیگر مقامات پر بسنے والی انسانی تہذیبیں اس سیلاب سے قطعی طور پر بے خبر اور محفوظ ہیں۔ یہاں پر عقیدہ تھا کہ فطرت (Nature) کی تمام قوتوں کے پاس مقدس طاقت ہوتی ہے۔ آسمان، طوفان، سورج، چاند، پانی، زمین اور دیگر سب مظاہر فطرت اپنی مرضی کے مالک ہیں اور یہ سب مل کر اپنی اپنی کائناتی خدائی ریاستوں (Divine States) کی تشکیل کرتے ہیں، جن پر کائنات کے سب سے بڑے آسمان دیوتا انو (Anu) کو برتری حاصل تھی۔ جو اپنے احکامات سے کائنات کے نظم و نسق کو چلاتا ہے۔ ان کے ہاں تقریباً دو ہزار دیوتاؤں کے نام ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ مقبول عام آسمان کی دیوی تھی۔

جس کے فرائض میں جنگ، محبت اور زرخیزی کے معاملات شامل تھے۔ Marduk بابل کی شہری سلطنت کا دیوتا تھا جو آسمانوں کی حکمرانی کرتا تھا۔ ان کے مطابق بھی انسان دیوتاؤں کی خدمت اور عبادت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ دیوتاؤں کیلئے قربانیاں دینا اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا، انسان کا فرض اولین ہے۔ ان کے ہاں ایک ابدی زندگی کی خواہش پائی جاتی تھی۔ بادشاہ مقامی شہری دیوتا کا نمائندہ متصور ہوتا تھا۔ وہاں ایک رسم میں بادشاہ اور مندر کی مذہبی پیشوا

عورت کی مقدس شادی ہوا کرتی تھی تا کہ ان کے جنسی اختلاط سے پودوں اور حیوانات کی زرخیزی و بار آوری قائم و دائم رہ سکے۔ 1750 قبل از مسیح میں بابل کے ایک بادشاہ حمورابی (Hummurabi) نے دعویٰ کیا تھا کہ اسے دیوتاؤں نے بلا کر کہا ہے کہ وہ زمین پر انصاف کرے۔ بدی اور بدمعاشی کا خاتمہ کرے تا کہ طاقت ور کمزور کو نہ کچل سکے۔ گویا پیغمبری کا تصور بھی ابھرنے لگا تھا۔ وہ لوگ ابھی کسی انعام و اکرام کے ملنے کا تصور نہ رکھتے تھے۔ البتہ اس دنیا میں ایک اچھی اخلاقی زندگی گزارنے پر زور دیا جاتا تھا تا کہ دیوتاؤں کی خدمت کر کے انصاف اور سچائی پر مبنی معاشرہ تشکیل پا سکے۔

کلاسیکل مذہب کی تیسری مثال یونان کی ہے۔ یونانی تہذیب نے مذہب فلسفہ، آرٹ، ادب اور سیاست میں بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہاں پر دو بڑی شہری ریاستیں ایتھنز اور سپارٹا کی ملتی ہیں۔ یہ 500-336 سال قبل از مسیح کا واقعہ ہے۔ یہاں پر سائنس، فلسفہ، آرٹ، ادب اور سیاست کے علوم کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ بعد ازاں یونان رومن ایمپائر میں شامل کر لیا گیا۔ یونانیوں کے ہاں مقدس کتب تو نہیں ہوا کرتی تھیں۔ البتہ ان کے ہاں دیوتاؤں کے ادبی پائے کے بڑے شاندار اساطیری قصے (Myths) پائے جاتے تھے جن سے ان کے تفہیم کائنات کے فلسفے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یونانی، دیوتاؤں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا انسانوں جیسا ہونا تھا لیکن وہ غیر فانی، طاقتور، کمال حسن کے حامل اور مصائب سے ماوراء تھے یونانی دیوتاؤں کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے ایک اولمپین دیوتا تھے جو اولمپیا پہاڑ پر بیٹھ کر اپنی مکمل طاقت سے دنیا پر حکمرانی کرتے تھے اور دوسرے زمینی دیوتا تھے جن کا تعلق زمین کی زرخیزی اور موت وغیرہ کے معاملات کو سنبھالنا تھا اولمپین دیوتا بارہ تھے اور ان کا باپ زیوس دیوتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام Hera تھا۔ جو بچوں، شادی بیاہ اور عورتوں کے معاملات کی انچارج تھی۔ اپالو، موسیقی، پیش گوئی اور تیر اندازی کا دیوتا تھا۔ دوسرے یونانی دیوتاؤں میں سمندر دیوتا، کنواری دیوی ڈیانا (Diana) عقل و بصیرت کی دیوی تھی۔ اس کے ذمے جنگلی جانورں کی رکھوالی بھی تھی۔ دیگر دیوتاؤں میں اجناس کی دیوی، جنگ کا دیوتا حسن و محبت کی دیوی اور آگ دیوتا وغیرہ شامل تھے۔

یونانیوں کے عقائد کے مطابق معبود اکبر زیوس دیوتا نے انسانوں کو پیدا کیا اور وہ ان کے اچھے، برے اعمال کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ دیوتا انسانی زندگی میں مداخلت کرتے ہیں۔ وہ آپس کی لڑائیوں اور جنگ و جدل میں ملوث ہوتے۔ مختلف دیوتا ایک دوسرے کی حمایت میں گروہ بندی بھی کرتے تھے۔ انسان دیوتاؤں سے بہت دور بستے ہیں۔ تکبر سب سے بڑا گناہ تھا۔ عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں نے انسانوں کو جو زندگی بخشی ہے اس کے لئے وہ عزت اور عبادت کے حق دار ہیں اور انسانوں کو اعتدال اور انصاف کی زندگی گزارنی چاہیے۔ دیوتاؤں کی باجماعت (Public) عبادت میں ساری کمیونٹی کی فلاح مضمر سمجھی جاتی تھی کیونکہ اس میں حکمران، سرکاری زعماء، معبدوں اور مزاروں کے پجاری عہدیداران شریک ہوا کرتے تھے۔ جانوروں اور دیگر خوراک کی قربانی پیش کی جاتی تھی جسے پجاری اور دیوتا کھایا کرتے تھے۔ یونان میں دیوتاؤں کے حوالے سے بڑے بڑے تہوار منائے جاتے۔ چونکہ ان کے ہاں نہ صرف مناظر فطرت بلکہ ہر جذبہ و قوت بھی اپنا اپنا تشخص رکھتے تھے لہٰذا کچھ معبودوں کا تعلق جنسی جذبات سے بھی تھا۔ انہی کی نسبت سے یونان کے سب سے بڑے تہوار ڈئنیزیا (Dionysia) میں مردانہ عضو کی مقدس مورتیوں کا جلوس نکالا

جاتا تھااورتہوارا کے دوران مردوزن کے لئے آزادانہ جنسی اختلاط کارثواب سمجھا جاتا تھا۔

قدیم یونان میں فلسفیانہ فکر کا ارتقاء انسانی تہذیب میں اہم ترین مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب فلاسفروں نے دیوتاؤں پر مبنی دیو مالائی قصوں اوران کے غیراخلاقی حصوں پر سوال اٹھانے شروع کر دیئے۔انسانی سوچ کا ایک نیا دورشروع ہوا،جس کی بنیاد مذہبی قصے نہیں سیکولرعقلی بصیرت تھی۔

470-399 قبل ازمسیح کی بات ہے جب سقراط نے ایتھنز کے لوگوں کوسکھایا کہ ''وہ ہر چیز کے بارے میں تنقیدی نقطہ نظر سے سوچا کریں۔'' چنانچہ اسے مذہب کے خلاف بولنے اورنو جوانوں کوخراب کرنے کے جرم میں سزائے موت دے دی گئی۔

تصورِ خدا کا پس منظر اور انسان!

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں دیکھ آئے ہیں کہ موجودہ بڑے مذاہب اور ان کے دیئے ہوئے تصور خدا کا وجود صرف چند ہزار سال پہلے کہیں موجود نہ تھا۔ جب کہ جدید انسان کی عمر بھی ایک لاکھ سال کے لگ بھگ ہے۔ البتہ قدیم تہذیبی انسان کے تصورات کا شائبہ اور اس کے سوچنے کا جو انداز تھا وہ مروجہ مذاہب میں بڑا واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ مزید برآں آج کے مذاہب اور ان کا تصور خدا قدیم کلاسیکل مذاہب کی تبدیل شدہ اور ترقی یافتہ اشکال ہی ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ آخر انسان کو دیوتاؤں (gods) کا تصور کیسے آیا۔

قدیم انسان طاقت ور اور وسیع وعریض فطرت (نیچر) کے تمام مظاہر کے سامنے خالی ہاتھ اور خالی الذہن یعنی مکمل بے بسی اور اسراریت کے ماحول میں گھرا ہوا تھا۔ وہ گردوپیش کی اشیاء کے علم اور ان کے پس منظر سے ناواقف تھا۔ وہ ایک طرف مناظر فطرت کی ان گنت انواع واشکال سے حیرت زدہ تھا، دوسری طرف فطرت کی دیوہیکل قوتوں کے سامنے خود کو بے بس پاتا تھا۔ وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ گردوپیش کی جاندار اور غیر جاندار چھوٹی بڑی اشیاء ایسی واقع کیوں ہوئی ہیں جیسی کہ وہ ہیں۔ آج ہمارے پاس اس دنیا کے روزمرہ مظاہر کے بارے میں نہ صرف سائنسی وضاحتیں موجود ہیں بلکہ اس کائنات کے بارے ہم ایک گہرا شعور اور علم بھی رکھتے ہیں۔ لیکن قدیم زمانے کے انسان کو اپنے سوالوں کے جواب میں ''وضاحتیں'' گھڑنی پڑتی تھیں۔ ذرا سوچیئے ان تمام عجیب اور پرہیبت مظاہر کے بارے میں جن کو قدیم انسان نہیں سمجھ سکتا تھا۔ جو اس کی روزمرہ زندگی میں موافق اور غیر موافق اثرات ثبت کرتے تھے۔ جیسے سورج باقاعدگی سے کیوں طلوع وغروب ہوتا ہے؟ مختلف موسم کیونکر آتے ہیں؟ ستارے کیا ہیں؟ چاند اور اس کا گھٹنا بڑھنا کیا ہے؟ زلزلے اور طوفان کیسے آتے ہیں؟ پھر انسان کی خود اپنی زندگی کا وجود اور اس سے وابستہ پراسرار واقعات اسے سوچنے پر مجبور کرتے۔ غیر متوقع واقعات کیسے وقوع پذیر ہوتے ہیں؟ نیند کیا چیز ہے؟ خواب کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ بیماری کیا ہے؟ لوگ آتے کہاں کہاں سے ہیں؟ پھر مرنے کے بعد چلے کہاں جاتے ہیں؟ یہ دنیا کیسے وجود میں آئی؟ پھر خود کی بقاء کا مسئلہ تھا۔ غذا کا حصول کیسے یقینی بنایا جائے؟ اور دیگر ماحول کو حیات کے لئے کیسے موافقانہ رکھا جائے؟ سب قدیم انسانوں نے ان سوالوں کے جواب اپنے اپنے انداز اور ماحول کے مطابق دینے کی کوشش کی۔ مختلف قبائل کے لوگوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف وضاحتیں پیش کیں لیکن ان کی یہ وضاحتیں ان کے ماحول کے واقعات کے ساتھ ہی جڑی ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ درپیش مسائل کے حوالے سے اپنے اپنے

مشاہدے کے لئے انوکھے اور قیاسی قصے گھڑ لیتے۔ جنہیں متھ یعنی دیو مالائی کہانیاں کہا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو انسان کے سادہ لوحی پر مبنی ان سوالوں کے جوابات دراصل ایک طرح سے سائنسی فکر اور تفتیش کا آغاز تھے۔ لیکن دوسری طرف یہی قصے اور کہانیاں مذاہب کی بنیاد بھی بنے۔ ہوا یوں کہ یہی خود ساختہ وضاحتیں لوگوں کے ذہنوں میں نسل در نسل منتقل ہونے کی وجہ سے مقدس حیثیت اختیار کر گئیں۔ جن میں کسی طرح کی تبدیلی ممنوع قرار پائی۔ چونکہ فطرت کے بارے میں اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کی وضاحتیں انسان نے اپنے اپنے ماحول کے مشاہدے کی بنیاد پر رکھی تھیں، چنانچہ یہی اختلاف مختلف بستیوں اور تہذیبوں میں انواع واقسام کے مذاہب کی تخلیق کا سبب بنا۔ مختلف تاریخی عوامل اور جغرافیائی ماحول کے رنگوں سے آمیزہ فطرت کے بارے انسان کی یہ خود ساختہ تعبیریں آئندہ چل کر مختلف مذاہب کی تشکیل اور ان میں تصادم کا باعث بنیں۔ کہ ہر گروہ کے لئے اس کے اپنے آباؤ اجداد کے قائم کردہ عقائد ہی عزیز تھے اور سچے بھی۔

اولین انسان نے گردو پیش کی اشیاء اور واقعات کے بارے اپنی وضاحتوں کی بنیاد اس خیال پر رکھی کہ یہ دنیا اور اس میں پائے جانے والے سب مظاہر اور اشیاء خود اس جیسی ہی ہیں۔ لہٰذا اس نے انہیں بھی انسانی اور شخصی صفات کا حامل خیال کر لیا۔ یعنی انہیں بھی Humanise and Personalise کر دیا۔ اب اس کے سامنے سب اشیاء خود اس کی طرح شخصیتیں تھیں یعنی صاحب ادراک ارادہ ہستیاں۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اس سے زیادہ طاقت رکھتی تھیں۔ جانور، پودے، دریا، چاند، سورج، ستارے سب اپنی جادوئی طاقت سے دیوتا بن کر آتے۔ ان میں کچھ دیوتا اچھے اور مہربان ہوتے، کچھ بُرے۔ جو درد، بھوک اور موت کا سبب بنتے۔

جب قدیم انسان نے تمام اشیاء ومظاہر کو ذہین ہستیاں تصور کر لیا تو وہ جذبات اور احساسات کے بھی حامل ہو گئے۔ کمزور انسان کا اپنی بقاء کی خاطر طاقت ور قوتوں سے فریاد کرنا اب فطری بات تھی۔ لوگ محسوس کرنے لگے کہ کسی بھی چیز سے فریاد اور اپیل کی جا سکتی ہے۔ چونکہ سورج بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، چنانچہ اس سے التجا کی جا سکتی ہے کہ وہ ان کے پودوں کو اُگانے کے لئے اپنی شعاعیں بھیجتا رہے۔ بارش دیوتا سے سیلاب نہ بھیجنے کی دعا (Pray) کی جا سکتی ہے اور بارش دیوتا ان کی بات کو سمجھ بھی لے گا۔ لیکن دیوتاؤں کو منانے کیلئے صرف دعائیں ہی کافی نہیں تھیں، ان کی مزید خوشنودی کے لئے ان کے سامنے جھکنا، ماتھا ٹیکنا اور سربسجود ہونا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ دعاؤں کے ساتھ پوجا پاٹ کی رسموں اور عبادتوں کا تصور پیدا ہوا۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ غلط طریقے سے دعا کی گئی تو دیوتا ناراض ہو جائیں گے۔ چنانچہ مذہبی پیشواؤں (ملاؤں) کی ضرورت پیش آئی۔ جنہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ دیوتاؤں کا علم اچھی طرح رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ دیوتاؤں کو خوش رکھنے اور ان کے غیظ وغضب سے بچنے کے لئے بہتر راہنمائی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دعاؤں کے لئے مقدس کلمات اور پوجا پاٹ کے مخصوص طریقے ایجاد ہوئے۔ جو بقول پروہتوں کے دیوتاؤں کو عزیز تھے۔ ان کے ذریعے دیوتاؤں کی تعریفیں کی جاتیں۔ مقصد یہ تھا۔ کہ فطرت انسان کے لئے زیادہ سے زیادہ مہربان ہو سکے۔ بات فریادی دعاؤں اور حمد وثنا سے آگے بڑھی۔ دیوتاؤں کے حضور تحائف بھی پیش کئے جانے لگے اور اپنا مال ومتاع ان کے لئے بھینٹ کیا جانے لگا۔ ان عبادات اور رسومات کا مقصد تھا

کہ لوگوں کے دیوتاؤں کے ساتھ اچھے تعلقات بنے رہیں۔ اسی اثنا میں ان رسومات کو بڑھاوا دینے میں مذہبی پیشواؤں کے اپنے مادی اور دنیاوی مفادات بھی شامل ہو گئے۔ اول اول جس زبان میں یہ دعائیں اور مقدس کلمات تشکیل پاتے، کچھ مدت بعد وہ مختلف قبائل کے اختلاط اور دیگر ارتقائی اسباب کی وجہ سے بدل جاتی۔ لیکن پروہتوں کی کوشش ہوتی کہ دعاؤں کو پرانی اور اصلی زبان میں ہی برقرار رکھا جائے کیونکہ وہ الفاظ بذات خود بھی مقدس قرار پا چکے تھے۔ اس میں ان مذہبی پیشواؤں کے دو مقاصد مضمر تھے: لوگ پرانی زبان اور متروک الفاظ کے مفہوم سے بے بہرہ ہو چکے ہوتے۔ اس طرح دیوتاؤں کے علم پر مذہبی پیشواؤں کا اجارہ قائم رہتا اور دوسرے لوگوں میں غیر مفہوم مقدس الفاظ نفسیاتی تاثر بھی بنائے رکھتے کہ پروہت دیوتاؤں کی زبان بول رہا ہے اور یہ الفاظ دیوتاؤں کے مقرب بندے ہی بہتر طور پر جانتے ہیں۔ یہ حربہ آج کے دور کے مذاہب میں بھی عام استعمال کیا جاتا ہے۔

اہل علم (Scholars) ہمیشہ سے اس میں دلچسپی لیتے رہے ہیں کہ خدا کا تصور شروع کہاں سے ہوا اور یہ آیا کہاں سے؟ 19 ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ایسی تھیوریاں پیش کی گئیں کہ مذہبی خیالات کیسے پیدا ہوئے اور ان پر انسان نے عمل کیسے شروع کیا۔ علم انسانیات کے ایک سائنس دان E.B. Tylor کی دلیل تھی۔ خدا کے تصور کا آغاز ''روح پرستی'' (Animism) سے شروع ہوا۔ روح پرستی کا یہ خیال قدیم انسان کو موت اور خواب کے تجربات نے دیا۔ وہ حیران تھے کہ ایک مرا ہوا شخص خواب میں کیسے آتا ہے۔ ان کے لئے یہ ایک بڑا پریشان کن سوال تھا کہ جب موت آتی ہے تو زندگی کہاں جاتی ہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سب جانداروں اور بے جان اشیاء کے اندر روح ہوتی ہے جو اپنے اجسام کو چھوڑ جاتی ہے اور اپنے الگ وجود کو جاری رکھتی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے زیادہ طاقت ور روحوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ انتہائی قدیم اور قبل از تاریخ کے زمانے کا بہت سا ایسا مواد ملا ہے جس میں بے جان چیزوں میں روح ہونے کے عقیدے کی تصدیق ہوتی ہے۔ سر جیمز فریزر (Sir James Frazer) کا کہنا ہے کہ اولین انسان نے فطرت کی طاقت ور قوتوں کو جادو سے جواب دیا۔ تاکہ فطرت کی قوتوں کو اپنے کنٹرول میں کر کے انہیں اپنے مفاد میں استعمال کر سکے۔ اور جب دیکھا کہ جادو، مقدس قوتوں پر موثر ثابت نہیں ہو رہا تو انسان نے عقائد اور رسومات وضع کیں جن کا رخ شخصی نوعیت کے دیوتا تھے۔ سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) نے مذہب اور تصور خدا کا جو نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اس کے مطابق خدا کے عقیدے میں نفسیاتی طور پر بزرگ باپ کے خیال کی پروجیکشن (Projection) نظر آتی ہے۔ انسان کو بے حسی اور اسراریت کے ماحول میں پدرانہ احساس تحفظ و سلامتی کی ضرورت تھی۔ جسے اس نے خدا (دیوتا) کے تصور میں حاصل کیا۔ اس پر تفصیلی بحث ''فرائڈ اور تصور خدا'' کے باب میں کی جائے گی۔

بات آگے بڑھانے سے پہلے ذرا اس بات پر غور کر لیں کہ انسان نے اپنی دنیا کا ادراک حاصل کرنے کے لئے جو طریقہ کار استعمال کیا، وہ سراسر انسانی تھا۔ اپنے سوالوں کا جواب اور اپنے مسائل کا حل خود ہی تلاش کرنا تھا۔ اس نے جاندار اور غیر جاندار اشیاء کو اپنی جیسی ہی صاحب شعور ہستی سمجھا۔ اولین انسان کا یہ فعل بالکل منطقی نظر آتا ہے۔ وہ فطرت کے سامنے

بالکل نہتا تھا اور اپنی بقاء کیلئے لازمی تھا کہ کسی نہ کسی طرح فطرت کی ان قوتوں کو اپنی مرضی کی سمت بہالے جائے تا کہ وہ آرام کی زندگی بسر کر سکے۔ اپنی ہی طرح، تمام جمادات، نباتات اور حیوانات کو صاحب شعور سمجھنا اس دنیا کو سمجھنے کے لئے مابعدالطبیعاتی (Metaphysical) طرز فکری کی ابتدا تھی۔ ظاہر ہے علم کا مذکورہ طریقہ مبنی بر حقیقت نہیں تھا۔ ایسی طرز فکر انسان کی اپنے خیال کی پیدا کردہ تھی لیکن دوسری طرف جب انسان کا ان اشیاء کے ساتھ عملی واسطہ پڑتا گیا تو ساتھ ساتھ اپنے عملی تجربے سے یہ بھی سیکھتا رہا کہ یہ دنیا اس جیسی صاحب شعور نہیں ہے۔ چنانچہ عمل کے دوران ظہور پذیر ہونے والی حقیقتوں سے اس دنیا کو معروضی طور پر سمجھنے کا بھی آغاز ہوا، جسے سائنسی طرز فکر کہتے ہیں۔ اولین زمانے میں ہی ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے جنھوں نے خیالی گھوڑے دوڑانے کی بجائے اس دنیا کو جیسی کہ وہ ہے، ویسی ہی سمجھنے پر زور دیا۔ جب کہ اول الذکر طریقہ کار میں انسان پہلے اس دنیا کو اپنی مرضی کی تصوراتی شکل دیتا ہے، پھر اسے سمجھنے کا عمل شروع کرتا ہے۔ اول الذکر طرز فکر بعد میں تمام مذاہب عالم کی بنیاد اور آخرالذکر سے سائنسی علوم کا آغاز ہوا۔

مذہب کا ماخذ اور توہم پرستی

جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں کہ اولین انسان اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے خود اس کی طرح صاحب شعور (روح) ہے۔ جو اسے اپنی مرضی سے نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے، چنانچہ وہ ان کے سامنے جھک گیا اور ان اشیاء و مظاہر (دیوتاؤں) کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وہی کچھ کرنے لگا جس طرح ایک کمزور انسان اپنے سے طاقت ور اور برتر انسان کی خوشنودی کے حصول کے لئے کرتا ہے۔ اس وہم میں مبتلا ہونے میں انسان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان حالات میں انسان ایسا ہی سوچ سکتا تھا۔ انسانی شعور ابھی اپنے بچپن میں تھا۔ اس کی حالت بالکل انسانی بچے جیسی تھی، ایک حیران کن دنیا، جہاں زندگی کی بقاء ہر آن خطرے میں تھی اس کے مقابل انسان کے پاس صرف اپنی تصوراتی اور خیالی قوتیں ہی تھیں۔ انسان نے خارجی دنیا کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے کچھ خاص تصورات اور اعمال وضع کئے، جن کی پیروی میں انسان طرح طرح کے اوہام میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔

وہم ہمیشہ بے علمی (Ignorance) سے پیدا ہوتا ہے۔ کسی واقعے، حقیقت اور مظہر کی صحیح صورت حال کو نہ جاننے کی وجہ سے ذہن میں وسوسے اور خوف پیدا ہوتے ہیں لیکن جب ان سے اسراریت کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو وہ چیزیں اپنی اصلی حالت میں صاف دکھائی دینے لگتی ہیں، چنانچہ وہم اور نفسیاتی خوف بھی ختم ہو جاتا ہے۔ توہم پرستی نے انسان کے مذہبی خیالات کی تشکیل میں بڑا مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ مثلاً آسمانی اجسام ہمیشہ سے انسان کے لئے پر اسرار رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اسے خوف زدہ کرتے رہے۔ انسان ان کے بارے اوہام بھرے تصورات پیدا کرتا رہا۔ دم دار ستارے کبھی کبھی نظر آنے کی وجہ سے تو بہت ہی پر اسرار تھے چنانچہ لوگ یقین کرنے لگے کہ ان کی وجہ سے بیماری یا جنگ آنے والی ہے۔ چاند بھی انسان کے لئے ہمیشہ سے توجہ اور اسراریت کا باعث بنا رہا۔ وہ انسان کے لئے رات کا چراغ بھی تھا۔ چاند کے بارے میں لوگ یقین کر

نے لگے کہ اگر اسے مسلسل دیکھا جائے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے چنانچہ انگریزی زبان میں پاگل پن کے لئے Lunatic کا جو لفظ بولا جاتا ہے اس کے لغوی معنی ''چاند میں مبتلا ہو جانا'' کے ہیں۔ اسی طرح جانوروں کی جب کسی چال ڈھال (Behavior) کو نہ سمجھ سکتے تو ان کے بارے میں توہم پرستی کا شکار ہو جاتے۔ جیسے کالی بلی کا پاس سے گزر جانا بدقسمتی کا نشان ٹھہرا۔ الو کی آواز قرب مرگ کی علامت، اسی طرح ملاح چونکہ سمندر میں فطرت کی بے رحم قوتوں کے رحم و کرم پر رہتے تھے۔ طوفان اور آندھیاں انہیں نقصان پہنچاتیں اور ان کے لئے خطرات پیدا کرتیں، وہ یقین رکھتے تھے کہ سیٹی بجانے سے طوفان چلا جائے گا۔ اسی طرح لوگوں کا اعداد سے بہت واسطہ پڑتا ہے چنانچہ وہ وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کون سا نمبر ان کے لئے منحوس ہے اور کون سا خوش قسمتی کا باعث۔ اسی طرح سائے یا انعکاس کو اس شخص کی روح کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ جس چیز پر سایہ پڑ رہا ہے اگر اسے توڑا جائے تو متعلقہ روح کو بھی نقصان پہنچے گا۔ اس لئے آئینے کے ٹوٹنے کو بدقسمتی پر محمول کیا جاتا تھا۔

توہم پرستی کی تعریف (Definition) یوں کی جاتی ہے: ''ایسا عقیدہ، یقین یا عمل جس کے ساتھ لوگ اس وقت بھی چمٹے رہیں جب اس کے مسترد کر دینے والا نیا علم اور حقائق ظہور پذیر ہو چکے ہوں۔'' گویا ایسی بات پر یقین جب کہ وہ ویسی نہ ہو۔ توہم پرستی کا وجود، گرد و پیش کی اشیاء کو کنٹرول کرنے کی خواہش اور لاعلمی کو خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں سارے انسان ہی توہم پرستی کا شکار تھے لیکن مندرجہ بالا تعریف کے مطابق انہیں توہم پرست نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ موجود اشیاء اور ظاہر ہونے والے واقعات کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنی طرف سے دنیا کو سمجھنے کی بہترین کوشش کرتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی خیالی وضاحتیں اور وہمی ایقان، مقدس اور مسلمہ حیثیت سے عوام الناس کے شعور کا حصہ بن گئے۔ نیا علم اور حقائق سامنے آ جانے کے باوجود آج بھی بنی نوع انسان کا بڑا حصہ توہم پرستی میں مبتلا ہے۔ توہم پرستی کی ایک شاخ طلسم میں بدل گئی۔ جادو کا مقصد بھی پراسرار لفظوں یا طریقوں سے قدرت کی قوتوں کو مسخر کرنا تھا۔ مصر، یونان اور روم میں مذہبی پیشوا اور طبیب لوگوں کو یقین دلانے کے لئے جادو (معجزے) استعمال کرتے تھے کہ ان کے پاس پراسرار قوت ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی سب تہذیبوں میں اپنے اپنے ڈھنگ سے نظام فطرت کی تعبیریں کرنے والے دیو مالائی قصے بنے۔ اصنام پرستی کا آغاز ہوا۔ فطرت کے بارے انسان کی ان خیالی تعبیروں نے اب باقاعدہ ایک ڈسپلن اور اداروں کی شکل اختیار کر لی۔ معبد تعمیر ہونے لگے۔ بتوں پر چڑھاوے اور قربانیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ حکمران اپنے کو دیوتاؤں (gods) کی اولاد قرار دینے لگے اور کبھی خود ہی اوتار بن کر لوگوں پر حکمرانی کرنے لگے۔ جیسے کرشن اور رام بیک وقت تاریخی شخصیات بھی ہیں اور دیوتا بھی۔ ادھر معجزات بھی توہم پرستی کی ہی ایک شاخ ہیں۔ معجزے کا مطلب ایسا واقعہ ہے جو ماورائے فطرت (Super Natural) ہو یعنی جو طے شدہ قوانین فطرت کے برخلاف ہو اور براہ راست ''خدائی مداخلت'' (Divine Interference) سے پیدا ہوتا ہو۔ معجزے ہر زمانے میں دنیا کی ہر قوم اور مذہب میں پائے جاتے رہے ہیں۔ کیا معجزہ واقعی ہوتا ہے؟ کیا کوئی واقعہ فطرت کے ماوراء ہو سکتا ہے؟ مذہبی پیشواؤں کے مطابق ان واقعات کو سائنسی نقطہ نظر سے نہیں دیکھا

جاسکتا۔ سائنس دان کہتے ہیں معجزے نہیں ہوتے جب کہ معجزوں پر یقین شہادت کی بنیاد پر نہیں، سنی سنائی بات پر ہوتا ہے۔ یہ یقین کرنا کہ معجزہ ہوا ہے، عقیدہ کا حصہ ہے۔ معجزے دیوتاؤں کی موجودگی، طاقت اور ان کے مقاصد کو سامنے لانے کے لئے ظہور کئے جاتے تھے۔

قدیم زمانے کا انسان یقین رکھتا تھا کہ دیوتاؤں کی رسومات کی خلاف ورزی کرنے پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہوتا ہے مثلاً جہاں کہیں آگ لگ جاتی تو کہا جاتا کہ دیوتا اپنی قوت کا اظہار کر رہے ہیں۔ جیسے آج بھی ہمارے مذہبی پیشوا اسی طرح حادثات یا قدرتی آفات (Natural Calamities) کو احکامات خداوندی سے روگردانی کرنے پر خدائی عذاب قرار دیتے ہیں۔

وحدانیت کے تصور کا ارتقاء

اس کائنات میں ہر چیز حرکت اور تبدیلیوں کی زد میں رہی ہے۔ کسی کو بھی پائداری اور دوام میسر نہیں۔ مادی اشیاء ہوں یا خیالات سبھی ایک وقت میں پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے پھولتے ہیں اور بالا آخر مٹ جاتے ہیں۔ یہ حسن ظن کا کمال ہے کہ جو چیز زندگی بھر ہمارے سامنے رہتی ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ شاید وہ ہمیشہ سے اسی طرح سے ہے۔ انسان کی لاکھوں سال کی 99.9 فی صد زندگی آج کی دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے وجود میں آنے سے پہلے ان مذاہب کے عقائد کے برعکس کسی اور طرح کے مذہبی خیالات میں گزری۔ موجودہ بڑے بڑے مذاہب کی چند ہزار سالہ زندگی پوری انسانی تاریخ کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ تاریخی لحاظ سے مذاہب کو تین بڑے مجموعوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1۔ قبل از تاریخ کے مذاہب: یعنی تحریر ایجاد ہونے سے پہلے کے مذاہب، آثار قدیمہ کی تحقیق سے ہمیں ان کے بارے میں کچھ معلومات ملی ہیں۔

2۔ قدیم کلاسیکل مذاہب: جب انسان نے لکھنا سیکھ لیا تھا اور ہم ان کی تحریروں اور چھوڑی ہوئی اشیاء سے ان کے عقائد کے بارے میں علم حاصل کر سکتے ہیں۔

3۔ قبل از تاریخ کے وہ مذاہب جو آج بھی ان قبائل میں موجود ہیں جو ابھی تک زمانہ جدید سے قبل کی اقتصادی و سماجی زندگی گزار رہے ہیں۔

بہت ہی قدیم زمانے میں ہر جگہ قدیم لوگوں میں صرف وہی مذاہب تھے جن میں متعدد خداؤں (دیوتاؤں) پر ایمان ہوا کرتا تھا۔ مذاہب کی تاریخ میں ایک خدا کا تصور بڑی دیر کے بعد ظہور میں آیا۔ کثرت پرستی سے وحدانیت تک کا سفر انسان نے ہزاروں سالوں میں طے کیا کیونکہ اس دوران انسان اپنی دنیا کے ماحول کے بارے بہت سا علم حاصل کر چکا تھا۔ اب اس کے لئے سب اشیاء صاحب شعور نہیں رہی تھیں اور نہ ہی وہ اپنی مرضی کی مالک تھیں۔ چنانچہ دیوتاؤں کی انفرادی حیثیت رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی۔ سماجی اور معاشی سطح پر بھی ترقی ہونے سے انسانی سماج میں ایک ایسا مدنی اور سیاسی ڈھانچہ تشکیل پانے لگا جس سے بادشاہی طرز حکومت کا آغاز ہوا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ خدائے واحد کے خیال نے اپنی موجودہ شکل میں پہنچنے کے لئے طویل عرصے پر محیط ارتقائی مراحل کا سفر طے کیا۔ پہلے پہل تصور وحدانیت کا آغاز Monarchianism

یعنی بادشاہ کی پرستش سے شروع ہوا۔ جیسے ایک بادشاہ اپنے لوگوں سے بلند تر اور قوت اور اقتدار کا مالک ہوتا ہے، سو اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ دیوتا باقی سب دیوتاؤں سے بلند ترین منصب کا مالک ہے یعنی دیوتاؤں کا بھی کوئی بادشاہ ہوگا۔ مختلف جغرافیائی خطوں میں سب سے بڑے خدا کو لوگوں نے اپنے اپنے نام دیئے، مثال کے طور پر قدیم یونان میں زیوس (Zeus) دوسرے تمام دیوتاؤں سے اعلیٰ ترین حیثیت کا مالک تھا۔ یہی نقطہ نظر بابل اور مصری اقوام میں بھی پایا جاتا تھا۔ اہل بابل کا سب سے بڑا خدا مردوک (Murduk) کہلاتا تھا جو دیگر دیوتاؤں سے اعلیٰ وارفع تھا۔ اسی طرح مصریوں کا سورج دیوتا (Re) دوسرے تمام دیوتاؤں کا حکمران تھا۔ اس نظریئے کا اگلا اور ارتقائی قدم ''Monolatry'' کہلاتا ہے۔ جس کے مطابق یہ عقیدہ قائم ہوا کہ دوسرے دیوتا بھی موجود ہیں لیکن عبادت صرف ایک ہی کی ہوسکتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چودہ سو سال قبل مصر میں پہلی دفعہ ایک بادشاہ اخناتن (Akhnaton) نے ایک فرمان جاری کیا کہ صرف آفتاب دیوتا آٹن (Aton) کی ساری دنیا کے خدائے واحد کی حیثیت سے عبادت کی جائے۔ سب دیوتاؤں کی خصوصیات اس ایک خدا میں مجسم ہوگئی ہیں۔ چنانچہ دیگر سب دیوتاؤں کے معبد بند کر دیئے گئے۔ آٹن کی عبادت مصریوں کے لئے نئی نہ تھی لیکن ایک خدا کا تصور ضرور نیا تھا۔ اخناتن نے آٹن کا کوئی مجسمہ بنانے کی بھی اجازت نہ دی لیکن خدائے واحد کے تصور کو قائم کرنے کی اس بادشاہ کی کوشش ناکام ہوگئی۔ اسے مذہب سے منحرف قرار دیا گیا اور اس کی موت کے بعد ایک سے زیادہ دیوتاؤں کی عبادت پھر سے شروع ہوگئی۔ ڈارون کی تحقیق کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام اخناتن کے اسی خدائے واحد کے تصور سے متاثر ہوئے تھے اور آرتھر ویگل کا کہنا ہے: ''دور توہمات اور ایک ایسے ملک میں جہاں معبودوں کی کثرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اخناتن نے ایک ایسا وحدت پرست مذہب ایجاد کیا جو پاکیزگی میں صرف عیسائی مذہب کے بعد دوسرا تھا۔'' لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں کے اندر دیوتاؤں کو ضم کر کے ایک خدائے واحد میں تبدیل کرنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے 800 سال قبل ایران میں زرتشت (آتش پرست Zoroastrian) مذہب میں بھی ایک ہی بڑے خدا کا ذکر کیا گیا ہے جس نے کثرت پرستی کی مذمت اور توحید کی تائید کی۔ زرتشت نے خدا کا غیر مرئی اور روحانی تصور پیش کیا۔ اسے بھی اس مذہب کو پھیلانے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن شاہ ایران گشتاسپ کے دین زردشتی قبول کرنے سے اس مذہب کو پھیلنے کے مواقع میسر آئے۔ دین زردشتی میں خدا کا سب سے قدیم اور سب سے اعلیٰ تصور پایا جاتا ہے۔ خدا کا نام آہورامازدا (Ahuramazda) ہے۔ اس میں خدا کو نور قرار دیا گیا اور وہ تمام صفات شامل تھیں جو جدید تصور وحدانیت کا حصہ ہیں یعنی وہ تمام چیزوں کا خالق، تمام عالم کا پیدا کرنے والا، بہترین، غیر متغیر، رحیم، خودمختار، انسانی روح کا خالق اور پاکیزگی کا منبع تھا۔ زردشتی تصور خدا البتہ قادر مطلق نہ تھا کیونکہ اس کے سوا ایک دوسری قوت بھی موجود ہے جو ہر چیز میں اس کی مخالفت کرتی ہے جس کا نام ''اہرمن'' ہے۔ دنیا میں پائی جانے والی برائی اہرمن کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اسلام اور عیسائیت میں شیطان کا تصور یہودی مذہب سے آیا اور خود یہودی مذہب نے اسے ایران سے لیا تھا۔

زرتشت نے یہ بھی بتایا کہ یزداں (خدا) کی پیروی کرنے سے جنت حاصل ہوگی اوراہرمن کا اتباع کرنے سے جہنم میں جانا ہوگا۔ زرتشت کے اقوال پر مشتمل مقدس کتاب اوستامیں ''سات غیر فانی ہستیوں'' کا بھی ذکر ہے جن سے یہودیوں نے ملائک کا تصوراخذ کیا کہ خداوند کے تخت کے سامنے سات روحیں ہیں۔ تاریخی حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ توحید کا ابتدائی تصور مصر میں ایک آفتاب پرست بادشاہ اور ایران میں آتش پرست مفکر نے سب سے پہلے پیش کیا۔ ''الہامی'' مذاہب میں خدائے واحد کا تصور بعد میں آیا اور ابتدائی مبہم تصور سے ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا اسلام کے مروجہ واضح تصور توحید تک پہنچا۔ دراصل اس دنیا و کائنات کے انسانی علم میں جوں جوں گہرائی پیدا ہوئی اور اس نے فطرت کو تمام مظاہر کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط دیکھا تو اسے ایک سپریم خدا کا خیال پیدا ہوا۔ عہد نامہ عتیق (Old Testament) کے مطابق حقیقی وحدانیت کا تصور عبرانی مذہب (اسرائیل) سے شروع ہوا۔ اسی خدائے وحدانیت پر ایمان جزیرہ نما عرب میں ابھرنے والے دیگر مذاہب کے عقائد کا حصہ ہے۔

1800 سال قبل مسیح میں صحرائے عرب کے کناروں پر ایک گمنام نیم خانہ بدوش قبیلہ آباد تھا۔ ان کے آباؤ اجداد کے دیوتا کا نام ''یہووا'' (Yahweh) تھا۔ اس خانہ بدوش قبیلے کے ایک بزرگ ابراہیم اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے (Ur) مقام سے حران (Huran) آ گئے۔ وہاں ابراہیم ''یہووا'' کے ساتھ اپنی ملاقات کے عجیب تجربے کا ذکر کرتے ہیں جس میں ''یہووا'' اسے اپنے قبیلے کنعان (فلسطین) لے جانے کو کہتا ہے۔ وہاں بقول ابراہیم کے خدا کے ساتھ ایک معاہدہ طے پاتا ہے جسے میثاق بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ خدا اسرائیل کو اپنی پیاری ترین امت کے طور پر منتخب کر لیتا ہے۔ اس معاہدے پر ابراہیم اپنا ختنہ (Circumcisim) کرا کے مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ یہودی مذہب اپنے پیش رو مذاہب عیسائیت اور اسلام کی طرح اپنے بانیان کے دور میں ہی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا تھا۔ ایک قادر مطلق خدا کے تصور کی تکمیل کے لئے اسرائیلی انبیاء کو ہزار سالہ لمبی اور پیچیدہ تاریخ سے گزرنا پڑا۔ یہ بات بھی دلچسپی کی حامل ہے کہ تورات کے مطابق خدا کا اصلی نام ''یہووا'' ہے جب کہ اسی سلسلے کے توحید پرست مذہب اسلام نے خدا کا نام ''اللہ'' بتایا۔ ایک خدا کے ماننے کے بعد اسرائیلیوں کو ایک بادشاہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تورات کے مطابق ان کا مطالبہ تھا کہ دوسری قوموں کی طرح ہمارا بھی ایک بادشاہ ہو۔ اسرائیلیوں کا یہ مطالبہ قابل فہم ہے کہ یہ نیم خانہ بدوش در بدر رہنے والا قبیلہ اب مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے کی خواہش رکھتا تھا لیکن سیموئیل پیغمبر کے نزدیک ایسا کرنا خدائے واحد کے استرداد کے برابر تھا کیونکہ خدا کے ساتھ معاہداتی رشتے کے مطابق ''یہودا'' خدا ہی ان کا ''بادشاہ'' تھا۔ چنانچہ 500 سال اسرائیلی قوم کے گناہوں اور خدا سے انحراف کے واقعات کے بعد بالآخر خدا نے ان کو بادشاہ بنانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت صالح (Saul) پہلا قبائلی بادشاہ بنا اور طے پایا کہ یہووا خدائے واحد کی علامتی حکمرانی اسرائیل کے بادشاہ کی وساطت سے ہوگی۔ داؤد تمام قبائل کو اکٹھا کر کے اسرائیل کا پہلا حقیقی بادشاہ بنا۔ اس دوران اسرائیل کے قبائلی رئیس ابراہیم اور اس کے جانشین اپنی قوم کو بار بار یقین دلا چکے تھے کہ خدا کے ساتھ ان کا ایک معاہدہ طے پا گیا ہے جس کے مطابق خدا کی محبوب امت ہونے کے ناطے خدا نے خود کو ان کا ہمیشہ کے لئے ساتھ

دینے کا پابند کرلیا ہے۔ داؤد اسرائیلیوں کا بادشاہ تو بن گیا لیکن سلطنت موجود نہ تھی۔

دیگر قوموں کی طرح انہیں بھی ایک مقدس شہر کی ضرورت تھی چنانچہ انہوں نے کنعانیوں (فلسطین) کے شہر یروشلم پر حملہ کر کے اسے حاصل کرلیا۔ داؤد نے زائن (Zion) پہاڑی پر ایک عبادت گاہ بنوائی۔ جہاں لکڑی کا وہ صندوق رکھ دیا گیا جس میں خدا کے ساتھ کئے گئے ''معاہدے'' کی لوحوں کو رکھا ہوا تھا۔ جنہیں اسرائیلی جہاں جاتے ساتھ لے جاتے۔ اس ''خداوند یہووا کے صندوق'' کا پس منظر گرانٹ ایلن کے مطابق یوں ہے: ''یہووا'' دیوتا شروع میں محض ایک لنگ تھا جو ایک صندوق میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ پتھر کے اس لنگ پر کچھ نقوش بنے ہوئے تھے اور جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ وہ ایک کتبہ ہے۔ روایات سے ظاہر ہے اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہووا (خدا) خود صندوق میں رہتا ہے۔ جسے یہودیوں کے پیغمبر سفر وحضر میں ساتھ لئے پھرتے تھے اور یہ مقدس صندوق دشمنوں اور ان کے معبود پر فتح کا سبب بنا کرتا تھا۔ اسرائیلی خانہ بدوش ہونیکی وجہ سے مستقل عبادت گاہ سے ناواقف تھے۔ وہ مقدس عہد نامے کی لوحوں کو لکڑی کے صندوق میں اٹھائے پھرتے۔ جہاں کہیں ڈیرا ڈالتے، اسے بھی ایک خیمہ میں رکھ دیتے۔ چنانچہ جب داؤد نے ایک عبادت گاہ کے لئے پکی عمارت بنانے کا فیصلہ کیا تو یہودیوں کے کچھ حلقوں کی طرف سے اس کی مخالفت کا اشارہ یوں ملتا ہے کہ ایک دوسرا نبی (Nathan) خدا کا پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا کے اس علامتی صندوق کو خیمے میں ہی رکھنے کی روایت کو باقی رکھا جائے لیکن وہ دیکھ چکے تھے۔ ان کے قریب رہنے والی قوموں نے اپنی پکی عبادت گاہیں تعمیر کروا رکھی ہیں جہاں ان کا بعل دیوتا موجود رہتا تھا۔ گویا اس وقت پکی عبادت گاہ بھی تعمیر کرنا خدا کی خلاف ورزی کے مترادف تھا! چنانچہ وہ کام جو حضرت داؤد نہ کر سکے، وہ حضرت سلیمان نے اپنے امن وخوشحالی کے دور میں کر دیا۔ اسرائیلیوں پر خوشحالی کا یہ دور حضرت سلیمان کی دوسری آس پاس کی قوموں پر فتوحات اور بھاری ٹیکس لگانے کے نتیجے میں آیا تھا۔ حضرت سلیمان نے کنعانی مزدور اور ماہرین تعمیرات کی مدد سے پہلی شاندار عبادت گاہ (ہیکل سلیمانی) کی تعمیر کی۔ جس کی تعمیر میں 13 سال لگے اور وہاں ایک بڑے جشن کے بعد خدا کے معاہدے کے صندوق کو اس کے اندر رکھا گیا۔

جدید تاریخی مطالعہ اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ بے شک یہودیوں کے روایتی خدائے واحد کا تصور توریت کے بنیادی اصولوں میں شامل ہے لیکن کتاب پیدائش (Genesis) کی کہانیوں کے مطاق ابراہیم کا مذہب اور اسرائیلیوں کے آباؤ اجداد خدائے واحد پر ایمان رکھنے والے نہیں تھے۔ بلکہ اپنے قبائلی دیوتا کی پوجا کرتے۔ اسے کبھی ''باپ کا خدا'' پھر بعد میں اسرائیلی دیوتا یہووا کو ''آباؤ اجداد کا خدا'' یعنی (The God of the Fathers) کہہ کر پکارا جانے لگا۔ حتیٰ کہ یہووا خدا جو بعد میں زمین وآسمان کا خدائے واحد قرار پایا، پہلے پہل سب کا ایک خدا نہیں تھا۔ دوسرے دیوتا بھی زندگی اور اس کی نشوونما کے لئے ضروری تھے۔ البتہ یہووا خدا کے ساتھ وفاداری لازمی تھی۔ چونکہ دوسری قوموں کے بھی اپنے اپنے خدا تھے چنانچہ اسرائیلیوں کا ابتدا میں یہ خیال نہیں تھا کہ ان کا خدا دوسرے سب دیوتاؤں سے طاقت ور ہے۔ اس کا پتہ یوں چلتا ہے کہ جب اسرائیلی مستقل سکونت اختیار کر کے رہنے لگے اور کنعانیوں کے ساتھ مل کر وہ بھی کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہو گئے

(کاشتکاری خانہ بدوش اسرائیلیوں کے لئے ایک نیا پیشہ تھا) انہیں اپنی فصلوں کی اچھی پیداوار کو یقینی بنانے کے لئے کنعانیوں کے دیوتاؤں میں کشش محسوس ہوئی۔ جو زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے اور اچھی فصل پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ چنانچہ وہ اپنے انبیاء کی ناراضی مول لینے کے باوجود کنعانیوں کے بعل دیوتا (بچھڑے) کی پوجا شروع کر دیتے تھے کیونکہ ان کے بزرگوں کے بتائے ہوئے اپنے خدائے واحد میں (اس کے صحرائی پس منظر ہوئے کی وجہ سے) زمین کو بارآور کر سکنے کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ اسرائیلی نبیوں کی کوشش تھی کہ اسرائیلی یہووا خدا کے ہی وفادار رہیں۔ لہٰذا خدائے واحد کی عبادت میں بھی ایسی مذہبی رسومات شامل کر لی گئیں جن کا تعلق زمین کی زرخیزی کو برقرار رکھنا تھا۔ اس طرح زمین سے متعلقہ دیوتاؤں اور اسرائیلی خدائے واحد کے درمیان جدوجہد کئی سو سال تک جاری رہی۔ بالآخر یہووا خدا ایک خدائے واحد کے طور پر تسلیم کر لیا گیا جو فصلوں، بارشوں اور زمین کا بھی خدا ٹھہرا۔ یوں شدید جدوجہد اور تصادموں کے بعد اسرائیلی یہ سمجھنے لگے کہ ان کا خدا (یہووا) دنیا میں سب سے بڑا ہے جو بالآخر رفتہ رفتہ اس عقیدے پر منتج ہوا کہ وہی خدا ساری دنیا اور کائنات کا قادر مطلق ہے جس کے ساتھ ان کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ نسل در نسل اسرائیلی انبیاء کی مسلسل جدوجہد میں کنعانیوں کا دیوتا بعل شکست کھا چکا تھا اور اسرائیلیوں کا یہووا بلا شرکت غیرے ساری دنیا کے ایک خدا کے طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ابتدا'' اسرائیلی ناقص وحدانیت (Heno Theistic) پر یقین رکھتے تھے جس میں ایک سپریم خدا پر ایمان تو تھا لیکن خدا صرف واحد ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ خدائے واحد پر ایمان (Monotheism) اور کثرت پرستی (Polytheism) کے درمیان والی حالت تھی۔ اسرائیلی آہستہ آہستہ ان اثرات سے نکلے بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ قبول کر لیا گیا کہ خدائے واحد کو اسرائیل سے باہر پوجا نہیں جا سکتا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے خدا واحد ہو یا بکثرت۔ متعلقہ قوم کے ساتھ اس کا رشتہ ذاتی نوعیت کا بن جاتا ہے۔ وہ متعلقہ قوم اور زمین سے وابستہ بھی ہوتا ہے اور ان کی شناخت بھی۔ بابل میں جلاوطنی کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہودی دل چھوڑ بیٹھے کہ خدا کے مقابلے میں بابلی دیوتا مردوک (Murduk) زیادہ طاقت ور ہے اس نے ان کے خدا کو شکست دے دی ہے لیکن ان کے نبی ان کو یقین دلاتے رہے کہ یہووا خدا ہی سب سے بڑا خدا ہے اور وہ دوسری قوموں کا بھی خدا ہے۔ اسرائیلیوں پر جب زوال آتا تھا تو انہیں ڈرایا جاتا تھا کہ روگردانی کرنے پر خدا نے انہیں سزا دی ہے۔ اب یہودیوں کا یہووا ساری کائنات کے واحد خدا کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے دیگر مذہب نے بھی اسرائیلیوں کے ہی تصور خدا کو اپنایا۔ یہاں ایک بات نوٹ کرنے کی ہے کہ یہودیوں کا خدا کو ایک کہنا کوئی ریاضیاتی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ عبرانی زبان (Hebrew) میں ''احد'' (Ehad) کا مطلب لاثانی (Unique) بھی ہے۔ یعنی جو دوسروں کی طرح کا نہ ہو، اس جیسا کوئی اور نہ ہو۔ یہودیوں کے نزدیک خدا کا مقبول ترین نام ''ہمارا باپ'' (Abenu) Our Father ہے۔ ''یہووا'' دیگر اقوام کے معبودوں کی طرح انسانی صورت وصفات کا حامل تھا۔ چنانچہ عہد نامہ قدیم میں ذکر ہے: ''اور انہوں نے خداوند کی آواز سنی جو ٹھنڈے باغ میں پھرتا تھا اور آدم اور حوا نے خود کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔'' گرانٹ ایلن کے مطابق یہووا چونکہ تولید اور تخلیقی قوت (لنگ) کا دیوتا تھا، یہی وجہ ہے ابراہیم اس سے اپنے بے

اولاد ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہووا صرف انسانی قربانیوں سے خوش ہوتا ہے اور خاص طور پر پہلی اولاد کی بھینٹ چاہتا ہے چنانچہ سموئیل پیغمبر نے اپنی اکلوتی اور کنواری بیٹی کو یہووا کے حضور قربان کر دیا تھا۔ اسی طرح ابراہیم نے بھی اپنے بیٹے کو چھری سے ذبح کرنا چاہا لیکن یہووا نے (خدا) اسے روک دیا کیونکہ وہ ''ابراہیم کی نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کی ریت کی مانند بڑھانا چاہتا تھا'' حضرت داؤد نے یہووا خداوند کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے حضرت صالح کے دو بیٹوں اور پانچ نواسوں کی قربانیاں دیں۔ گرانٹ ایلن کا خیال ہے انسانی قربانیوں کی جگہ بعد میں ختنہ نے لے لی۔ یہووا تصور خدا میں اسرائیلیوں نے بعد میں دوسری سب قوموں کے دیوتاؤں کی صفات بھی یکجا کرنی شروع کر دیں۔ یہووا میں آفتاب دیوتا کے ضم ہونے کا اشارہ بائبل کی ان آیات میں ملتا ہے جن میں یہووا سمادی رتھ پر کربیوں (فرشتے۔ کروبی ایک خراقیاتی حیوان تھا، پہلے وہ انسان اور عقاب کی ملی جلی شکل کا الگ سے معبود تھا) کے پھیلے ہوئے پروں کے سائے میں سفر کرتا ہے۔ ان کے پروں سے جلتے ہوئے انگاروں اور چراغوں کی طرح روشنی پھیلتی ہے۔ حرکت کرتے رتھ سے آگ اور بجلی نکلتی ہے۔ موسیٰ اور آتش فشاں کوہ طور کے واقعے سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ خدا آفتابی اور آگ کی صفات کا حامل سمجھا جانے لگا تھا۔ ''خداوند کا جلال'' بنی اسرائیل کو پہاڑ کی چوٹی پر جلتی آگ کی مانند دکھائی دیتا تھا اور کبھی وہ ''آگ کے شعلے'' میں ایک جھاڑی پر ظاہر ہوتا ہے جب آسمانی بجلی گرتی اور بادل گرجتے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے زمانے 1300 ق م سے لے کر ایلیا نبی تک (850 ق م تک) دوسرے دیوتاؤں کے وہ منکر نہ تھے حضرت سلیمان نے یہووا (خدا) کی عبادت گاہ کے علاوہ دیگر دیوتاؤں کے معبد بھی بنائے۔ یہووا قبائلی دیوتا رفتہ رفتہ ایک ''غیر تمند اور لاشریک خدا'' خدا کے طور پر مانا جانے لگا۔ جو اپنے سوا کسی دوسرے کی عبادت کو روا نہ رکھتا۔ خالص توحید پرستی یشوع نبی سے شروع ہوئی جس نے بت پرستی کے انہدام پر کمر باندھ لی۔ فلسطین پر فتح کے بعد اصنام پرستی کے سارے نشان مٹا دیئے۔ حتیٰ کہ سلیمان کے بنائے ہوئے ہیکل کے اندر دوسرے دیوتاؤں کو مسمار کر دیا۔

جدید تحقیقات کے مطابق یہودیوں میں خدا کا تخیل پیدا ہونے کے متعلق تین نظریئے ہیں:

1۔ گرانٹ ایلین کے مطابق یہودیوں میں خدا کے تخیل کی ابتداء لنگ پوجا سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس میں دیگر معبودوں کی صفات بھی شامل ہو گئیں اور اس کی مادی صورت (جو ایک عمودی پتھر تھا) کے برباد ہونے کے بعد توحید کا تصور پیدا ہو سکا۔

2۔ سر لیونارڈ اول کے مطابق حضرت ابراہیم اپنے خاندانی معبود کے پرستار تھے اور اسی بت کی پرستش نے تدریجی ترقی کے بعد توحید کی صورت اختیار کر لی۔

3۔ فرائڈ کے مطابق یہودیوں میں توحید کا تصور موسیٰ کے توسط سے پہنچا جو اخناتن کے مذہب کے پیرو تھے۔ مصر میں توحید کا تصور حکومت میں وسعت پیدا ہونے سے پیدا ہو سکا۔ سلطنت کا دائرہ وسیع ہونے سے ایک بین الاقوامی معبود کا تخیل پیدا ہوا اور تصور خدا فرعون ہی کا ایک عکس تھا۔ فرعون کے اختیارات میں توسیع خدائی اختیارات میں توسیع کے لئے لازمی تھی۔

ادھر صحرائے عرب میں ساتویں صدی عیسوی میں لوگ بہت سے دیوتاؤں (gods) اور دیگر خدائی قوتوں

(Divine Forces) کی پرستش کیا کرتے تھے۔ درختوں اور پانی کے چشموں کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ انہی دیوتاؤں میں ایک سب سے بڑا دیوتا ''اللہ'' (Allah) بھی تھا جسے اس دنیا کا خالق سمجھا جاتا تھا۔ تین خصوصی دیویاں تھیں جو (Al-lah) کی بیٹیاں متصور ہوتی تھیں۔ ''لات'' (Al-lat) مادر دیوی (Godess Mother) تھی جو چاند سے منسوب تھی۔ العزا (Al-Uzza) دیوی زہرہ سیارے سے منسوب تھی اور اسے ''محبت کی دیوی'' کے طور پر جانا جاتا تھا اور تیسری قسمت کی دیوی تھی جس کا نام منات (Manat) تھا۔ جسے پراسرار سمجھا جاتا تھا (ظاہر ہے قسمت پراسرار ہی ہوتی ہے۔) Al-Uzza کی خصوصی طور پر عبادت کی جاتی تھی، قربانیاں دی جاتیں اور اسے پتھر کے بنائے ہوئے ستونوں کے ساتھ منسوب کیا جاتا۔ یہی دیوی تخلیقی قوت کی علامت تھی، بہت سی جگہوں پر ان دیویوں اور دیوتاؤں کے مقامات تھے۔ مکہ خصوصی طور پر مقدس جگہ تھی کیونکہ اس میں قدیم مقدس کعبہ (Shrine) موجود تھا۔ جس پر دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ ایک مقدس چشمہ (زمزم) بھی تھا۔ دو مقدس پہاڑ تھے اور بہت سے پتھر اور ستون تھے۔ مقدس پتھروں کو لوگ بوسہ دینے کے علاوہ اپنے جسم کو ان کے ساتھ گھساتے (Rub) بھی تھے تاکہ ان سے قوت اخذ کر سکیں۔ یہودی مذہب کا خدائے واحد، ابہام اور ارتقائی مراحل سے گزر کر یہاں پر پہنچ کر ایک ترقی یافتہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی Arabisation کرنے کے لئے اس کا نام وہ رکھا جاتا ہے جو صحرائے عرب میں پہلے سے ہی ایک بڑے دیوتا (اللہ) کے نام سے موجود تھا۔ خدا تو اسے ''دین ابراہیمی'' والا ہی بتایا گیا لیکن یہاں پر خدا کے نام کے علاوہ زبان بھی عبرانی سے عربی میں تبدیل ہو جاتی ہے......!

مقدس چشموں، پتھروں، ستونوں اور پہاڑوں کا تصور بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی رکھا جاتا ہے جس میں مشہور شہاب ثاقب ''حجر اسود'' قابل ذکر ہے۔ بہرحال آج کے دور کے مروجہ ایک خدا کے تصور سے مراد وہ اعلیٰ ترین مقدس ہستی ہے جو مطلق صداقت اور خیر محض کی وحدانیت کا مظہر ہے۔ اس طرح یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ ساری کائنات کو پیدا کرنے والا ہے۔ وہ اس کائنات کے سارے لوازمات کا نگران اعلیٰ ہے۔ بہت سوں کے نزدیک ایک خدا کا تصور معمہ اور فہم و عقل کو چکر میں ڈال دینے والا ہے۔ خدا تمام دنیاوی حدود امتیازات اور خصوصیات سے ماوراء ہے۔ اب مشکل یہاں آن پڑتی ہے کہ ہر چیز کی تعریف (Definition) اس کی حدود، خصوصی صفات اور ان امتیازات کی وجہ سے ہوتی ہے جس سے وہ دوسری چیزوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اب اس تمام مادی اشیاء کے منبع کو کیسے Define کیا جائے۔ جس کی خود کوئی حدود نہیں اور جو تمام امتیازی خصوصیات سے مبرا ہے، نہ ہی وہ زمان اور مکان کے دائرے کے اندر رہتا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ جب تک خدا کا تصور موجود ہے۔ انسان اس کے بارے میں باتیں بھی کرے گا اور جب خدا کے بارے میں باتیں ہوں گی تو وہ باتیں لازمی طور پر حدود اور دائرے کے اندر رہ کر ہی کی جا سکیں گی۔ تب خدا کے وجود کی شرائط کہ وہ تمام حدود اور امتیازات سے مبرا ہے قائم نہیں رہتیں۔ مثلاً ہمارا یہ کہنا کہ ''خدا پوچھے گا''، ''خدا نے کہا'' خدا کا غیظ و غضب میں آ جانا یا اس کا مہربان و رحیم اور شفقت آمیز ہو جانا۔ اب باتیں کرنا اور سننا یا محبت کے جذبات رکھنا'' یہ سب دنیاوی، محدود اور امتیازات کے حامل عمل ہیں چنانچہ خدا کے غیر محدود اور تمام امتیازات سے ماوراء ہونے کی بنیادی شرط قائم نہیں رہتی۔ خدا کے مبہم اور غیر معین ہونے کے بارے میں تفصیلی مباحث اگلے ابواب میں آئیں گے۔

مروجہ خدا کا تصور

ابھی تک ہم دیکھ آئے ہیں کہ وہ کون سے حالات تھے جب انسان کے ذہن میں خدا کے تصور کا بیج پھوٹا اور وہ کس طرح ارتقائی مدارج سے گزرتا ہوا مروجہ تصور خدا تک پہنچا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس دنیا کی دیگر مادی اور غیر مادی اشیاء کی طرح مذاہب بھی پیدا ہوتے رہے، کچھ عرصہ زندہ رہتے، نسل در نسل لوگوں کو متاثر کرتے لیکن حالات تبدیل ہونے پر ایک نیا مذہب اور نیا ضابطہ حیات پرانے کی جگہ لے لیتا جو بدلتے حالات سے مطابقت رکھتے ہوئے اس وقت کی فکری اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرتا لیکن عقائد کی اس اتھل پتھل میں اب سائنس کا ایک ایسا طاقت ور اور انقلاب آفرین عنصر داخل ہوا ہے کہ انسانی فکر کے سفر میں ایک کیفیتی تبدیلی (Qualitative Change) منظر عام پر آ چکی ہے۔ انسان کائنات اور زندگی کے بارے میں اتنا زیادہ علم حاصل کر چکا ہے کہ اب اندھے عقائد (Blind Faith) کا زمانہ رخصت ہوا۔ ہر نظریئے اور خیال کو عقل اور تجزیئے کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی جدید انسان اسے قبول کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔

انسان کے اولین دور سے لے کر آج تک مذہب کی جتنی صورتیں اور عقائد کے جو بھی نظام سامنے آئے، وہ بظاہر ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں مگر اپنی اصل میں وہ سب ایک ہی رہے ہیں کیونکہ سب کے World View میں بنیادی طور پر انسان کا وہی اولین واہمہ کارفرما رہا ہے جس میں پہلے پہل ہر چیز کو ذی روح سمجھ لیا گیا اور آخر کار ساری کائنات کے پیچھے کسی شعور اور عظیم ترین روح کو فرض کر لیا گیا اور بعد میں اس کے مطابق عقائد کا ایک نظام اپنے اپنے علاقائی تاریخی حالات کے مطابق وضع ہوتا رہا۔

ابتدائی انسان کا اشیاء کو پوجنے کا مقصد خود کو ان کے ضرر سے محفوظ رکھنا اور منفعت بخش اشیاء سے اپنی ضرورتوں کے مطابق ان کی مدد حاصل کرنا تھا جب کہ انہی اشیاء کے ساتھ تعامل کے دوران انسان نے محسوس کیا کہ یہ نہ صاحب شعور ہیں اور نہ ہی اپنی مرضی کی مالک۔ روزمرہ زندگی کے عملی تجربات کے ساتھ ساتھ حقیقت حال کو جاننے کا عمل بھی شروع ہو گیا جو سائنسی علم کی ابتدا تھی۔ یعنی سائنس اور وہم ساتھ ساتھ متوازی چلنے لگے۔ بقائے حیات (Survival) کا جبلی تقاضا انسان کو اپنے ماحول (فطرت) کے ساتھ برسر پیکار رکھتا۔ وسیع و عریض اور ہیبت ناک فطرت کے مقابل انسان کی حالت نہایت کمزور تھی۔ چنانچہ اس نے فطرت کے مقابل اپنی خیالی (وہمی) قوت کو استعمال کیا۔ وہم بے علمی کے نتیجے میں پیدا کردہ خوف سے جنم لیتا ہے لیکن علم کے آ جانے سے خوف بھی ختم ہو جاتا ہے اور وہم بھی۔ وہم اور عقیدے میں اپنی اصلیت کے اعتبار سے بہت کم فرق

ہے۔ دونوں میں تحقیق، تجزیہ اور ثبوت کے بغیر کسی نظریئے کو سچ مان لیا جاتا ہے۔ اسی لئے تمام مذاہب میں توہم پرستی یکساں عنصر کے طور پر نظر آتی ہے۔ کوئی بھی مذہبی پیشوا خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم، فاضل اور تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، وہ توہم پرستی اور فطرت کے بارے غیر حقیقی خیالات سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اگر مذہب سے توہم پرستی نکل جائے تو وہ مجموعہ عقائد نہ رہے، سائنس بن جائے۔ ابتدائی انسان نے اس دنیا کو سمجھنے میں پہلی فکری ٹھوکر اسی لئے کھائی کہ اس وقت انسان اشیاء کے حقیقی علم اور مظاہر فطرت کے علت و معلول (Cause and Effect) کے عمل سے بے خبر تھا۔ سیکھنے کا عمل غلطی سے شروع ہوتا ہے اور یہ سلسلہ سیکھنے کے عمل کے دوران ہر قدم پر جاری رہتا ہے۔

اس دنیا کا علم حاصل کرنے کے دو طریقے رہے ہیں، ایک میں اشیاء جیسی ہیں انہیں ویسا ہی دیکھا جائے۔ ایسے میں کسی شے کے بارے علم حاصل کرنے کے لئے خود اسے ہی میڈیم (ذریعہ) بنایا جاتا ہے یعنی اگر یہ دیکھنا ہے کہ کوئی چیز کیا ہے، کیسے بنی ہے، آتی کہاں سے ہے تو ان سوالوں کے جواب خود اسی سے مانگے جاتے ہیں۔ وہ چیز اپنے آپ کے بارے راز افشا کرنا شروع کر دیتی ہے اسے علم جاننے کا معروضی یا سائنسی طریقہ کار کہتے ہیں جب کہ دوسرے طریقے میں انسان اپنے خیالی گھوڑے دوڑاتا ہے۔ چیزوں کی اصلیت جانے بغیر ان کے بارے میں ایک خود ساختہ نقطہ نظر وضع کر لیا جاتا ہے جس میں اپنی پسند و ناپسند، خواہشات، مفادات، سماجی دباؤ یعنی ماں باپ اور ماحول کے دیئے تعصّبات شامل ہو جاتے ہیں۔ اب ان خیالی گھوڑوں کی بنیاد پر استوار نقطہ نظر اس ''دنیا کی آخری صداقت'' قرار پاتا ہے پھر دیگر دنیا کو ویسے ہی دیکھنا اور ثابت کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ علم جاننے کا اول الذکر سائنسی طریقہ کار مشکل اور وقت طلب کام ہوتا ہے۔ اس کے لئے زبردست تحقیق و تجزیہ کا عمل درکار ہوتا ہے۔ اس طرح کے علم کے حصول کے لئے مطلوبہ تحقیقی مہارت اور تکنیک کے آنے تک علم حاصل بھی نہیں ہوسکتا۔ بسا اوقات مبنی بر صداقت علم کے لئے آنے والے دور کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ سائنس غیر جانبدارانہ علم دیتی ہے۔ دوسرے طریقہ علم میں زبانی کلامی غور و فکر کرنا ہوتا ہے۔ ایک ریڈی میڈ فارمولے سے انسانی نفسیات کی تشفی کر دی جاتی ہے۔ دنیا کی کسی چیز اور مظہر کے بنیادی سبب (Cause) کے سوال کا جواب ایک عظیم غیر مرئی قوت کے نام میں تلاش کر لیا جاتا ہے۔ کسی گہرے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے برعکس سائنسی علم عالمگیر ہوتا ہے۔ اسے کسی جگہ کوئی بھی پرکھ سکتا ہے۔ جب کہ مذہبی علم کی صداقت کا بھرم، اس فرد کی اپنی ذات تک ہی محدود ہوتا ہے جو اس پر ایمان رکھتا ہے۔ دوسرے کے لئے اس کی قطعی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن سوچ کا یہی غیر سائنسی طریقہ آج بھی غیر تعلیم یافتہ معاشروں کا مقبول عام فکری اثاثہ ہے!

مذکورہ بالا دونوں طریقہ ہائے حصول علم اولین دور سے ہی اپنی اپنی جگہ رائج رہے ہیں۔ انسان ایک فکری اور صاحب شعور جاندار ہونے کے ناطے اس دنیا کے بارے خیال آرائی کرنے اور تصوراتی تصویریں بنانے سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس دنیا و زندگی کے بارے میں بے شمار خیالی تصورات پیش کئے جو سادہ ترین فرضی اور وہمی قصوں سے لے کر گہری فلسفیانہ توجیہات پر مشتمل ہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ تمام مذاہب کا اس دنیا کو دیکھنے کا طریقہ کار تصوراتی اور طبعی قوانین سے ماوراء ہی رہا ہے۔ یہ جو عقائد پیش کرتے ہیں ان کی تصدیق نہیں ہوسکتی، وہ مقدس ہونے کی بنا پر ایک نسل اور

ماحول سے دوسری نسل اور ماحول کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

شخصی تصور خدا

آج کے زمانے میں خدا کا جو عمومی تصور عامتہ الناس میں پایا جاتا ہے اور مذہبی پیشوا اسے جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں خدا ایک شخصیت (Person) بن جاتا ہے مثلاً وہ بولتا، ناراض ہوتا، دوستی اور دشمنی رکھتا ہے۔ انعام و سزا دیتا اور ہماری ہر وقت خبر رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی سے سوال کیا جائے کہ آپ خدا پر کیوں ایمان رکھتے ہیں؟ عموماً اس کے جواب میں مضبوط ترین دلیل یوں پیش کی جاتی ہے ''کسی کے بنائے بغیر کوئی چیز نہیں بنتی، لہٰذا اس دنیا کو تخلیق کرنے والی کوئی نہ کوئی ہستی ضرور ہے اور وہی خدا ہے۔ مذکورہ دلیل دینے والے خود ہی تضاد میں پھنس جاتے ہیں کہ خدا صرف ایک مفروضہ ہے جب کہ اس پر ایمان لانے کی پیش کردہ دلیل سراسر عقلی ہوتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا کے ہونے کی جو دلیل دے رہے ہیں۔ خود خدا کو اس کے اطلاق سے بچانے کی کیا عقلی دلیل ہوگی؟ یعنی اگر کسی کے بنائے بغیر کچھ نہیں بنتا تو پھر خدا کو کس نے بنایا؟ اور اگر ہم نے ایک تصور اور مفروضے پر جاکر رک جانا ہے تو اس کائنات پر ہی کیوں نہیں رک جاتے۔ خدا کو نہ ماننے والوں کا بھی کہنا ہے کہ اس کائنات کو کسی ذات، شعور یا روح نے نہیں بنایا، یعنی یہ کسی کے بنائے بغیر عالم وجود میں ہے۔ خدا پر ایمان رکھنے والے بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ وہ کسی کے بنائے بغیر وجود میں آ گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تھوڑی دیر پہلے تسلی نہیں ہو رہی تھی یہ جانے بغیر اس کائنات کو کس نے بنایا ہے۔ وہ خدا کے بن بنائے وجود میں آ جانے پر کیسے مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنے ہی سوال کو خدا کی ذات پر لاگو کیوں نہیں کرتے اور دوسری طرف اگر کوئی اس بات پر مطمئن ہے کہ اس کائنات کو کسی ہستی نے تخلیق نہیں کیا اور اس کے لئے اس کے پاس باقاعدہ عقلی دلائل بھی ہیں۔ ایسے میں اس کا موقف کیسے باطل قرار دیا جا سکتا ہے۔ خدا کا تصور اور مفروضہ بنیادی سوال کو محض ایک قدم آگے بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ ''کس نے بنایا'' کا سوال ویسے کا ویسا تشنہ رہتا ہے۔ چنانچہ پھر وہ سوال دہرانے پر پابندی لگا دی جاتی ہے جس سے خدا کے ہونے کی راہ نکال لی گئی تھی۔ چنانچہ مذہب صرف سادہ لوح ذہن کو ہی مطمئن کر سکتا ہے۔ زیرک فہم افراد اس سے مطمئن نہیں ہوتے رہے۔ وہ اپنی کمزور اساس، تقدس اور اندھے ایمان سے مضبوط کرتا ہے جن پر رسومات اور عقائد کی بابرکت عمارت کھڑی کر دی جاتی ہے۔ ایسے میں کس نے بنایا ہے کے سوال کا رخ ذرا سا تبدیل کر دینا چاہیے۔ چنانچہ سائنس ایک بہتر راہ اختیار کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے سوال یہ ہونا چاہیے کہ عالم موجود بنا کیسے۔ اس سوال سے ہمارے علم کے دروازے کھلتے ہیں۔ جب ہم عالم موجود کا مطالعہ اس زاویئے سے کرتے ہیں تو ارتقاء وتغیر کا ایک لامتناعی سلسلہ پیچھے کو چلتا نظر آتا ہے اور ہر چیز کی اپنی حد تک کس طرح اور کیسے بنی کا جواب ہمیں ملتا چلا جاتا ہے۔ اہل مذہب کا اس کائنات کو کس نے بنایا کا سوال پوچھنا غلط ہے، اس طرح کا سوال تب اٹھتا جب کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والی اشیاء جامد و ساکت ہوتیں۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کوئی بھی چیز جو ہمیں

نظر آ رہی ہے، اس کا وجود رنگ و روپ اور خصوصیات اپنے زمان و مکان کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں۔ اور جب اس کا زمان و مکان بدل جائے تو وہ چیز اپنی پہلی حالت میں موجود نہیں رہتی۔ صرف ہماری زمین پر ہی پودوں اور جانوروں کی بے شمار قسمیں (Species) بدلتے حالات کے زیر اثر روز تبدیل، معدوم اور نئی پیدا ہو رہی ہیں۔ وہاں کس نے بنایا کا سوال ہی غلط ہو جاتا ہے۔ اس سوال سے صاف ترشح ہوتا ہے کہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ سب اشیاء ایک بار تخلیق پا چکی ہیں جب کہ حقیقت بالکل برعکس ہے کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ صرف چند ہزار، لاکھ، کروڑ سال پہلے ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ کس نے بنایا کا سوال بے علمی کا سوال ہے۔ اس میں کائنات یا اس کی اشیاء کو ثابت وجود (Being) سمجھ لیا جاتا ہے جب کہ کائنات اور اس کے اندر جو کچھ ہے وہ Becoming کی حالت میں ہے اور ہر چیز ہر آن ''تخلیق'' کے عمل سے گزر رہی ہے۔ اس میں تعمیر اور تخریب دونوں عمل بیک وقت کارفرما ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا فلاں چیز کس نے بنائی، خدا نے۔ یوں غلط ہے کہ وہ چیز ہمیشہ سے ایسی ہے ہی نہیں۔ مثلاً پہاڑ اس زمین کی پیدائش کے وقت سے موجود نہیں ہیں بلکہ زمین اربوں سال ان پہاڑوں کے بغیر رہی ہے اور ان پہاڑوں کی پیدائش اور موجودہ حالت میں ہم تک پہنچنے میں کروڑوں سال کا ارتقائی عمل درپیش رہا اور کل یہ پہاڑ اپنی موجودہ حالت میں قائم نہیں رہیں گے۔ یہی حال دیگر سب اشیاء و مظاہر کا ہے۔

عقائد کا مسئلہ

تمام مذاہب کی بنیاد اپنے ماحول کے دیئے ہوئے عقائد کو جوں کا توں بن کسی سوال کے دنیا کی آخری حقیقت کے طور پر مان لینے میں قائم ہے۔ گویا مذہب اس وقت ''حقیقت'' بنتا ہے جب پہلے اسے بطور حقیقت دل و جان سے قبول کر لیا جائے لیکن اس ''مطلق حقیقت'' کی حیثیت کسی دوسرے مجموعہ عقائد پر ایمان رکھنے والے کے نزدیک بالکل صفر ہوتی ہے۔ یعنی کسی ایک فرد اور مکان کی آخری حقیقت صرف ساتھ والے فرد اور مکان میں مکمل باطل قرار پا جاتی ہے چنانچہ اس طرح دنیا کے سب کے سب مذاہب ایک ہی وقت میں باطل بھی ہوتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر مطلق حقیقتوں کے طور پر مانے بھی جا رہے ہوتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کسی صداقت اور وہ بھی جس کا دعویٰ آخری صداقت کا ہو اس کی یہ صورت حال آئیڈیل قرار نہیں دی جا سکتی۔ اس زاویئے سے دیکھا جائے تو ساری دنیا کے لوگ ایک دوسرے کے نزدیک باطل عقائد کے اندر روحانی طور پر ٹھیک ٹھاک اور نہایت مطمئن زندگی گزار رہے ہیں جب کہ کوئی ایک گروہ اپنے علاوہ دوسرے کے عقائد کے مطابق زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ عقائد کی یہی انتہائی موضوعیت (Subjectivity) اسے صحیح علم کے درجے سے باہر کر دیتی ہے کیونکہ سوال جب ایسی ہستی کے بارے ہو جو اس ساری کائنات پر محیط ہو اور وہ ہر ایک کی ذاتی پسند اور ایمان تک محدود ہو جائے تو اس پسند یا ایمان کو مطلق تو دور کی بات ہے پرکھے بغیر عامیانہ صداقت کا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اب بحث اس نقطہ نظر پر آ جاتی ہے کہ اس دنیا کو بنانے والی کوئی باشعور ذات ہے اور وہ ایک پروگرام کے تحت اس دنیا کو چلا رہی ہے اور مخلوقات میں سے اس کی

خصوصی دلچسپی انسان کے ساتھ ہے چنانچہ بسا اوقات اپنے پسندیدہ افراد کے ساتھ براہ راست رابطہ بھی قائم کرلیتا ہے تو پھر تہذیب کی ابتدائی اشکال سے لے کر اب تک ہزارہا نوعیت کے عقائد کی موت وحیات کے کیا معنی ہیں؟ وہی بات لوٹ کے مضبوط دلیل کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ تمام عقائد انسان کے مختلف ماحول اور مختلف زمان ومکان کے تقاضوں اور اس وقت کے انسانی، مادی اور فکری حالات کی انعکاسی کرتے ہیں۔ گویا صورت حال کچھ یوں دکھائی دیتی ہے کہ عقائد ہوں یا دیوتا...... سب انسان کی اپنی تخلیق ہیں اور انسان ہی بدلے ہوئے حالات میں ان میں ردوبدل کرتا رہا ہے۔

کسی صداقت کی یہ شرط کہ اس پر پہلے ایمان لایا جائے، خود صداقت کی توہین ہے۔ صداقتیں اور حقیقتیں تنقیدی نظر اور معروضی مطالعہ سے سامنے آتی ہیں۔ اندھے ایمان سے نہیں۔ ایک بار کسی مجموعہ عقائد پر ایمان لے آنے سے ساری معاشرتی اور فکری زندگی اسی کے متعین کردہ افکار کے مطابق گزارنی پڑتی ہے جو اس کی زندگی کا ہی نہیں موت کے بعد کا بھی فیصلہ کرتا ہے! فرض کیا کہ ایک انسان جو جنگل میں ہی پلا بڑھا اور اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ اور بڑے ہی خشوع وخضوع سے اپنے خاندانی جادو ومنتر سے بھرپور عقائد کے ساتھ کسی درخت یا جانور کی پوجا کی تو اس شخص کا کیا قصور ہے۔ اس کے مقابلے میں جس تک بقول اپنے تئیں خدا کا بھیجا ہوا صحیح عقیدہ پہنچا ہے۔ عقائد کے اس جنگل میں جہاں سب کا دعویٰ ہے کہ وہ دوسرے سب عقائد کے مقابلے میں سچے اور اعلیٰ ہیں اور ہر ایک کے پاس اپنے آباؤ اجداد اور مقدس شخصیات کی تحریریں اور باتیں بطور "دلائل" اور "ثبوت" موجود ہیں! اس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ عقائد کی دنیا کا مرکزی کردار خود حضرت انسان اور اس کا شعور ہی ہے۔ اس کی نگاہ پتھر کو خدا بنا دیتی ہے اور ایک وہم اور مفروضہ حقیقت مطلق میں بدل جاتا ہے۔ خدا ہے یا نہیں ہے کا سوال یوں بھی انسانی ساختہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال صرف انسانی ذات تک محدود ہے۔ کائنات میں کسی جمادات، حیوانات اور نباتات کو یہ مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو شعور کی ایک سطح پر خدا کا اقرار کرتا ہے اور شعور کی دوسری سطح پر اس کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ جس کسی نے بھی خدا کے ساتھ کسی طرح کے رابطے کا دعویٰ کیا ہے وہ بھی بہرحال انسان ہی تھا۔ یعنی اگر انسان خدا کا ذکر نہ کرے تو اس کا تصور ہی معدوم ہوکر رہ جائے۔ یوں خدا کے ہونے کے لئے سب سے پہلے انسان کا ہونا ضروری ہے اور پھر اس انسان کا جو اس کا ذکر کرتا رہے۔ اب یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ خدا کے نہ ماننے والے کی زندگی بھی بالکل نارمل ویسے کی ویسی ہی گزرتی ہے جیسے کسی ایمان والے کی۔ بلکہ کئی لحاظ سے نہ ماننے والے کی زندگی زیادہ اچھی گزرتی ہے کہ وہ کئی طرح کے اوہام بچ جاتا ہے اور زندگی کے ہر مرحلے پر درپیش صورت حال کو حقیقی تناظر میں دیکھتا ہے جب کہ خدا پر ایمان رکھنے والا وہموں کے جال میں پاپ اور پن کا بوجھ لئے زندگی گزارتا ہے۔ وہ انہی وہموں تلے یا تو اپنی اور اپنے گردوپیش کے لوگوں کی زندگی اجیرن کردیتا ہے یا پھر دوہری زندگی بسر کرتا ہے۔ منافقت کے لئے ایمان یافتہ ہونا لازمی شرط ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عقیدہ نہیں رکھتا، وہ زندگی کو ایسے ہی دیکھتا ہے جیسی کہ وہ ہے اور اسے اس کے تقاضوں کے مطابق گزارتا ہے چنانچہ وہ کسی دوہری زندگی یا احساس گناہ کا شکار بھی نہیں ہوتا جب کہ کوئی کتنے ہی زہد وتقویٰ کا دعوے دار ہو۔ دہرے معیار کی زندگی سے بچ نہیں سکتا چونکہ وہ اول وآخر انسان ہوتا ہے لہٰذا زندگی کی ضرورتیں، خواہشات، جذبات اور

احساسات اسے مادی دنیا کے حصول کی طرف کھینچتے ہیں اور عقائد کا دیا وہم اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جس کے لئے مادی دنیا کی نفی ضروری شرط ہے۔ اکابرین عقائد اسی لئے اہل ایمان کی توجہ ہٹانے کے لئے اس دنیا کی زندگی کو سنوارنے کی بجائے بعد از موت کی (فرضی) زندگی کے بارے میں ہر وقت فکر میں مبتلا رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں چنانچہ دنیا کا کوئی بھی مذہبی شدت پسند دوغلی زندگی کے بغیر نہیں رہ سکتا بلکہ عام مشاہدہ ہے کہ وہ کسی بھی عام آدمی سے زیادہ لالچ، حرص، تنگ نظری کا شکار ہوتا ہے کیونکہ عقائد کی پیدا کردہ گھٹن اس کی شخصیت اور نفسیات کو مسخ کر دیتی ہے۔ نارمل نشو ونما صرف سائنسی طرز فکر کے حامل انسان کی ہی ہو سکتی ہے کہ سائنسی فکر ہی اس دنیا کی داخلی اور خارجی حقیقتوں سے مطابقت پیدا کرتی ہے۔

مروجہ تصور خدا تضادات کے آئینے میں

مروجہ تصور خدا کو خالق کائنات قرار دیتا ہے جس کا ہم خود بھی حصہ ہیں۔ گویا خالق اور مخلوق دو الگ الگ ہستیاں ہیں۔ خالق اور مخلوق کی یہ دوئی خدا کو ناگزیر طور پر محدود ہستی کا درجہ دے دیتی ہے۔ ایک طرف خالق دوسرے طرف مخلوق۔ اس طرح خدا ایک متعین شے بن جاتا ہے لیکن اگر خدا کو لامحدود (Infinite) مان لیا جائے تو پھر خدا اور کائنات دونوں الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ محدود کا لامحدود میں ضم ہونا ناگزیر ہے۔ لامحدود کا مطلب ہمہ جہت Dimension میں لامحدود اس طرح خالق و مخلوق کا روایتی تصور غلط ہو جاتا ہے یا بصورت دیگر محدود بن جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے جو ہستی کے اعتبار سے محدود ہے اس کی دیگر صفات کیسے لامحدود ہو سکتی ہیں۔ لامحدود، غیر متعین ہوتا ہے۔ جس کے بارے کوئی مزید بات نہیں کی جاسکتی۔ سوچ، خیال، زبان اور شعور سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کو لامحدود جانتے ہوئے بھی اسے ایک محدود ہستی کے طور پر استعمال کرنا لازمی ہو جاتا ہے جس سے وہ ایک شخصیت بن جاتا ہے۔ جس میں تمام انسانی جذبات اور خصوصیات در آتی ہیں۔ باقاعدہ ایک فعال بادشاہ کی حیثیت سے کائنات کی سلطنت چلاتا ہے۔ کبھی من میں آئے تو کائنات کے نظام میں مداخلت بھی کر دیتا ہے اور فطرت کے قوانین کو الٹ پلٹ دیتا ہے۔ اس کے باقاعدہ احساسات بھی ہیں، وہ دعاؤں سے متاثر ہوتا ہے، دیکھتا ہے، سنتا ہے، اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس پر کوئی قانون، اصول لاگو نہیں ہوتا، پھر اسے عادل بھی کہا جاتا ہے۔ جب کہ عادل کے لئے کسی قانون اور اصول کا پابند ہونا لازمی شرط ہے! ورنہ وہ عادل ہو نہیں سکتا۔ مرضی کا مالک عادل نہیں ہو سکتا۔ خدا کی صفت ہے جو چاہے کرے اور جس کی صفت یہ ٹھہرے وہ عادل کیسے ہو سکتا ہے۔

دراصل عملی تقاضے خدا کو محدودیت کے دائرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے انسان خدا کی جو بھی Definition کرے، وہ اپنی دیکھی دنیا سے باہر اس کا کوئی تصور نہیں باندھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کے خدا کی آج تک ایسی کوئی صفت نہیں بنی جو انسان کی دیکھی اور محسوس کی ہوئی نہ ہو۔ خدا کا ہر تصور انسان کی اپنی دنیا سے متعلق ہی بنا۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد کی دنیا کے نقشے میں بھی خود انسان کی اپنی دنیا کی چھاپ ملتی ہے۔ ''جنت'' میں صرف انہی پھلوں کے ملنے کا ذکر ہوتا ہے جن

سے وہ قوم واقف تھی! کیا یہ حیرت کی بات نہیں۔ خدا جو ماورائے ہستی ہے اس کی کوئی بھی صفت ماورائی نہیں! ناراض ہوتا ہے تو مادی چیزوں سے مادی نقصان پہنچاتا ہے اور اگر خوش ہوتا ہے تو اس دنیا میں دیکھی ہوئی مادی نوازشیں ہی کرتا ہے۔ فردوس بریں میں سب نعمتیں اور دوزخ کی سب سزائیں اسی مادی دنیا کے مشاہدات اور تصورات کے مطابق ہی کیوں ہیں۔ اگر خدا مادہ نہیں تو پھر اس کی ہر شکل، صورت، صفت اسی مادی دنیا کا ہی انعکاس کیوں کرتی ہے۔ اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ اس سارے ڈرامے کا مرکزی کردار، ہدایت کار اور پیش کار اس مادی دنیا کا محدود انسان ہی ہے۔ وہ ماورائی صفات لائے کہاں سے......

اب دو ہی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ خدا کو اس کائنات سے الگ ہستی کے طور پر مان لیا جائے تو وہ اپنی ذات میں محدود ہو جاتا ہے اور محدود ہونے کی بناء پر خدا ہی نہیں رہتا۔ اسی طرح لامحدود مان لینے کی صورت میں شخصی تصور خدا اور اس کی سب صفات کا خاتمہ ہو جاتا ہے جس پر مذاہب نے اپنے اپنے اعتقادات کی عمارتیں کھڑی کر رکھی ہیں۔ ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے جہاں جتنی زیادہ ناخواندگی، جہالت اور معاشی پس ماندگی ہوتی ہے وہاں مذہب اپنے جوبن پر ہوتا ہے۔ یعنی لوگ اتنے ہی زیادہ مذہبی عقائد میں پھنسے ہوتے ہیں اور جو معاشرہ جتنا زیادہ ترقی یافتہ، پڑھا لکھا، خوبصورت اور مادی طور پر خوشحال ہوگا، وہاں مذہب انسان کی روزمرہ کی سرگرمیوں اور فیصلوں سے اتنا ہی دور نکل چکا ہوتا ہے۔ یعنی جہالت زدہ معاشرے میں اندھے اعتقادات، توہم پرستی، پوجا پاٹ، ماضی کی روایات اور دیگر رسومات ایک غالب عنصر کے طور پر موجود ہوتی ہیں۔ سائنس کی پیدا کی ہوئی مادی، روحانی اور ثقافتی ترقی کے ساتھ ہی اعتقادات بخارات بن کر انسانی زندگی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عقائد کی دنیا انسانی شعور کے بچپن کی پیداوار اور قدیم اولین دور کی باقیات ہے۔ بالغ انسانی شعور اسے یونہی پیچھے چھوڑ دیتا ہے جیسے ہم بچپن کی حرکتیں۔ مذہب میں خدا کو بطور شخصیت اور انسانی شکل Human Form میں بیان کرنے کو Anthropomorphism کہتے ہیں۔ آج کے علمائے مذاہب کا کہنا ہے کہ مذہبی کتب میں ایسی باتوں کو اپنے لغوی معنوں Literally نہیں لینا چاہیے۔ مثلاً خدا کی آواز کا مطلب سچ مچ کی آواز نہیں ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی "تفسیروں" کا جنم اس وقت ہوتا ہے جب سائنسی علم انسانی شعور کو اتنا آگے بڑھا دیتا ہے کہ مذہب کا بیانیہ قابل تشکیک ہو جاتا ہے چنانچہ پرانے مذہبی طرز بیان کو علم کی نئی روشنی کے مطابق ڈھالنا آج کے مذہبی دانشوروں کی مجبوری بن جاتا ہے۔

"قول وفعل" کا تضاد

مذاہب کا عمومی دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا براہ راست یا بالواسطہ دیا ہوا علم ہیں۔ گویا ان کی حیثیت قول خدا جیسی ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ اگر مذاہب واقعی خدا کا براہ راست دیا علم ہیں تو اس کائنات کے بارے میں مذاہب نے آج تک انسان کو

جو معلومات بہم پہنچائیں۔ وہ سائنس کی بیان کردہ حقیقتوں سے اتنی مختلف، متضاد اور مبہم کیوں تھیں؟ ظاہر ہے سائنس ایک ایسا معروضی علم ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کی خلق کردہ دنیا کس ترتیب و ترکیب اور کن قوانین اور اصولوں کے مطابق بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ انسان بذریعہ سائنس اپنے ماحول کا صحیح علم حاصل کر کے ہی انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اگر سائنس اشیاء کا مبنی بر حقیقت علم نہ ہوتی تو انسان نے سائنس کے ذریعے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ ہرگز حاصل نہ ہو پاتے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کائنات کو بجا طور پر خدا کا فعل (Action) کہہ سکتے ہیں یعنی کائنات اس کے سوا کیا ہے کہ God In Action ہے اور خدا کا یہ فعل کیسے اور کیونکر ہو رہا ہے؟ اس علم کو سائنس کہتے ہیں اور بقول مذاہب...... وہ خدا کا دیا زبانی علم ہیں لیکن تاریخ اس باب میں ہماری راہنمائی نہیں کرتی کہ مذاہب نے انسان کو کائنات کے بارے صحیح، صاف اور غیر مبہم علم دیا ہو۔ اس کے برعکس قصے کہانیاں، مبہم باتیں اور غیر حقیقی توجیہات کی بھرمار زیادہ نظر آتی ہے۔ انسان نے آج تک اس دنیا کے بارے میں جتنا بھی علم مجتمع کیا ہے مذاہب کا اس میں کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا بلکہ تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے (جہاں مذہب کا غلبہ ہے وہاں آج بھی ایسا ہی ہے) کہ عقائد اس دنیا کے بارے جاننے کی انسانی جستجو کے رستے کی ہمیشہ رکاوٹ بنے رہے۔ بے شمار فلاسفر، مفکر اور سائنس دان مذہبی پیشواؤں کے کفر کے فتوؤں کے نشانہ بنے اگر یہ مذاہب خدا کا بتایا ہوا علم ہوتے تو سائنسی انکشافات اور مذاہب کی بتائی ہوئی معلومات میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن عقائد کے مروجہ نظام انسان کو ایک ایسے مختلف World View کی طرف لے جاتے ہیں جس کی سائنسی علم پر مبنی انسانی شعور نفی کرتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت مجموعی طور پر تجزیہ و تجربے، ارتقاء و تغیر کی مخالفت اور جمود کی حمایت کرتی ہے۔ چونکہ ارتقاء و تغیر کائنات کا ''اصل'' ہے اور کوئی شے اس سے بچ نہیں سکتی اس لئے جوں جوں معاشرہ مادی ترقی کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ لوگ بدلتے حالات اور جدید علم کے مطابق مذہب کی تعبیریں شروع کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر مذہبی علم سچا تھا تو اس نے وہ بات پہلے اس طرح کیوں نہ بتائی تھی تاکہ وہ انسان کے علم و شعور کو آگے بڑھانے کا باعث بنتا۔ اب جب کہ انسانی کاوش پر مبنی علم (سائنس) فاتحانہ آگے بڑھتا ہے اور کوئی بھی اس کے اثرات سے خود کو بچا نہیں پاتا تو نئے حالات میں ڈھل جانے کے لئے مذہب سے دلائل تلاش کرنے شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ آج کے دور میں سائنس نے اپنی حقیقت کو اس قدر منوا لیا ہے کہ دنیا کا کوئی فرد خواہ کتنا ہی مذہبی کیوں نہ ہو، سائنسی علم اور اس کی پیدا کردہ سہولتوں سے خود کو جدا نہیں کر سکتا اور نہ ہی سائنسی علم کو براہ راست چیلنج کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے لئے یہی راستہ بچتا ہے کہ مذہب کو سائنس کے مطابق قرار دیتے جائیں۔ مذہب کو سائنس کے مطابق قرار دیتے جانا خود مذہب کی روح کے خلاف ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے سائنس کل کو اپنی ہی کہی کسی بات کو بدل ڈالے تو پھر کیا ہوگا۔ جب کہ آپ اسے عین مذہب قرار دے چکے ہوں گے۔ مذہب اور سائنس چونکہ انسانی تفہیم کے دو مختلف راستے ہیں چنانچہ مذہب کے زیر اثر معاشرے آج کل ''ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے'' کے نہ سمجھ میں آنے والے چکر کا شکار ہیں۔ مذہب کو بھی چھوڑ نہیں سکتے کہ وہ ان کی شناخت کا مسئلہ ہے اور سائنس کے کمالات سے بھی اپنی زندگی کو محروم نہیں رکھ سکتے۔ آج سائنس سے محروی انفرادی اور قومی خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا ملا لوگ سائنس کے ہر کمال اور انکشاف کو پہلے تو

حیرت سے دیکھتے ہیں پھر دبے دبے لفظوں میں خدا کے کاموں میں مداخلت قرار دیتے ہیں اور جب وہی سائنسی حقیقت روز مرہ کا معمول بن جاتی ہے تو پھر کہہ اٹھتے ہیں کہ دیکھا مذہب کی فلاں فلاں شق کے مطابق بھی ایسا ہی تھا! بندہ پوچھے حضرت اگر مذہب نے سینکڑوں سال اور ہزاروں سال پہلے ہی کہہ دیا تھا تو اس کے ماننے والوں نے ویسا کر کے کیوں نہیں دکھایا تھا۔ یا اب سے پہلے اس شق کی ویسی تشریح کیوں نہیں کی گئی تھی۔ سیدھی سی بات ہے سائنس کی ایجادات اور انکشاف سے پہلے اس پہلو سے سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ عجیب بات ہے براہ راست نزول شدہ علم انسان کی ایسی راہنمائی نہ کر سکا جس سے قوانین فطرت کو سمجھا جا سکتا۔ جادوئی معجزوں کا ذکر مذاہب میں ایسے ملتا ہے جیسے یہ کائنات منظّم نظام کے تحت نہیں، کسی شعبدہ بازی سے چل رہی ہو۔ تمام مذاہب اس طرح کے قصوں اور واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ کیا خدا کسی کمپلیکس میں مبتلا ہے کہ وہ معجزے دکھائے گا تب لوگ اس پر یقین کریں گے؟ کیا وہ خود کو برہان وعقل کی بنیاد پر نہیں منوا سکتا؟ اگر یہ عقائد کے نظام انسان کو ان قوانین کی حقیقی آگاہی دیتے جن سے کائنات چل رہی ہے تو خدا پر انسان کا ایمان زیادہ ٹھوس بنیادوں پر ہوتا۔

مذہب اور سائنس کا اختلاف صرف دنیا و کائنات کے علم تک ہی محدود نہیں، وہ روزمرہ کی معاشرتی زندگی تک پھیلا ہوا ہے۔ قدامت پرستی، جمود اور موجود حالت (Status Que) کی حمایت ہمیشہ مذہبی حلقوں کی طرف سے کی جائے گی۔ وہ اطوار حیات میں کسی بھی تبدیلی کو نہایت ناگواریت سے قبول کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مذہب نے ہمیشہ ایک ٹھہری اور بنی بنائی دنیا کا تصور رکھا ہے۔ تغیر میں انہیں اپنا انجام نظر آتا ہے جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں سائنس ہر آن بننے اور بدلنے والی دنیا کا تصور پیش کر تی ہے۔ اس کے نزدیک موت اور حیات دو الگ الگ Phenomenon نہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے عمل ہیں۔ ہر چیز ہر وقت بن بھی رہی ہوتی ہے اور بگڑ بھی۔ خدا سے براہ راست علم لینے والے زمین، چاند، سورج، ستارے، نباتات وحیوانات کے بننے کا ذکر یوں کرتے ہیں جیسی یہ آج دکھائی دے رہی ہیں۔ وقت تخلیق بھی ایسے ہی تھیں۔ حالانکہ انہیں موجودہ شکل میں آنے میں کروڑوں، اربوں سال لگے اور یہ سب آج بھی تبدیلی کے عمل سے گذر رہی ہیں مثلاً کہنا یہ زمین خدا نے بنائی تھی، سوال پیدا ہوگا وہ کونسی والی زمین تھی۔ موجودہ شکل تک پہنچنے سے قبل زمین کئی سو کروڑ سال تک مختلف حالتوں میں رہی۔ کبھی صرف گیس اور غبار تھی، کبھی بغیر پانی کے، کبھی اس کی فضا صرف زہریلی گیسوں پر مشتمل تھی اور کبھی یہ فقط برف کا گولہ تھی۔ مندرجہ بالا معروضات سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی اس کائنات کی خالق ہستی ہوتی تو اس کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہ ہوتا۔ اگر اسے لوگوں تک براہ راست علم پہنچانا ہوتا تو وہ اس دنیا کی بلکل صحیح تصویر کشی کرتا جب کہ معاملہ برعکس ہے۔ علوم الٰہیات کے مدعی حیات و کائنات کے بارے بچگانہ قصے کہانیاں اور نہایت سطحی اور سادہ لوحی پر مبنی معلومات فراہم کرتے رہے ہیں جو انسانی شعور کے بچپن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تضاد پر ہمیں غور کرنا ہوگا کہ اول الذکر کی اس کائنات کے بارے معلومات کیوں ناقص رہی ہیں اور کیا اسے خدا کا براہ راست دیا علم ایسے حالات میں سمجھا جا سکتا ہے؟

شیطان اور خدا

ہم دیکھتے ہیں خدا کے ساتھ ساتھ شیطان کا تصور بھی کسی نہ کسی شکل میں تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ جس سے اس عالم میں پائی جانے والی بدی کی تشریح کی جاتی ہے اور اس کے مقابل خدا کو خیر محض کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ سوال اٹھتا ہے شیطان کا خالق کون ہے؟ اگر شیطان کو بھی خدا کی طرح ابدی اور خود مختار ہستی کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو اس سے خدا کی لاشریک مقتدر اعلیٰ کی صفت مجروح ہو جاتی ہے لیکن اگر اسے مخلوق سمجھا جائے تو اس سے سوال پیدا ہو گیا کہ برائی کے اس ماخذ کو خدا نے آخر پیدا ہی کیوں کیا۔ اس سوال کا کچھ بھی جواب دیا جائے۔ اس دنیا میں ساری برائی اور شر کا رخ بالآخر نہ صرف خدا کی طرف پھر جاتا ہے بلکہ اس کے ''خیر محض'' ہونے کی صفت بھی قائم نہیں رہتی کہ برائی کے سب سے بڑے سرچشمے کو پیدا کرنے والی ہستی خود اس کی اپنی ہی ذات ہے! چنانچہ مذاہب کے دیئے شخصی نوعیت کے تصور خدا پر ہمیشہ یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ خدا نہ صرف خیر محض ہے بلکہ اس کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا تو دوسری طرف وہ شر کے منبع کو نہ صرف پیدا کرتا ہے بلکہ وہ دنیا میں دندناتا پھرتا ہے۔ ایسی صورت حال میں شر کے وجود کی ذمہ داری سے خدا کو مبرا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ زرتشت نے اس طرح کی صورت حال سے بچنے کے لئے یزداں اور اہرمن کا تصور پیش کیا۔ یزداں نیکی اور اہرمن بدی کا سرچشمہ قرار پایا۔ چنانچہ مجوسیوں نے اہرمن کو بھی وہی درجہ دیا جو یزداں کو حاصل ہے لیکن مشرق وسطیٰ کے مذاہب نے اہرمن (ابلیس) کا درجہ ذرا کم کر دیا لیکن اس سے خدا، بدی کے ماخذ کا بھی خالق بن گیا۔ اسی طرح نیکی و بدی اور جزا سزا کا سارا عمل ایک بے رحم ''ڈرامے'' کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس الزام سے کسی حد تک بچنے کے لئے یہ کہا گیا کہ ابلیس نے خود ہی خدا کی حکم عدولی کی، جس کے نتیجے میں اسے بے عزت کر کے خدا کے دربار سے نکال باہر کیا گیا۔ اس دن سے وہ انسان کو ورغلانے اور خدا انسان کو ابلیسیت سے بچانے کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ کائنات کے ان دو ''بڑوں'' کے بیچ میں شامت اعمال بے چارے انسان کی آ گئی۔ کہا جاتا ہے کسی نے ابلیس سے پوچھا کہ تو نے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم کیوں نہ مان لیا تو ابلیس نے جواباً کہا کہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا گیا جہاں سے وہ کوئی بھی راہ چنتا، اس کا یہی انجام طے ہو چکا تھا کیونکہ پہلے سے ایک حکم موجود تھا کہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرنا اور پھر خود ہی آدم کے بت کو سجدہ کرنے کو کہہ دیا گیا اگر وہ سجدہ کر بھی دیتا تو یہ الزام لگایا جاتا کہ تمہارا امتحان لیا جا رہا تھا کہ خدا کے سوا تم کسی کو سجدہ کرتے ہو یا نہیں۔ خیر یہ توجیہ برسبیل تذکرہ آ گئی۔ بات یہ ہے کہ جس طرح خدا کو ''شخصیت'' دے دی جاتی ہے اسی طرح شیطان کو بھی ایک ''شخصیت'' متصور کر لیا جاتا ہے۔ ایک ایسا ماورائی وجود جو ہر جگہ شر اور بدی کے اسباب پیدا کرتا رہتا ہے، چنانچہ جہاں ''خانہ خدا'' بنائے گئے۔ وہاں شیطان کے اینٹ پتھر سے بنے چبوترے بھی کھڑے کئے گئے۔ جس طرح خدا کے ساتھ انسانی صفات منسوب ہونے سے وہ بہت چھوٹا ہو جاتا ہے اسی طرح شیطان کا ایک محدود اور شخصی تصور بدی کے موضوع کی جامعیت ہی ضائع کر دیتا ہے۔ چنانچہ شیطان کو منہ زبانی برا کہنے اور اس پر میکانکی طریقے سے کنکریاں برسانے والے افراد اور

معاشرے کے اندر کا ''شیطان'' جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ برائی کی کمیت و کیفیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ مذہب اس کائنات کے اندر موجود بدی' شر اور منفی قوتوں کی صاف اور واضح توضیح پیش کرنے سے بھی قاصر ہے تو بے جا نہیں لگتا۔ حالانکہ اس کا سارا دارومدار ہی بدی اور شر کے خلاف جہاد میں رہا ہے۔ شر اور بدی کے بارے میں بھی اس کا موقف انسان کے بچگانہ شعور کی باقیات کو ہی منعکس کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا شر صرف انسانی زندگی کا ہی حصہ ہے یا دیگر اشیاء اور مظاہر میں بھی یہ عمل جاری ہے۔ اس معلوم کائنات میں صرف خیر محض کا تصور کہیں نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ یہ دنیا مثبت اور منفی یعنی نیکی اور بدی کا مرکب معلوم ہوتی ہے۔ واضح طور پر اس کائنات میں بدی اس قدر موجود ہے جتنی نیکی۔ صرف مثبت چارج (اقدار) سے اس کائنات کے وجود کا تصور بھی ناممکن ہے۔ کہکشاؤں کی دنیا سے لے کر ایٹم کی خوردبینی دنیا تک ہر جگہ اور ہر آن تعمیر اور تخریب کا عمل یکساں نظر آتا ہے۔ چنانچہ کیا ایسا نہیں ہے کہ ''شیطان'' اور ''خدا'' ناگزیر طور پر ایک دوسرے کے وجود سے وابستہ ہیں۔ دراصل اس دنیا و کائنات کو خیر اور شر کے معیارات سے دیکھنا صحیح نہیں ہے۔ یہ پیمانے انسان اپنے تاریخی اور جغرافیائی حالات کے مطابق خود بناتا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ زلزلہ خیر ہے کہ شر؟ ابتدائی انسان نے اسے بدی کی قوت کے طور پر محسوس کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ انسان کے لئے تباہی کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ آج بھی مذہبی حلقے اسے خدا کا قہر اور لوگوں کے گناہوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن کیا کائنات کے حوالے سے زلزلہ کو شر قرار دیا جا سکتا ہے۔ بڑے دائرے میں جا کر جب غور کیا جائے تو زلزلوں کے بے شمار خیر کے پہلو دکھائی دیں گے۔ آج ہم اپنی زمین کو خدا کی جو بہترین تخلیق قرار دیتے ہیں۔ ارضیاتی سائنس کے مطابق اس کی موجودہ ہیئت ساری کی ساری زلزلوں کی ہی مرہون منت ہے! خود زندگی کا آغاز اور بقاء کے ڈانڈے زلزلوں کے پیدا کردہ اثرات سے ملائے جا رہے ہیں۔ ان مذہبی پیشواؤں سے یہ بھی پوچھ لینا چاہیے کہ جب اس دھرتی پر انسان کا وجود ہی نہ تھا' زلزلے تب بھی آیا کرتے تھے۔ خود سمندر کے اندر ہر وقت کہیں نہ کہیں زلزلے آتے رہتے ہیں جو نئے جزائر کی تخلیق کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ان زلزلوں کے بارے تو ہمیں کوئی خبر بھی نہیں ملتی۔ کیا زیر سمندر زلزلے مچھلیوں یا دیگر آبی جانداروں کے گناہوں کی پاداش ہوتے ہیں؟ کیا زلزلے کی حدود سے باہر گناہ سرزد نہیں ہو رہے ہوتے؟ تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ خدا باقی لوگوں کے لئے عبرت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ کیا چند معصوم اور غیر معصوم لوگوں کا انتہائی بے دردی سے قتل و غارت کر کے دوسروں کے لئے محض عبرت کا سامان پیدا کرنا بذات خود ایک ظالمانہ کھیل نہیں۔

ان سب گزارشات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس ''علم'' نے خیر اور شر کے عنوان کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ خیر اور شر کی من مرضی کی تعبیریں کر کے انسانی شعور کو ورغلانے کا سبب بنتا ہے اور انسان کو دنیا کے حقیقی علم سے کوسوں دور کر دیتا ہے۔ جب کہ ''کافر'' سائنس دان ہر وقت انسان کو اس کارخانہ قدرت کے بارے صحیح علم فراہم کرتے رہتے ہیں۔ ہم زلزلوں یا اسی طرح کی آفات سے گناہوں کی تعبیریں ڈھونڈتے رہتے ہیں جب کہ وہ ایسے آلات ایجاد کرتے ہیں جو ان آفات کا قبل از وقت علم دیں۔ تعمیرات کے لئے ایسے ڈیزائن اور میٹریل بنانے کے بارے غور کیا جاتا ہے جس سے زلزلوں کے منفی اثرات سے بچا

جا سکے۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ کائنات کے حوالے سے خیر اور شر اپنا الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔ ہر خیر کسی کے لئے شر ہے اور ہر شر کسی دوسرے کے لئے خیر کا موجب ہے۔ اب مسئلہ آجاتا ہے انسانی دنیا اور اس کی معاشرت کا۔ یہاں پر بھی مذہب اپنے دعویٰ میں نہایت کمزور دکھائی دیتا ہے کہ وہ انسان کو بہترین اخلاقیات کی طرف گامزن کرتا ہے بلکہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ خدا پر ایمان کے بغیر انسان نیکی کے راستے پر کیسے چلے گا اور اسے بدی سے باز کیسے رکھا جاسکے گا۔ اس سے پیشتر کہ نیکی اور بدی کے سوال پر کسی گہرے تجزیئے میں جایا جائے ان کے مذکورہ دعوے کو پرکھنے کے لئے انہی ایمان یافتہ لوگوں پر سرسری نظر ڈال لی جائے تو وہ خود انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نیکی پر چلنے اور برائی سے بچے رہنے کی کوئی مثالی تصویر پیش کرتے نظر نہیں آتے بلکہ ایک عام نظر سے ہی نتیجہ سامنے آجاتا ہے کہ عقائد زدہ قومیں مذہب سے دور قوموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اخلاقی گراوٹ، منافقت، لوٹ مار، بے ایمانی بد دیانتی، استحصال، کام چوری، سہل پسندی، جستجو سے عاری، وقت کی قدر سے بے نیاز اور ذاتی مفادات کی ماری نظر آئیں گی۔ انفرادی سطح پر بھی جتنا زیادہ کوئی پابند مذہب ہوگا اتنا ہی اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے لئے ناقابل اعتبار ہوگا۔ لوگ عام تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ایسے شخص سے بے اصولی، اخلاقی گراوٹ اور خود غرضی کی زیادہ توقع کرتے ہیں چنانچہ سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ خدا کے نام پر انسان کو برائی سے بچایا اور نیکی کے راستے پر نہیں لگایا جا سکتا۔ مذہب پر عمل پیرا بے شمار لوگوں کا عملی کردار اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آج مذاہب صالح معاشرہ پیدا کرنا تو دور کی بات ہے چند صالح افراد بھی پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ لوگ ایمان تو رکھتے ہیں لیکن اس کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ ان حضرات کو عمل سے کس نے روکا ہوا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم مذہب کے قابل عمل نہ ہونے کو زبان پر لانے سے ہچکچا رہے ہیں۔ کیوں کہ بدلے ہوئے حالات میں نہ تو وہ معاشرت سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ہی انسانی فطرت سے موافقت اور دوسری بات یہ ہے کہ مذہب کو کتنا ہی ضابطہ حیات قرار دینے کی کوشش کی جائے، وہ اپنی اصل میں چند اعتقادات اور کچھ رسومات کے مجموعے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اخلاقیات کی بیساکھی محض طرز کہنہ کو برقرار رکھنے اور خود اپنا جواز قائم رکھنے کے سوا کچھ نہیں، ورنہ اخلاقیات کے دائرے میں بھی مذاہب کوئی مثالی نظام پیش نہیں کرتے۔ اخلاقیات بھی انسانوں کی اپنی پیدا کردہ چیز ہے۔ پوری انسانی تاریخ ہی نہیں، تمام مذہبی اور الہامی کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ مختلف انسانی ادوار میں مختلف بلکہ ایک دوسرے سے متضاد اخلاقی اصول معاشروں میں رائج رہے ہیں۔ اخلاقیات کا بھی ایک ماضی ہے اور وہ ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا ہے۔ وہ بات جو ایک وقت میں نیکی تھی دوسرے وقت میں بدی قرار پائی اور بدی نیکی۔ اسی طرح ایک خطے کی نیکی دوسرے خطے میں برائی پر محمول کی جاتی رہی ہے۔ نہ تو کوئی مطلق نیکی ہوتی ہے، نہ مطلق بدی۔ خود مذاہب اپنے مختلف ادوار میں مختلف نظام اخلاقیات پیش کرتے رہے ہیں۔ نظام اخلاقیات معاشرے میں انسانوں کے درمیان توازن، تناسب اور عدل پید کرتا ہے۔ اس پر کسی کے جملہ حقوق محفوظ کر نے کا دعویٰ غلط ہے۔ اخلاقیات کا ایک حصہ وہ ہوتا ہے جو کسی مخصوص خطے، مروجہ معاشی، سماجی، تاریخی اور ثقافتی مخصوص صورت

حال سے جڑا ہوتا ہے۔ اخلاقیات کا یہ حصہ صورت حال کے تبدیل ہونے سے بدل جایا کرتا ہے۔ مثلاً چوری، جھوٹ وغیرہ کو غیر اخلاقی قرار دینا تمام نوع انسانی کا مشترکہ تہذیبی ورثہ ہے لیکن سر پر ٹوپی ......ایک وقت میں ضابطہ اخلاق کا حصہ تھی لیکن آج ننگے سر ہونا معمول کی بات ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ نیکی کا جذبہ محرکہ کیا ہوگا اور اگر انسان کو بدی سے فائدہ پہنچ رہا ہوگا تو وہ بدی سے کیسے باز رہے گا؟ مذہب اس کے لئے خوف خدا کا تصور پیش کرتا ہے چنانچہ وہ ڈرا کر یا پھر اگلی دنیا کا لالچ دے کر لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف لے جانے کے لئے جذبہ محرکہ (Incentive) فراہم کرتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مذکورہ حربہ قدیم انسان پر شاید سودمند ثابت ہوتا ہوگا لیکن آج کے انسان کا شعور اتنا تہذیب یافتہ ہو چکا ہے کہ کسی عمل کے جذبہ محرکہ کے لئے خوف اور لالچ گھٹیا اور منفی ہتھیار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر کوئی پائدار اور مثبت اقدار قائم نہیں کی جاسکتیں۔ خوف انسان کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو کچل دیتا ہے اور انسان کو منافقت کی راہ پر لے جاتا ہے۔ ڈر کے زیر اثر صرف وقتی اور اضطراری نتیجہ پیدا کیا جاسکتا ہے اور لامحالہ لوگ دوہری زندگی اور دوغلے پن کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ مذہب سے لگاؤ رکھنے والے معاشروں میں منافقت کا جوز بردست کلچر پایا جاتا ہے وہ انہیں ہتھیاروں کا شاخسانہ ہے۔ اسی طرح بعد از موت نہایت پرتعیش زندگی کا لالچ بہت تھوڑے لوگوں کو اور وہ بھی وقتی طور پر متاثر کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے جہاں تک ایمان کا تعلق ہے لوگ اس سے اپنی وابستگی قائم رکھتے ہیں لیکن معمول کی زندگی عملاً وقت کے تقاضوں اور اپنے مفادات کے مطابق ہی گزارتے ہیں۔ لالچ اور خوف کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ لوگ اپنے ہی عقائد کو ''جل'' دینا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ مذہب کے ان پہلوؤں پر زیادہ زور دینے لگتے ہیں جو آسان اور سستے اور ان کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ چنانچہ پوجا پاٹ اور دوسری مذہبی رسومات کو ادا کر کے خدا کے خوف سے مبرا ہو جاتے ہیں اور مذہب کے دیئے ہوئے لالچوں پر اپنا حق بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ کیا ایسی بنیادوں پر کوئی نظام کسی سماج کا ضابطہ حیات بن سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ تقدس کے زیر سایہ بلا سوچے سمجھے، تحقیق و استفسار کے اپنے اپنے مذہب کے کسی سنہرے دور کے بارے کچھ خوش کن متھ چلتی رہتی ہیں جنہیں اہل ایمان بغیر کسی سند و تحقیق اور غیر جانبدارانہ تجزیئے کے قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے میں کون ہوگا جو ان کے ماضی کے قصوں کو جیتے جاگتے ماحول میں فٹ کر کے پرکھ سکے۔ چنانچہ مذہب کے نام پر غیر حقیقی، جہالت پر مبنی اور عقل و شعور کا مذاق اڑانے والی باتوں یا قصوں کا کتنا ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیوں نہ کیا جائے، پڑھے لکھے لوگ بھی اسے ایسے ہی قبول کر لیتے ہیں کیوں کہ مذہب کے دائرے میں سوال کرنے اور سوچنے کی حس ہی ختم کر دی جاتی ہے لیکن مزے کی بات ہے کہ جب معاملہ دوسرے مذہب کا آتا ہے تو تمام لوگوں میں عقل پسندی اچانک عود آتی ہے۔ ایک مذہب کو ماننے والا دوسرے کے مذہب کو جانچنے کیلئے مکمل عقلی دلائل استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن اپنے مذہب کے لئے عقل کو قفل لگایا ہوتا ہے۔

سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ لالچ اور خوف کے نتیجے میں خدا کے ساتھ تعلقات کاروباری یعنی کمرشل نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مذہبی اعمال اور رسوم کے نتیجے میں ثواب اور نیکیوں کی گنتی بار بار یاد کرائی جاتی ہے۔ گویا مقصد راست بازی نہیں، ثواب اور نیکیوں کا جمع کرنا ہے تا کہ انہیں بعد از موت زندگی میں ''کیش'' کرا کے خدا سے عیش و عشرت کا سامان حاصل کیا

جائے۔ خدا کے ساتھ جو رشتہ محبت، اپنائیت اور شعور کی گہرائی سے پیدا ہونا چاہیے وہ انتہائی کھوکھلا اور میکانکی بن کر رہ جاتا ہے۔ سوال خوف خدا کا نہیں اس کی خدائی کو سمجھنے کا ہونا چاہیے۔ خوف ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ ڈرانے والی چیز کو سمجھتے نہیں ہیں۔ سمجھ میں آنے کے بعد ڈر ہی ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ تفہیم کا رشتہ بن جاتا ہے۔ خدا کو 'ہوا' بنا کر پیش کرنا اور ایسی ہستی بتانا جو لالچ کی ہڈی پھینکتا نظر آتا ہے ثنا خوانی نہیں ہو سکتی۔ خدا کا ایسا امیج خدا کی ہی نہیں، خود انسان کی بھی توہین ہے۔ نیکی اس لئے ہونی چاہیے کہ اس کی ایک اپنی افادیت ہے نہ کہ خوف اور حرص کے زیر اثر، ورنہ ایسے لگے گا کہ ان لوگوں کا اصلاً خدا کے ساتھ کوئی قلبی اور روحانی رشتہ موجود نہیں۔

''اوپر والا''

خدا کی عرفیت (Nickname)

کھلے، بے کراں اور چمکتے نقطوں سے بھرے آسمان نے ہمیشہ انسان کو متحیر کئے رکھا ہے۔ آسمان ایک ایسا زبردستی کا منظر تھا جس سے انسان بچ نہیں سکتا تھا، وہ جہاں جاتا ایک گنبد نما آسمان اس کے سر پر موجود ہوتا جس پر ستارے جڑ دیئے گئے تھے۔ کبھی وہ سوچتے یہ کسی سیال مادے کا بنا ہے جس پر ستارے کشتیوں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں۔ انہی آسمانی سمندروں سے دیوتا (خدا) گناہ گار دنیا کو سیلاب سے تباہ کر دیا کرتے۔ کبھی وہ آسمان کو ٹھوس مادے کی بنی محراب دار چھت سمجھتے اور انہیں اس کے ٹوٹ (Crash) جانے کا خدشہ ہوا کرتا۔ قدیم ترین کندہ (Engraved) پتھروں سے پتہ چلا ہے کہ قبل از تاریخ کا انسان اپنی نگاہیں آسمان کی طرف لگائے رکھتا تھا۔ سائنس علماء کا کہنا ہے کہ قبل از تاریخ کے زمانے سے انسانی فکر میں آسمان نے دوہرا تاثر چھوڑا۔ ایک طرف فطرت کے غیر متبدل ضوابط جیسے گردش صبح وشام، موسموں کا پھیر اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور دوسری طرف خود کو آسمانوں پر لے جانے کی خواہش کرنا جو اس کے لئے ناقابل رسائی تھی۔

اس پر تحیر آسمان کی وضاحت کے لئے قادر مطلق، پر اسرار اور ڈرانے والی ہستیوں کا جنم ہوا۔ 4000 قبل از مسیح میں دریائے عرفات کے کنارے رہنے والے بابلیوں نے ستاروں کو بارہ جھرمٹوں میں تقسیم کر دیا جنہیں Zodiac Signs کہا جاتا ہے۔ وہ ان ستاروں کی پوزیشن دیکھ کر دیوتاؤں کے ارادوں کا تعین کرتے تھے اور اپنے حکمرانوں کی خیریت کو یقینی بناتے تھے۔ یہیں سے آسمان کے بارے قدیم کتھائیں (Myths) بنیں۔ انسان آسمان پر جہاں ایک نظم وضبط دیکھتا وہاں کبھی کبھی وہ شدید بدنظمی اور غیر معمولی حرکتوں کا مظاہرہ کرنے لگتا۔ سورج و چاند گرہن، دم دار اور ٹوٹتے ستارے نمودار ہوتے یا پھر غضب ناک آسمان سے گرج چمک، سیلابی بارشیں، تشدد آندھیاں اور سمندری طوفان اُمڈ آتے۔ تصور خدا کی نمو کے لئے آسمان نے بڑا مرکزی کردار ادا کیا جو ہر جگہ موجود، وسیع اور ناقابل رسائی تھا۔ چنانچہ آسمان ہمیشہ سے دیوتاؤں کا مسکن رہا ہے۔ آسمان کے بارے جس طرح کے بھی فرضی قصے رپورٹ ہوتے، لوگ انہیں آسانی سے قبول کر لیا کرتے تھے۔ انسان سمجھتا تھا کہ زمین کا نظام آسمان کی بہ نسبت زیادہ نازک (Fragile) ہے جو آسانی سے خطرے میں پڑ سکتا ہے چنانچہ لوگوں نے ہمیشہ آسمان کی طرف دیکھا۔ اس لئے کہ ان کی زندگی اور خیریت کا براہ راست انحصار آسمان کے رحم وکرم پر تھا۔ موسموں کی

باقاعدگی میں کوئی خرابی انسانوں کی ناکامیوں پر خدا کے غصے کا اظہار تھا۔ دیوتاؤں اور خدا کے تصور کو ذہنوں میں بٹھانے کے لئے مذاہب ہمیشہ آسمان کو مرعوب کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں کیونکہ لوگ آسمان کے بارے میں معلومات کے لیے صرف اپنی آنکھوں اور ذہانت پر ہی بھروسہ کر سکتے تھے۔ آسمان کو سادہ آنکھوں سے دیکھ کر ہی انہوں نے اس کے بارے ایسا ''علم'' بنالیا کہ اسے حرف آخر سمجھنے لگے۔ مزید اسراریت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے سات آسمانوں کا نظریہ گھڑا گیا۔ سب سے اوپر خدا براجمان تھا جہاں بیٹھنے کے لئے اسے کرسی مہیا کر دی گئی۔ قدیم مذاہب میں آسمان کے بارے بے شمار قصے کہانیاں ایک طرف، خود جدید مذاہب سے پتہ چلتا ہے کہ آسمان کی اسراریت کے بارے وہم اور تجسس انسان کی نفسیات کا کس حد تک حصہ بن چکے تھے۔ بائبل کے مطابق یعقوب ہران جاتے ہوئے ایک جگہ رات بسر کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔ وہ ایک پتھر پر سر رکھ کر سو جاتے ہیں۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سیڑھی زمین سے آسمان کی طرف جا رہی ہے۔ اس سیڑھی کا اوپر والا سرا آسمان کو پہنچ جاتا ہے جس پر سے فرشتے اتر اور چڑھ رہے تھے۔ اوپر خدا کھڑا تھا، اس نے یعقوب کو آواز دی۔ ''دیکھو میں خدا ہوں، تمہارے باپ ابراہیم اور اسحاق کا خدا۔ یہ زمین جس پر تم لیٹے ہوئے ہیں تمہیں اور تمہاری آنے والی نسلوں کو دے دوں گا۔'' اسی طرح یہووا (خدا) بادلوں کی اوٹ سے موسیٰ سے باتیں کیا کرتا تھا! چھ دن خدا بادلوں میں چھپا رہا اور ساتویں دن اس نے موسیٰ کو آواز دی تھی!!

دیکھا گیا ہے کہ خدا کا ''اوپر والے'' کی حیثیت سے تصور تمام مذاہب کے ماننے والوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ رحمت اور مدد کے لئے دعائیں ہاتھ اور نگاہیں اوپر کی طرف ہی اٹھائی جاتی ہیں۔ خدا کے ''اوپر'' قیام پذیر ہونے کا عقیدہ اتنا راسخ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والا خدا کو بلا تکلف ''اوپر والا'' کہہ کر پکارتا ہے۔ آیئے اس عقیدے کے مضمرات کا جائزہ لیں کہ کس طرح خدا کو مذکورہ عرفیت نہ صرف تصور خدا کو محدود اور ناقص بنا دیتی ہیں بلکہ اس سے دنیا و کائنات کی ہیئت کے بارے لاعلمی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے تصور کو آج ہم علم، حکمت اور منطق سے کتنا ہی لامحدود (Infinite) کرنے کی کوشش کریں۔ انسان کے ذہن میں لاشعوری طور پر اس کی حیثیت ایک شخصیت (Person) کی ہی رہتی ہے جو اس دنیا سے اوپر آسمان پر باقاعدہ کرسی پر براجمان ہوا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا آگے پیچھے، دائیں بائیں یا نیچے کیوں نہیں ہے۔ چونکہ اوپر سے نیچے کی چیزیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا انسانی شعور خدا کے لئے موزوں جگہ اوپر کی ہی سمجھتا رہا ہے۔ جس کے لئے نہ سمجھ میں آنے والا اور ہر جگہ موجود دآسمان آئیڈل جگہ تھی۔ دنیا اور دیگر مخلوقات کے ''نیچے'' قرار پانے سے خدا کی عظمت اور برتر حیثیت غیر مشکوک اور پکی بھی ہو جاتی ہے۔

خدا کو ''اوپر'' اور خود کو ''نیچے'' سمجھنا قدیم زمانے کے انسان کی مجبوری تھی کہ وہ اس زمین اور کائنات کی ہیئت سے بے خبر تھا لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ اولاً یہ زمین گول ہے۔ اس کے کسی بھی مقام کو اوپر یا نیچے نہیں کہا جا سکتا۔ ہر شخص کے اوپر کی سمت اپنے جائے مقام کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ ''نیچے'' والوں کا ''اوپر'' کسی اور طرف ہے اور ''اوپر'' والوں کا ''اوپر'' کسی اور سمت ہے۔ زمین کی گولائی اور کشش ثقل کی وجہ سے ہر کوئی ایک ہی وقت میں ''نیچے والا'' بھی ہے اور ''اوپر والا'' بھی۔

اس گول زمین پر جو کوئی جس حصے میں بھی رہتا ہے خود کو ''اوپر'' سمجھتا ہے اور آسمان کو اپنے اوپر پاتا ہے۔ زمین کے ہر طرف آسمان ہے اور ہر ایک کا ''اوپر'' دوسرے کے حوالے سے ''نیچے'' ہے۔ سوال پیدا ہوتا خدا کون سے والے ''اوپر'' رہتا ہے۔ دوسرے زمین کو ''نیچے'' اور آسمان کو ''اوپر'' سمجھنا۔ ہزاروں سال پہلے والے انسان کے لئے مناسب تھا۔ آج ہم جانتے ہیں کہ زمین آسمان کے ''نیچے'' ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ بھی دیگر اجرام فلکی کے ہم پلہ اوپر آسمانوں میں محو گردش تیر رہی ہے۔ مثلاً چاند ہمیں اوپر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب ہم چاند پر جا کر کھڑے ہوتے ہیں تو زمین ہمیں اوپر دکھائی دے گی۔ کائنات میں ''اوپر'' اور ''نیچے'' اضافی (Relative) اصطلاحیں ہیں۔ وہ اپنا الگ سے مطلق (Absolute) وجود نہیں رکھتیں بالفاظ دیگر اس کائنات میں حقیقی صورت حال یہ ہے کہ یہاں پر کوئی بھی مقام نہ اوپر ہے نہ نیچے۔ ایسے میں خدا کے ''اوپر'' اور مخلوقات کے ''نیچے'' ہونے کا سارا تصور باطل قرار پاتا ہے اور ایسا کہنا کوتاہ نظری اور لاعلمی کا مظہر ہی ہوسکتا ہے۔ خلا میں جانے کا مطلب ''اوپر'' جانا نہیں ہوتا بلکہ زمین کی کشش ثقل کو توڑ کر زمینی فضا کے غلاف سے باہر نکلنا ہوتا ہے۔ اس سے آپ اوپر نہیں جاتے، زمین سے صرف دور ہوتے ہیں اور یہ عمل کسی بھی سمت سے ہوسکتا ہے۔ کیا خدا کو ''اوپر'' کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پتھر کے زمانے کے انسانوں کی طرح آسمان کو اوپر فکس اور زمین کو ''نیچے'' ایک چیز سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح جیسے پہلے زمانے کا انسان ''آسمان'' سمجھتا تھا وجس پر اس نے اپنے عقائد کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ تصور ہی باطل ثابت ہو چکا ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ ''آسمان'' بذات خود کوئی چیز ہی نہیں، وہ تو صرف خلا ہے اور اجرام فلکی کے بیچ کروڑوں اربوں نوری سالوں کے فاصلے ہیں۔ سات آسمان تو کجا عام معنوں میں کسی ایک ''آسمان'' کا بھی کوئی وجود نہیں۔

اس سارے تناظر میں کیا یہ دکھائی نہیں دیتا کہ خدا کو اوپر بٹھانے میں انسان کی اپنی سوچ اور نفسیات کارفرما تھی اور کائنات کے صرف ناقص علم کے ساتھ ہی مروجہ تصور خدا قائم رہ سکتا ہے۔

فلسفہ اور خدا

فطرت اور خدا کے وجود کے بارے غور وفکر یونانی فلسفے کا ہمیشہ بنیادی جز و رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی فلسفے کے ابتدائی زمانے میں ہی ایسے فلسفیانہ افکار سامنے آنے لگے جو عقائد کے دعوؤں، پرستشی اعمال اور یہودی طرز کے الہامی مذاہب سے یکسر مختلف تھے۔ چھٹی صدی قبل از مسیح کے اواخر میں زینوفینس (Xenophanes) (جو کہ قدیم ترین فلسفی شاعر تھا) نے کہا کہ ''اگر جانور اپنے ہاتھوں سے ڈرائینگ کر سکتے یا نقش ونگار بنانے کے فن سے آشنا ہوتے تو گھوڑے کا خدا بھی گھوڑے ہی جیسا ہوتا اور بیل کا خدا بھی بیل کی مانند۔'' اس کے صرف نصف صدی کے بعد ہی یعنی 400-480 قبل مسیح ایک فلسفے کے معلم Critias نے خیال پیش کیا کہ ''خدا پر ایمان سماجی طور پر ایک مفید افسانہ ہے جسے ہوشیار لوگوں نے اس لئے ایجاد کیا تا کہ انسان اپنی نجی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے اس پر نظر رکھی جا سکے۔ لوگوں کی زندگیوں پر اس سے زیادہ موثر نگرانی کا طریقہ ریاست کے لئے کوئی اور ممکن نہیں تھا۔'' فلسفے کی ابتداء سے اس طرح کے بے لاگ تبصروں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے سے ہی خدا یا دیوتاؤں کے بارے تنقیدی نظریات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا چنانچہ دوسری صدی عیسوی تک خدا کے ہونے یا نہ ہونے کے مباحث اور دلائل کا دور چلتا رہا لیکن عیسائیت کے خدائے واحد کا تصور جب ایک سنجیدہ قوت کی حیثیت سے ابھرا اور اس کے پرانے فطرت پرستانہ عقائد اور غیر عیسائی فلسفی نظریوں پر بالا دستی قائم ہوگئی تو پانچویں صدی کے آخر اور چھٹی صدی کے شروع تک فطرت (Nature) اور خدا کے بارے کسی بھی آزادانہ چھان بین اور تحقیق و تفتیش کرنے کے امکانات کا قلع قمع ہو گیا۔ اب عیسائی اور پھر ساتویں صدی میں مسلم بھی کسی ایسی دنیا میں نہیں رہتے تھے جہاں دوسرے مذاہب یا فلسفیانہ نظریات کا کوئی وجود ہو۔ گویا اب ان کی اپنی بنائی ہوئی دنیا تھی جہاں ان کے خدائے واحد کا بول بالا تھا۔ ایک ایسے الہامی خدا پر عقیدہ جس نے دیگر سب مخالف مذاہب اور اس سے غیر مطابقت فلسفوں کو رد کر دیا تھا۔ الحاد (Atheism) ایک ناقابل برداشت فسق و فاجر اور جھوٹ قرار پا چکا تھا۔ عیسائیت نے جب بادشاہ قسطنطین (Constantine) کے دور میں مکمل دنیاوی اقتدار حاصل کر لیا تو وہ نہ صرف دوسرے مذاہب اور غیر ہمدردانہ فلسفوں پر بلکہ خود اپنے اندر پائے جانے والے مختلف مکاتیب فکر پر بڑی بے رحمی کے ساتھ چڑھ دوڑے۔ جس کی مغربی دنیا میں پہلے کبھی نظیر نہیں ملتی۔ اس نئے مذہب یعنی عیسائیت کے خلاف جو بھی تنقیدی ادب لکھا گیا اسے جلا دیا گیا اور قدیم فلسفے کے جو غیر عیسائی مدرسے تھے انہیں بند کر دیا گیا۔ 529ء کے زمانے تک فلسفہ وفکر کو ان عقائد اور نظریات کی وضاحت، ترتیب و درستی اور فہم تک

محدود کر دیا گیا جو پہلے سے ہی ایمان کا حصہ تھے یا پھر یونانی فلسفے کے وہ دلائل جو وحدانیت کے تصور کی حمایت میں تھے ان کو عیسائیت کا حصہ بنا دیا گیا۔ لہٰذا مذکورہ فضا میں خدا کے وجود کے برحق ہونے کی حمایت میں دلائل ابھرنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ سینٹ آگسٹائن (SaintAugustine) افلاطون کی ''مثالی دنیا'' کے نظریات کو استعمال کرتے ہوئے لکھتا ہے ''خدا ایک کامل اور حقیقی ہستی کے طور پر وجود رکھتا ہے۔ اس پر ہمارا بلاشک وشبہ ایمان ہے۔ اب ہم خدا کو پورے ایقان کے ساتھ پاسکتے ہیں خواہ وہ علم کی کوئی لطیف تر شکل ہی کیوں نہ ہو۔'' اس کے 100 سال بعد سینٹ تھامس اکیناس (Saint Thomas Aquinas) بھی یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ ''خدا کی صداقت کو اب ہم عقلی دلائل کی قوت سے بھی جان سکتے ہیں کہ وہ اپنا وجود رکھتا ہے۔''

ہم فلسفہ اور خدا کے تعلق کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں: ایک وہ دور تھا جب خدا کے بارے کھلم کھلا غور و فکر یا قیاس آرائی کی جا سکتی تھی۔ یہ دور 450ء اور 350ء تک ختم ہو گیا۔ دوسرا دور وہ تھا جب تمام بحث کٹر مذہبی عقائد (Dogmas) اور خدائے واحد کو ثابت کرنے تک محدود ہو گئی۔ اس کے بعد تیسرا تنقید اور تشکیک کا دور شروع ہوا جس کا رخ ایک بڑے ردعمل کے طور پر وحدانیت کے پیدا کردہ شخصی تصور خدا کے خلاف عقل و فراست کے استعمال کی طرف تھا یہ آخری دور سترھویں صدی میں شروع ہوا تھا اور جو ہنوز جاری ہے۔ خدا کے بارے دو بڑے نظریئے پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ توحید خداوندی (Theism) ہے۔ اس عقیدے کے مطابق ایک ہی ازلی اور ابدی خدا ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہی اس کائنات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ وہ تخلیق کے عمل میں ہر وقت سرگرم رہنے کے علاوہ ہر چیز کی خبر گیری اور اس پر توجہ رکھتا ہے۔ انسان خاص طور پر اس کی خصوصی تخلیق ہے۔

دوسرے نظریئے کو ڈی ازم (Deism) کہتے ہیں۔ اس میں بھی عام طور پر ایک ہی خدا کا تصور ہوتا ہے لیکن وہ وحی کے ذریعے انسان کے ساتھ رابطہ نہیں رکھتا۔ اس کے مطابق خدا نے دنیا تخلیق کر دی اور اسے ایک منظّم حرکت دے دی اور کائنات کو جیسی نظر آتی ہے چلا دیا ہوا ہے جس کے بعد خدا نے ہر چیز کو قوانین فطرت کے ساتھ چھوڑ دیا ہوا ہے یا پھر کم از کم انسان پر اس کی کوئی خصوصی توجہ نہیں ہے۔

خدا کے ہونے کی پہلی دلیل یہ دی گئی کہ خدا کے تصور پر انسان کا ہمیشہ سے ایمان رہا ہے خواہ وہ انسان کسی بھی زمان اور مکان سے تعلق رکھتا ہو۔ خدا کی دوسری دلیل یہ پیش کی گئی کہ کائنات ایک بڑے ہی منظّم طریقے سے چل رہی ہے۔ ارسطو کے مطابق دیوتاؤں کا تصور انسان کے ذہن میں دو بنیادی اسباب کی وجہ سے پیدا ہوا۔ ایک سماوی حقیقت (Cosmic Phenomena) اور دوسرے وہ داخلی وارداتیں جنکا تعلق روح سے ہے۔

جہاں تک اول الذکر عموی اتفاق رائے کی دلیل کا تعلق ہے یعنی یہ مشاہدہ کہ انسان جہاں کہیں بھی پایا گیا خواہ اس کا تعلق کسی بھی تہذیب سے تھا یا وہ دور جنگلات میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا، اس کے دیوتا (خدا) ضرور تھے، وہ قربانیاں نذر کرتے، خدا کے نام کی مقدس جگہیں تعمیر کرتے اور پوجا پاٹ کی رسوم ادا کرتے۔ فرق یہ تھا یہی کام کوئی کسی طریقے سے کرتا،

دوسرا کسی اور طریقے سے لیکن سب کا متفقہ ایمان تھا کہ اس دنیا کو کوئی ماورائی قوت چلانے والی ضرور ہے۔ البتہ اس قوت کی نوعیت اور فطرت کے بارے یکساں تصور نہیں تھا اگر ان کا تصور غلط ہوتا تو وہ سب خدا کے ہونے کے دلائل ایک ہی طریقے سے نہ دیتے۔ چنانچہ اس کا مطلب ہوا کہ خدا ہے۔ ایپی کیورس (Epicureus) کی دلیل تھی، دیوتاؤں پر ایمان کے لحاظ ساری انسانیت ہم خیال رہی ہے۔ گویا خدا کا تصور جبلی اور طبعی طور پر انسان کے اندر موجود ہے۔ دیوتاؤں (خدا) کے وجود کا تصور انسان کی صلاحیت تفہیم کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ایک ایسا عقیدہ ہے جسے سب انسان فطری طور پر مانتے ہوں، وہ سچا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ خدا ہے۔ اس دلیل کا صرف یہی سادہ ترین پہلو نہیں تھا کہ جو بات سب مانتے ہیں وہ سچی ہی ہونی چاہیے بلکہ ان کا اس پر بھی زور تھا کہ خدا کا تصور جبلی (Instinctively) طور پر انسان کے اندر موجود ہے یعنی خدا کے بارے ہمارا جو شعور ہے وہ ہمارے وجود کا ایسے ہی حصہ ہے جیسے جنسی جبلت جس سے مفر ممکن نہیں۔ اس موقف کے خلاف جو تنقید سامنے آئی اس میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ دیوتاؤں کی پوجا یونیورسل نہیں رہی اور دوسرے ایک غیر مرئی اور ذہین طاقت کی نوعیت اور اشکال میں وسیع پیانے پر اختلاف (Diversity) موجود ہے۔ دوسرے آج کے جدید دور کی کامیاب ملحدانہ فلاسفی، سائنس اور سیاست اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ Stoic Ciceros کا مفروضہ غلطی پر تھا کہ خدا کا تصور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر اور بھی پکا ہوتا چلا جائے گا اور ہر آنے والی نسل پہلے سے زیادہ خدا پر ایمان رکھے گی۔ گویا مجموعی اتفاق رائے کی دلیل کی بنیاد جس حقیقت پر رکھی گئی تھی وہی مشکوک ہے۔ ڈیوڈ ہیوم (David Hume) 1757ء میں اپنی کتاب ''مذہب کی فطری تاریخ'' (The Nature History of Religion) میں مذہبی عقیدے کا سبب نامعلوم (Unknown) کا خوف بتاتا ہے۔ فطری مظاہر اور ان کے اثرات جو ظاہری طور پر انسان کے لئے معمہ تھے اور جن پر انسانی زندگی کا بہت سا انحصار تھا۔ اس طرح مارکس، فیور باخ اور فرائڈ نے مذہبی عقائد کے اسباب اور مذاہب کے جاری رہنے کی وضاحتیں بیان کیں۔ گو یہ ضروری نہیں کہ انہیں مکمل طور پر صحیح مان لیا جائے لیکن یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ خدا کا تصور انسانی دنیا میں ہمیشہ رہا ہے، اسے پھر بھی قبول نہیں کیا جاسکتا کہ مذاہب کی بہت سی سرگزشتیں ایسی ہیں کہ اگر مذاہب کی اصلیت (Origin) ان کے جمے رہنے اور ان کے غلبہ و پھیلاؤ پر غور کریں تو ان کی جڑیں مخصوص سماجی، قبائلی، نفسیاتی اور دیگر فطری اسباب میں ملتی ہیں۔ چونکہ یہ اسباب عملی طور پر ہر جگہ عام تھے چنانچہ ان کے اثرات بھی ہر جگہ عمومی طور پر پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ سوال باقی رہتا ہے کہ خدا کے وجود کے مفروضے کے لئے کیا اور بھی دلائل ہیں۔ ان نفسیاتی اور فطری اثرات کے علاوہ جنہوں نے اس عقیدے کو جنم دیا۔

دوسری دلیل:

"It is possible for a thing to be concieved and not exist.
[do not seek to understand so that]
believe; but I believe so that I may understnd."

سوال یہ تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی ایسی چیز کا تصور کیا جا سکے جس کا وجود نہ ہو۔ Anselom of Canterbury (1033ء1109ء) اس کے جواب میں کہتا ہے یہ بات عمومی طور پر صحیح ہے کہ ایسی چیز کا تصور نہیں کیا جاسکتا جس کا وجود نہ ہو لیکن خدا کا معاملہ بے مثل (Unique) ہے چنانچہ اس کے تصور میں اس کا وجود بھی شامل ہے۔ انسلوم کا کہنا تھا میں دنیا کو اس لئے نہیں سمجھنا چاہتا تا کہ میں اس پر یقین کرسکوں لیکن میں اس لئے یقین کرتا ہوں تا کہ میں اسے سمجھ سکوں۔ تاہم انسلوم کی اس دلیل پر نہ صرف فلسفہ بلکہ علمائے ادیان بھی تنقید کرتے رہے ہیں، جن میں اکیناس، ہیوم، کانٹ اور برٹرینڈ رسل شامل رہے ہیں۔ ڈیکارٹ Descartes (1591ء1650ء) نے خدا کے حق میں یہ دلیل پیش کی کہ خدا نمونہ کامل ہے اور چونکہ یہ دنیا بھی مکمل ہے لہٰذا خدا بھی موجود ہے یعنی

God in all perfection, existence in perfection

اس کے جواب میں ہیوم اور کانٹ نے کہا کسی ایسی چیز کا وجود بذات خود اس چیز کے ساتھ جڑی ہوئی دیگر خصوصیات (Characteristics) کی طرح نہیں ہوتا۔ جیسے کسی چیز کا رنگ، وزن، جائے مقام، ذہانت، زندگی اور اخلاقی خوبیاں وغیرہ۔ دوسرے لفظوں میں ''وجود'' کوئی وصف (Property) نہیں ہوتا کہ اسے کسی بھی چیز کی دیگر خصوصیات کا حصہ سمجھ لیا جائے۔ خدا کے وجود کے حق میں دلیل دینے والے ضروری وجود (Necesary Existence) اور حقیقی وجود (Real Existence) کے فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پہلے وہ خدا کو ایک ضروری وجود کے طور پر خیال کرتے ہیں اور پھر غیر مناسب طور پر نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ خدا کا حقیقی وجود ہے۔ چنانچہ پہلے خدا کو ضروری وجود کے طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے پھر اس بات پر زور دینا شروع کر دیا جاتا ہے کہ کسی ایسی چیز کا وجود ہے جو مخصوص خاصیتیں رکھتا ہے لیکن یہ اہل ایمان کے اپنے عقیدے کی وضاحت ہے نہ کہ اس بات کا ثبوت جس پر وہ یقین کرتے ہیں۔

Anselom کا ایک اور نقاد جینائل (Gannile) یہ نکتہ اٹھاتا ہے کہ اس طرح کی دلیل سے کسی بھی چیز کا وجود آپ حقیقی ثابت کر سکتے ہیں جسے آپ کا ذہن انتہائی مکمل ترین شکل میں متصور (Conceive) کر سکے۔ چنانچہ آپ ایک ایسے جزیرے کا تصور کر سکتے ہیں جو مکمل ترین ہو۔ اس میں کوئی خامی اور کمی باقی نہ رہ گئی ہو تو پھر بھی یہ سب مکمل ترین جزیرہ نہیں ہوگا کیونکہ جس جزیرے کے بارے آپ نے سوچ رکھا ہے وہ اس سے زیادہ کامل ترین ہوگا جو حقیقت میں بھی وجود رکھتا ہے اور آپ کی فکر میں بھی۔ اب جو جزیرہ آپ نے سوچ رکھا ہے وہ صرف آپ کی سوچ میں ہی وجود رکھتا ہے۔ چنانچہ فلسفہ کی دنیا میں حقیقی وجود اور ضروری وجود پر بڑی منطقی مباحث کا آغاز ہو گیا کہ اگر میں پہلے سے ہی خدا پر یقین رکھتا ہوں تو پھر صاف ظاہر ہے کہ میں اس سے بھی بڑی چیز پر ایمان نہ لا سکوں گا اور پھر میں یہ بھی مانوں گا کہ میرا خدا ہمیشہ سے موجود ہے اور اسے ہمیشہ سے ہونا چاہیے اور اگر وہ فی الحقیقت وجود رکھتا ہے تو پھر اس کا وجود بھی ضروی ہے لیکن ایک بڑا سوال یہ ہے کیا وہ واقعی وجود رکھتا ہے؟ لیکن یہ ایسا مضبوط سوال ہے جو فلسفہ اور سائنس کی دنیا میں ابھی تک لاینحل (Unsolved) ہے۔

خدا کے حق میں ایک اور مجموعہ دلائل ارض وسماء کی تخلیق کے حوالے سے دیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ اس طرح کے

سوالات اٹھائے جاتے ہیں کہ کائنات میں تبدیلی اور حرکت کا بنیادی سبب کیا ہے؟ کیا کائنات ازل سے ہے یا اس کا کوئی نقطہ آغاز بھی ہے؟ وہ یوں کیوں اور کس طرح سے ہے؟ ان سوالوں کو قیاس آرائی پر مبنی ان جوابات کے ساتھ محدود نہیں کیا جاسکتا جن سے یہ پہلے ہی فرض کرلیا گیا ہو یا مرضی ہی یہ ہو کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہے۔

افلاطون حرکت وتغیر کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز جس کو کسی دوسری چیز نے حرکت دی ہو، اسے تبدیلی کا نقطہ آغاز مان لیا جائے لیکن جب ایک خودحرکتی (Self Moved) نے دوسری چیز کو تبدیل کیا اور اس نے کسی دوسری کو اور پھر یوں ہی ایک کے بعد دوسری لاکھوں کروڑوں چیزیں متحرک ہوگئیں۔ چنانچہ ہمیں کہنا چاہیے کہ تمام حرکتوں کی اصلیت (Origin) دراصل ایک خودحرکتی چیز ہے اور یہی تبدیلی کا سب سے پرانا اور طاقت ور اصول ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی غیر حرکتی متحرک (Unmoved Mover) شے ہے جسے لوگ خدا کہتے ہیں لیکن افلاطون آگے بڑھتا ہے۔ اس کے مطابق خودحرکتی ایک بے مثال خصوصیت ہے۔ ہر زندہ چیز کے اندر ایک روح (سائیکی) ہوتی ہے جس کی تعریف ہی یہ ہے کہ ایک ایسی حرکت جو خود ہی حرکت کر سکے یعنی The Motion which can move چنانچہ افلاطون کے مطابق حرکتی قوت ہے، رہی ہے اور رہے گی۔ اس طرح سب اشیاء دیوتاؤں (gods) سے بھری ہوتی ہیں۔

ارسطو افلاطون سے اختلاف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حرکت ابدی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا آغاز ہے دوسری زندہ اشیاء فی الواقع حرکت کو خود شروع نہیں کرتیں بلکہ وہ اپنے ماحول اور اپنے اعضاء کی اندرونی ترتیب سے متحرک ہوتی ہیں اور تمام متحرک اشیاء اپنی حرکت کے لئے کسی ایسی مطلق کائناتی فورس کی محتاج ہیں جو خود حرکت نہیں کرتی اور وہ ابدی ہے۔ اور بلا بُعد بھی یعنی Dimensionless ہے۔ کیونکہ محدود محرک کسی چیز کو لامحدود حد تک حرکت نہیں دے سکتا اور ہر وہ چیز جو ایجاد کی حامل ہے اس کا حجم اور حرکت محدود ہوتے ہیں۔ ارسطو کے پیروکاروں نے یہ بھی دلیل دی کہ کوئی نہ کوئی سب سے بڑا مسبب الاسباب ضرور ہونا چاہیے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو درمیانی اسباب بھی نہ ہوتے۔ لہٰذا یہ عمل ابھی تک رک گیا ہوتا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ افلاطون خودحرکتی محرک (Self Move Mover) کا اور ارسطو کا غیر حرکتی محرک (Unmoved Mover) کا تصور پیش کرتا ہے۔ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ارسطو کا تصور خدا زیادہ مقبول ہوا کیونکہ عیسائیت کا تقاضا تھا کہ خدا ناقابل تغیر (Immutable) ہونا چاہیے۔ اسے ہمیشہ ایک جیسا رہنا چاہیے اور خود اس کا کوئی سبب نہ ہو۔ ان دلائل کے خلاف ایک عام اعتراض کیا گیا کہ کوئی کسی کو یہ تسلیم کرنے کے لئے مجبور نہیں کرسکتا کہ اس کائنات کو چلانے والی کوئی غیر متحرک قوت ہے اور اگر ایسا کوئی غیر متحرک محرک کے مفروضے کو نہیں مانتا تو اسے فاسق وکافر کیسے قرار دیا جاسکتا ہے اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان فزیکل تبدیلیوں کے سلسلے کی زنجیر کی ہر زیر تفتیش کڑی کے پیچھے بھی کوئی اور کڑی ہو۔ چنانچہ جب تک اشیاء کے پیچھے لامحدود سلسلوں کی سمجھ نہیں آجاتی۔ تبدیلی وتغیر کی کسی ''آخری وضاحت'' کے پیچھے ایک اور تبدیلی کا امکان ہے تو پھر یہ سوال ضرور پیدا ہوجاتا ہے کہ کسی فرض شدہ نقطہ آغاز Unmoved Mover کا کیا ہوگا۔ جب اس کی حرکت کے سبب کا سوال کیا جائے تو اسے لغو (Non Sense) قرار کیسے دیا جاسکتا ہے؟

ارسطو اور اس کے پیروکاروں نے نکتہ اٹھایا تھا کہ خدا محدود، صاحب اعجاز اور کائنات کے کسی گوشے میں قیام پذیر چیز نہیں ہے۔ وہ ایک دوسری طرح کے نظام کا وجود ہے جو ساری کائنات کو قائم و دائم رکھے ہوئے ہے جیسے آپ ٹینس کے کھیل کو چلا بھی رہے ہوتے ہیں اور خود کھیل بھی رہے ہوتے ہیں لیکن اس دلیل پر ہمیشہ سے اعتراض ہوتا رہا ہے۔ یہ اس مادی دنیا کے لئے ایسی مابعد الطبیعاتی (Metaphysics) وجود پیش کرتی ہے جو حقیقی حرکات سے شروع ہوتی ہے اور علتی تسلسل (Caused Sequences) سے پیدا ہوتی ہے، چنانچہ ارسطو کی دلیل ہمیں کبھی بھی کائنات سے پرے نہیں لے جاسکتی جہاں ہم اس کے اندرونی طریق عمل (Working) کا علم حاصل کر سکیں۔ ارسطو کا ایک پیش روسٹراتو (Strato) جو 269ء میں فوت ہو گیا تھا اس کی دلیل تھی کہ فطرت میں ظاہری طور پر کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ مزید برآں فطرت کی جو زیادہ تر خصوصیات منکشف ہوئی ہیں وہی اس دنیا کی آخری تشریح ہیں۔ تشریح اور وضاحت اس دنیا کے اندر ہے نہ کہ اس دنیا کے باہر۔ ارسطو کے نظریئے پر یہ اعتراض اس قدر بنیادی تھا کہ Bayle اور Hume نے اس کا نام ہی سٹرائی دہریت (Stratontian Atheism) رکھ دیا۔

خدا کے وجود کے ہونے کی ایک اور دلیل مسلمان مذہبی علماء اور فلاسفروں نے پیش کی جو ''کلام'' (Speach) کے نام سے مشہور ہے۔ مرکزی سوال یہ تھا کہ واقعات کا تسلسل لامحدود حد تک پیچھے کو جاتا ہے کہ نہیں۔ نظریہ کلام کے مطابق ایسا ہو نہیں سکتا۔ اس دنیا کا ایک معین (Definite) نقطہ آغاز ضرور ہے۔ کائنات عدم یعنی (Out of Nothing) سے وجود میں نہیں آئی۔ اس لئے خالق کائنات (خدا) ضرور موجود ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ ثابت کرنے کے لئے کونسی دلیل (Reason) پیش کی جائے کہ واقعات کا سلسلہ ماضی میں لامحدود حد تک نہیں لے جایا جاسکتا۔ چنانچہ اس کے لئے دلائل ایک عیسائی عالم (Philophonus) نے چھٹی صدی عیسوی میں اور مسلمان فلاسفر الکندی نے 870-800ء میں پیش کئے۔ اس تھیوری کے مطابق ''اگر کائنات ہمیشہ سے ہوتی تو اس خاکی زمین پر کسی بھی چیز کی پیدائش کے پیچھے لامحدود نسلوں کا سلسلہ ہوتا لیکن لامحدود دنیا میں سفر نہیں کیا جاسکتا اس لئے اگر کائنات ابدی ہے تو آج جو بھی چیز موجود ہے یہ کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔'' اس نظریئے سے یہ ثابت کرنا تھا کہ اس کائنات کو بنے ہوئے معین وقت گزرا ہے لیکن ایسا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حقیقی اور اجتمائی لامحدودیت یعنی Actual and Potential Infinites کے درمیان امتیاز بھی پیدا کرنا ہوگا۔ تو معلوم ہوگا کہ اگر اس ساری بحث کا نتیجہ یہ دکھا بھی دے کہ ماضی کے واقعات کی حقیقی لامحدودیت بے ربط اور بکھری ہوتی ہے تو پھر بھی ایسے خدا کا تصور ثابت نہیں ہوتا جس نے اس کائنات کی تخلیق کی ہو۔ یہ صرف یہی بتائے گا کہ کائنات غیر محدود حد تک پرانی نہیں ہے لیکن اس پر تو سائنس کی جدید بگ بینگ (Big Bang) کی تھیوری بھی اتفاق کرتی ہے لیکن اصلاً یہ کائنات کیسے شروع ہوئی یہ پھر بھی غیر متعین ہی رہے گا۔ چنانچہ عدم (From Nothing) سے بھی آغاز (Beginning) ویسے ہی ہوتا جیسے کہ ابتدا (Beginning) ہونی چاہیے۔

اس سے قطع نظر کہ کائنات ابدی ہے جیسا کہ ارسطو کا کہنا تھا یا کلام دلیل کے مطابق کسی خاص وقت میں شروع

ہوئی۔ ابن سینا نے (980,1037) نظریہ پیش کیا کہ کائنات عارضی چیزوں سے بنی ہوئی ہے یعنی وہ پیدا ہوتی ہیں اور مرجاتی ہیں۔ گویا ان کے لئے وجود رکھنا ضروری نہیں ہے۔ وہ کسی وقت وجود نہیں رکھتیں یا وجود نہیں رکھیں گی۔ لیکن ہر چیز ایسی نہیں ہوسکتی۔ ورنہ ماضی میں کبھی کوئی وقت رہا ہوگا جب کچھ بھی نہیں ہوگا اور جب کچھ نہیں ہوگا اور کچھ نہیں سے تو کچھ نہیں پیدا ہوسکتا تھا۔ للہذا ضرور کوئی ایسی ہستی تھی جو چیزوں کے پیدا ہونے کا سبب بنی۔ جن کا وجود میں ہونا کوئی ضروری نہیں تھا اور یہ ہستی ہی خدا ہے لیکن اس دلیل کے ساتھ بھی بہت سی مشکلات منسلک ہیں۔ اس دلیل کی مخالفت میں ھیوم کہتا ہے کہ ''فرض کیا ایک چیز بیس متحرک ذرات (Particles) کا مجموعہ ہے۔ میں آپ کو الگ الگ ہر ایک ذرے کی حرکت کا سبب بتا دیتا ہوں لیکن یہ بڑی غیر مناسب بات ہوگی کہ آپ مجھے پھر تمام ذرات کی حرکت کا سبب پوچھیں جب کہ ہر ایک کی حرکت کا سبب بتایا جاچکا ہے۔'' سوال یہ ہے کہ ہم کیوں اول اول کچھ نہیں تھا کی بجائے کچھ تھا کہنے پر مصر ہیں، مادے کے اندر موجود حرکت کا سبب اس سے پہلی والی حرکت ہے اور اس حرکت کا سبب اس سے پہلی والی حرکت، پھر اس کے پیچھے اور حرکت تھی جس نے اسے متحرک کیا۔ علی ہذا القیاس۔ یہ سلسلہ لامحدود حد تک جاتا جائے گا۔ چنانچہ ہم جتنا دور بھی چلے جائیں۔ دراصل ہم آگے نہیں بڑھتے کیونکہ پہلے والا سوال بدستور باقی رہے گا چنانچہ Principal of Sufficient Reason کے مطابق کوئی بھی امر واقعہ (Fact) اس وقت تک حقیقی نہیں ہوسکتا، یا کسی مقولہ کو سچا نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کے لئے کافی دلیل موجود نہ ہو۔ ایک ایسی کافی دلیل جسے مزید دلیل کی ضرورت نہ ہو، چنانچہ ایسی دلیل کو مادے سے باہر تلاش کیا جائے اور یہی چیزوں کی آخری دلیل۔ خدا کے اندر ہی ملتی ہے جو حرکات کے ان سلسلوں کو چلا رہا ہے۔ مذکورہ متاثر کن دلیل leibrunz نے پیش کی تھی لیکن مسئلہ پھر وہی تھا کہ یہی اصول خود خدا پر لاگو کیوں نہیں ہوتا۔ اس کا ممکنہ جواب یہی ہوسکتا ہے کہ وضاحتوں کے اصولوں کا تعلق مادی دنیا سے ہے لیکن اگر وضاحت کا یہ اصول صرف مادی دنیا سے ہی متعلق ہے تو پھر مادی دنیا کی وضاحتیں مادے کے اندر رہ کر ہی ہونی چاہئیں۔

خدا کے وجود کے حق میں انسانی فکر و خیال کی ایک اور قدیم ترین دلیل ڈیزائن دلیل (Design Argument) کے نام سے مشہور ہے جیسے Psalmist لکھتا ہے: ''جب میں آسمانوں کی طرف نگاہ اٹھاتا ہوں تو اے خدا مجھے تمہاری انگلیوں کی صناعی کا کمال نظر آتا ہے کہ تم نے کیسے چاند اور ستارے بنائے ہیں۔'' اسی طرح افلاطون نے کہا تھا۔'' آسماں کو دیکھنے کا مطلب دیوتاؤں کو دیکھنا ہے کہ جیسے ان کی بین دستکاری (Handiwork Evident) کو دیکھ لیا۔ تاریخ میں یہ دلیل پہلے 385 قبل از مسیح میں زینوفن (Xenophon) کے حوالے سے آتی ہے۔ جب اس نے جانداروں کے اندر اعضاء کو ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی مفید ترین حالت میں ملے ہونے کا مشاہدہ کیا تو اس نے سقراط سے آکر کہا کہ اس بہترین تنظیم و ترتیب کو دیکھ کر اشارہ ملتا ہے کہ انہیں بڑی سوچ سمجھ کے ساتھ ڈیزائن کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیا تم شک کرسکتے ہو کہ یہ محض اتفاقیہ ہوا ہے یا یہ بنایا گیا ہے؟ اس طرح اس نے جانداروں کے جنسی اختلاط کے عمل میں گھل مل جانے کی ایسی مناسب ترتیب دیکھی جس سے ان کی افزائش نسل یقینی بن سکے۔ تو زینوفین اس نتیجہ پر پہنچا: ''بے شک یہ اس کی حکمت و تدبر کی دلیل ہے جس نے جانداروں کو باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے سے پیدا کیا ہوا ہے۔'' اس سلسلے کی ایک اور اہم دلیل سسرو (Cicero)

کے حوالے سے ملتی ہے۔اس نے بھی زمین و آسمان میں موجود اشیاء کی باقاعدہ حرکات کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا۔''یہ دنیا کسی مستحکم (Fixed) اور مقرر کردہ یکساں (uniform) نظام کے تحت چل رہی ہے۔ مذکورہ فطری استدلال ہمیں کسی معمار اور ایسے حاکم اعلیٰ کی طرف لے جاتا ہے جو اتنے بڑے طاقت ور ڈھانچے کو چلا رہا ہے۔'' لیکن اس دلیل کے بارے ہیوم کا کہنا ہے کہ یہ دلیل کسی نہ کسی طرح خود انسان کے اپنے روز مرہ عمل کے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کائنات کو بنانے والی اور چلانے والی کوئی ذہین ہستی ضرور ہے۔انسان چونکہ خود ذہین اور تدبیر و حکمت کی صلاحیت رکھنے والا ہے اسلئے وہ خدا کو بھی اپنی طرح ذہین اور تدبیر و حکمت کا مالک خیال کرتا ہے۔ذہین خالق کا تصور خود انسان کا اپنا ہی پرتو ہے۔ذہین خالق کا تصور انسان کے ذہن میں اس لئے آیا کہ اس نے دیکھا کہ وہ خود چیزوں کو کسی مقصد اور باقاعدہ حکمت سے بناتا ہے۔اسطرح اس دنیا کو بنانے والی ضرور ذہین ہستی ہوگی، جس نے کائنات کی ہر چیز کو مقصد کے مطابق یونہی تراش خراش کر ڈیزائن کیا ہوگا جیسا انسان خود کرتا ہے۔اس دلیل کے مقابل Acquinas لکھتا ہے''ہم دیکھتے ہیں کہ فطری اشیاء کسی نہ کسی اختتامی مقصد کی طرف جاتی نظر آتی ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ جس چیز کو کوئی علم نہ ہو، وہ اپنے کسی انجام کی طرف حرکت بھی نہیں کر سکتی جب تک کہ اسے کوئی ذہین اور علم رکھنے والی ہستی ضرور ہے جس نے ان سب فطری اشیاء کو اپنے اپنے انجام کی طرف جانے کی ہدایت کر رکھی اور اسی ہستی کو خدا کہا جاتا ہے۔'' Acquinas یہ سب کچھ اس مفروضے کے پیش نظر کر رہا تھا کہ سب قدرتی اشیاء اور عمل (Process) کسی طے شدہ انجام کی طرف حرکت کرتے ہیں۔اسی طرح دانتے اپنی کتاب (Divine Comedy) میں لکھتا ہے۔''کوئی بھی چیز دیکھ لیجئے اس میں ایک مربوط نظم دکھائی دیتا ہے اور یہی صفت اس کائنات کو خدا کے مشابہ کر دیتی ہے۔اس لئے میں کہوں گا کہ ہر چیز بالآخر اپنے اصل منبع (Source) کی طرف جھکی ہوئی ہے۔جہاں وہ ہستی کے بحر بے کراں کے اپنے اپنے حصوں میں حرکت رہی ہے جہاں اسے اپنی اپنی جبلت کے مطابق ہی چلنا ہے جو اسے دے دی گئی۔'' اسی طرح کے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے جے ایس مل (J.S. Mill) اپنی کتاب ''مذہب پر تین مضامین'' (Three Essays on Religion) نامی کتاب میں لکھتا ہے(جو 1873ء کو شائع ہوئی۔)''کسی ذہین دماغ کی کسی مقصد کی خاطر بنائی ہوئی اشیاء کی خصوصیات میں کچھ خاص ذاتی خوبیاں ہوتی ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت کا سارا نظام یا اس کا قابل غور حصہ بڑی حد تک ان خوبیوں کی نمائش کرتا نظر آتا ہے۔لہٰذا ہم حق بجانب ہوں گے اگر ہم کائنات کے اندر دکھائی دینے والی عظیم یکسانیت کو کسی علت سے منتج کریں (Similiarity in the Cause Infer) لیکن مندرجہ بالا بظاہر متاثر کن دلائل میں مشکل یہ ہے سکہ جب ''مخصوص خوبیوں'' کو با مقصد حکمت یا کسی مقصد کو پورا کرنے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے تو یہ ساری کی ساری دلیل نہایت کمزور اور قابل اعتراض (Vulnerable) ہو جاتی ہے۔کائنات میں کسی ''مقصدیت'' کے نظریئے کو سب سے پہلے ہیوم نے اور پھر ڈارون 1859ء نے Natural Selection کی تھیوری پیش کر کے رد کر دیا۔ان کا کہنا تھا جن مقاصد کو ہم کسی مقصد کا حصول بتا رہے ہیں۔ہوسکتا ہے وہ صرف وہ حالات میں ہوں کہ جن کے بغیر خود اس مقصد کا ہی کوئی وجود نہ ہوسکتا ہو۔مثال کے طور پر مذہبی نقطہ نظر کے مطابق ہم کہیں گے۔ہماری فضا میں Ozone Layer جو

ہے۔ اسے بڑی نزاکت، خوبی اور حکمت کے ساتھ ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے اس ذہین ہستی (خدا) کا مقصد ہو کہ زندگی کو سورج کی تباہ کن شعاعوں سے بچایا جائے لیکن مساویانہ طور پر Ozone Layer کو یوں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ خود ایک ایسے فطری پروسیس کا نتیجہ ہے جو خود اس حالت میں واقع ہوا ہے جس میں اگر زندگی نہ ہوتی تو وہ پروسیس بھی نہ ہوتا......! مزید براں کائنات میں جو فطری پروسیس دکھائی دیتے ہیں خود ان کے وجود کی وضاحت بھی باقی رہ جاتی ہے۔ دوسرے انسانی ذہانت جو مشین بناتی ہے وہ مادی اور فطری قوانین (Physical Laws) کے مطابق ہوتے ہیں۔ انسان فطرت کے ہی اصولوں کو استعمال کرتا ہے جب کہ فطرت کا نظام بذات خود ہی فطری قوانین پر مشتمل ہے۔ چنانچہ فطری قوانین کا استعمال اور چیز ہے جب کہ فطری قوانین کی تخلیق (Creation of Physical Laws) دوسری چیز ہے۔ فطرت کے اندر جو بھی نظام ہے اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے، وہ فطرت کا الگ سے حصہ نہیں ہے بلکہ یہ ایسی ہی ہے جیسی کہ ہے۔ It is What Exists ہیوم کا کہنا ہے کہ فطرت کے اندر جو ابدی اور خلقی (Inherent) نظم پایا جاتا ہے وہ حیران کن نہیں ہے اور نہ ہی بعید از قیاس متبادل ہے۔ اس انتشار (Chaos) کا جو شاید کبھی رہ چکا ہے۔ یہ وضاحت کرنے کے لئے دنیا اتنی منظّم کیوں ہے اور انتشار (Chaos) پر مبنی کیوں نہیں ہے؟ اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کسی زمینی ہستی کے مفروضے کو ہی پیش کیا جائے جب کہ آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کائنات میں صرف نظم ہی نہیں، بدنظمی (Chaos) بھی موجود ہے، چنانچہ یہ کہنا کہ کائنات کو ڈیزائن کرنے والی کوئی نہ کوئی ہستی ہے تو پھر اس سے اور بھی سوال اٹھ کھڑے ہوں گے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں ایک سے زیادہ معمار (Designer) ملوث ہوں۔ جیسا کہ انسانی دنیا میں زیادہ تر ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے ڈیزائنر فوت ہو چکا ہو یا اسے اس کائنات سے مزید کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ اسے اپنی مخلوق یا انسان کی کوئی پرواہی نہ ہو۔ اس نے خود کو غیر جانبدار اور بے نیاز کر لیا ہو۔

Direct Experience of the Divine

اب ہم ان دلائل پر گفتگو کریں گے جن کا تعلق بقول ارسطو کے ان ''روحانی واقعات'' اور ''واردات قلبی'' کے دعوؤں سے ہے جو فہم و عقل کو چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ جن میں ذاتی دعوؤں کے مطابق کچھ لوگ خدا کے ساتھ براہ راست کسی طرح ربط کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ بظاہر ایسے تجربات سے بہت سے انسان گزرے ہیں۔ لیکن اس میں مصیبت یہ ہے کہ یہ مکمل طور پر ذاتی (Private) نوعیت کا تجربہ ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا۔ دعوے کے مطابق خدا کے ساتھ ایسی ملاقاتیں (جنہیں بے شک محسوس کیا جاسکتا ہے) بصری، سمعی یا صرف شدید احساس کی صورت میں ہوتی ہیں۔ جس میں ایسے لگتا ہے کہ کسی مافوق البشر شخصیت میں انسان گم ہو رہا ہے۔ اس طرح کے تجربات کے دعوے دنیا کی ہر ثقافت اور تہذیب میں ملتے ہیں۔ قدیم ثقافتوں میں اس طرح کے دعوے اس قدر عام تھے کہ اسے کوئی قابل ذکر بھی نہیں سمجھتا تھا۔ رومن عیسائیت نے اس طرح کے دعوؤں کو قدرے تامل کے بعد قبول کیا کیونکہ ایسے دعوے مسلمہ عقائد کے خلاف بڑے موثر بھی

ثابت ہو سکتے ہیں۔

دور عقل (The Age of Reason) کے دوران اس طرح کے شخصی اور ذاتی نوعیت کے دعوؤں کو بڑے ہی شک سے دیکھا گیا لیکن جب ہیوم اور کانٹ نے اس طرح مذہبی دعوؤں کو خوب نقصان پہنچایا اور تمام مذہبی عقائد کو عقل کی کسوٹی کے ساتھ مشروط کیا تو اکابرین مذاہب نے خاص طور پر پروٹسٹنٹ میں یہ رجحان بڑھ گیا کہ وہ اس طرح کے تجربوں کو خدا کے وجود کے ثبوت کے طور پر پیش کریں۔ خدا سے ملنے کا سوال ایسا نہیں ہے کہ آپ کسی عام شخص سے مل رہے ہیں یا کسی چیز سے واقف ہو رہے ہیں کیونکہ وہ شخص اور چیز دوسرے کے لئے بھی قابل رسائی ہوتے ہیں لیکن خدائی ملاقات کے دعوے میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح کے تجربات کی اہمیت کیا ہے۔ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں یا تو کوئی سچ مچ کی خدائی ہستی ہے جو خود مختار اور الگ وجود رکھتی ہے۔ جس نے متعلقہ شخص کو عنایت ملاقات سے نوازا ہے یا پھر اس دعوے کی کوئی حقیقت نہیں سوائے اس کے کہ وہ شخص جو اس تجربے سے گزرنے کا دعویٰ کر رہا ہے وہ اپنی ثقافتی، ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی حالت کی ہی چغلی کھا رہا ہے۔ اس طرح کے تجربے میں خواب جیسی کیفیت زیادہ نظر آتی ہے بجائے اس کے کہ سچ مچ کسی غیر مرئی لیکن الگ سے وجود رکھنے والی ہستی سے ملاقات ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ تجربہ جیسے ہوتا ہے اور جس طرح اسے بیان کیا جاتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ فاعل (Subject) اپنے ذہن میں پہلے سے ہی کسی ایسی ہستی سے ملاقات کی خواہش یا توقع رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ رومن کیتھولک مذہب پر ایمان رکھنے والے کو مقدس کنواری مریم ہی نظر آئے گی نہ کہ کوئی یونانی دیوتا۔ چنانچہ اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ وہ وقت، دور اور حالات کیا ہیں جب کوئی شخص ایسے تجربے کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ کس کی اور کس طرح کی عبادت میں روحانی تصادم اور جذباتی بحران سے گزر رہا ہے کیونکہ ایسے حالات ہی اس مبہم اور مختلف النوع ہستی سے ملاقات کا سبب بنتے ہیں۔ ولیم جیمز (William James) اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس سے ایک ہی چیز صاف صاف ثابت ہوتی ہے کہ ہم کسی ایسی ذات سے ملاقات (Union) کے تجربے سے گزر سکتے ہیں جو ہمارے خیال میں ہم سے بہت بڑی ہے اور اس (Union) میں ہم عظیم ترین سکون حاصل کرتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم پہلے سے ہی مذہب کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ ایسی ملاقاتوں کے امکان کا ذکر بھی موجود ہے کہ جس کی آپ پرستش کرتے ہیں وہ خود کو منکشف بھی کرتا ہے تو پھر آپ کی اس کے ساتھ ملاقات ہو سکتی ہے لیکن اگر یہ بنیادی شرائط موجود نہ ہوں تو اس طرح کا تجربہ ہی مکمل ابہام بن جائے گا۔

اخلاقی اور دوسرے دلائل

اکثر کہا جاتا ہے کہ اخلاقیات کا سوال بھی کسی نہ کسی طرح خدا کی ہستی کے وجود کے ساتھ جڑا ہوا ہے یعنی اخلاقی لحاظ سے ضروری ہے کہ خدا کے وجود کو فرض کر لیا جائے۔ کانٹ کہتا ہے کہ اگر کوئی نیک کام کرتا ہے تو نیکی کے نتیجہ میں اسے مسرت بھی ملنی چاہیے اور فضیلت بھی۔ جب کہ اس زندگی میں ضروری نہیں کہ نیکی اور فضیلت و مسرت ساتھ ساتھ چلیں بلکہ بسا اوقات نیکی

کے بدلے الٹا نقصان بھی ہوسکتا ہے لیکن یہاں پر یہ سوال اٹھا کہ کیا واقعی انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ نیکی کا بدلہ چاہے؟ کیا وہ نیک کام کو صرف نیک کام ہی سمجھ کر نہیں کر سکتا؟ کیا اس کے لئے ضرور کوئی جذبہ محرکہ ہونا چاہیے؟ اس دلیل پر دوسرا اعتراض یہ ہوا کہ جسے ہم اپنا منتہا و مقصود بناتے ہیں ضروری تو نہیں کہ وہ ممکن بھی ہو جائے۔ کسی مکمل باغ کی تعمیر کے لئے مکمل کوششوں سے ضروری تو نہیں کہ سچ مچ کا مکمل ترین باغ ہی ہوگا۔ اخلاقیات کی دلیل پیش کرنے والے زور دیتے ہیں کہ احکامات اور قوانین خدا جیسی ہستی سے ہی آسکتے ہیں لیکن انہیں پھر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اخلاقی قوانین آسمان سے اترے ہوئے احکامات ہیں، انسانی روایات نہیں......! دوسری دلیل یہ کہتی ہے کہ خدا اخلاقی قوانین کو ناگزیر اتھارٹی دیتا ہے لیکن ایسی اتھارٹی باہر سے نہیں آنی چاہیے۔ اتھارٹی تو لوگوں کی اکثریت کے اتفاق کرنے سے ہے کہ فلاں قانون پر ضرور چلنا ہے خواہ اس کی کوئی بھی وجہ ہو۔

اس سلسلے کی ایک اور دلیل ضمیر کی آواز سے منسوب ہے۔ یہ دلیل جوزف ٹیلر نے (1672/1752ء) پیش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان کے اندر کوئی ایسی طاقت ور، ذہین، خارجی اور ہر آن نگرانی کرنے والی ہستی ہے جس کو ہم محسوس کرتے ہیں اور ضمیر کی یہی آواز خدا کے ہونے کی دلیل ہے لیکن اس پر جو عام اعتراض اٹھایا جاتا ہے وہ اس دلیل کے آنے سے پہلے ہی جان لاک نے 1704-1632ء میں دے دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اخلاقی قوانین ضمیر سے پیدا نہیں ہو سکتے کیونکہ مختلف انفرادی ضمیروں سے متضاد قسم کے اخلاقی قوانین پیدا ہو سکتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تعلیم، صحبت اور اپنے اپنے ملکی اور سماجی رسم و رواج اور دیگر معاشرتی روایات ضمیر کو متعین کرتے ہیں۔ J.L. Machine اس بات کو آگے بڑھاتا ہے کہ یہ تو بڑی ہی خود فریبانہ بات ہوگی اگر یہ مان لیا جائے کہ کسی ایک کا ضمیر جو کہہ رہا ہے اس کے ساتھ دوسرے سب یکتائی محسوس کریں اور ضمیر کی آواز انہیں جہاں لے جائے، ادھر ہی بہہ جائیں......

خدا کے ہونے کی ایک اور دلیل معیار اور کاملیت کے بلند تر درجے سے متعلق ہے کہ کوئی چیز ایسی ہونی چاہیے جو کسی بھی بلند تر درجے کی مثال ہو اور اس کا شائبہ کم تر درجوں میں بھی پایا جائے۔ چنانچہ کاملیت (Perfection) کا مرکز خدا ہے لیکن اس دلیل کا جواب دیا گیا کہ کسی پیمانے اور اسکیل پر سب سے اونچے درجے کو سب سے بڑی صفت (Quality) قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ جم اگر جیک سے زیادہ نشے میں ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کسی دوسرے کو بھی جتنا زیادہ ممکن ہو نشے میں دھت (Drunk) ہو جانا چاہیے۔

خدا کے وجود کے ثبوت کے طور پر معجزوں کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس پر بھی بڑی وسیع فلسفیانہ بحث ہوئی۔ اولاً سوال تو یہی ہوگا کہ معجزے کی تعریف کے مطابق واقعی معجزہ کبھی واقع ہوا بھی ہے یا نہیں اور اگر ہوا ہے تو ہم کس طرح امتیاز کریں گے کہ ہمارا علم ابھی اس فطرت کے بارے نامکمل ہے یا یہ کوئی خدائی مداخلت ہوئی ہے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ تمام مذاہب خواہ وہ الہامی ہوں یا اصنام پرست معجزاتی دعوؤں سے یکساں بھرے پڑے ہیں۔

خدا کے وجود کے حق میں لاک شعور کی دلیل پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مادہ بذات خود سوچ نہیں سکتا۔ ہمارے لئے بیان کرنا مشکل ہے۔ مادی ڈھانچہ کیسے شعور رکھتا ہے لیکن ہیوم اس کے مقابل استدلال پیش کرتا ہے کہ دماغ مادے کی

پیچیدہ ترین شکل کا نام ہے اور شعور اس کے اندر خاص قسم کے ارتعاش (Irritation) سے پیدا ہوتا ہے۔ مادے کے اندر شعور کی صفت ارتقاء کے عمل سے پیدا ہوئی۔ اسے کسی ماورائی طاقت کی پیدائش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ برکلے دلیل پیش کرتا ہے، کسی چیز کا وجود اس کے ادراک میں آنے سے وابستہ ہے چونکہ ایسا بھی نہیں کہ چیزیں اس وقت وجود میں آئیں جب ہم ان کا ادراک کریں لہٰذا کوئی ایسا قوائے فہم (Mind) موجود ہے جو سب اشیاء کی ہمیش خبر رکھے (All Perceiving and Ever Perceiving) ہیوم نے برکلے کی دلیل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نتیجے کے لئے پہلے مابعد الطبیعات کا قائل ہونا پڑے گا جو بہت سے لوگوں کے لئے کم ہی قابل یقین ہے۔

دہریت 'Atheism'

انکار خدا کے دلائل

دہریت سے مراد خدا کے تصور کو مسترد کرنا ہے۔ انکار خدا کو دو طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- کسی ایسی طاقت کے وجود سے انکار کرنا جسے خدا کا نام دیا جائے اور کسی بھی ثقافت کے اندر خدا یا دیوتاؤں کے مروجہ عقیدے کو مسترد کرنا۔

2- اس قسم میں خدا کو یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا عملی طور پر اسے مسترد کر دیا جاتا ہے۔ دہریت اور الحاد کے الفاظ عام طور پر بحث مباحثوں میں خدا کے بارے دلائل اور الزامات کے تبادلے میں استعمال ہوتے ہیں لیکن اس اصطلاح کے ابہام کی حالت یہ ہے کہ سترھویں صدی کے فلاسفر سپنوزا (Spinoza) کو ایک ہی وقت میں ایک ایسا شخص کہا جاتا جسے خدا کا نشہ ہوا ہو اور دوسری طرف اسے دہریہ بھی قرار دیا جاتا تھا۔

قدیم زمانے میں ملحدیت ایک واضح نظریئے کے طور پر موجود نہیں تھی کیونکہ اس کے مقابلے میں الوہیت (Divinity) کا بھی کوئی واضح نقطہ نظر موجود نہ تھا۔ یعنی خدا کا تصور خود ہمیشہ سے نہیں ہے یا کم از کم ایسا نہیں تھا جیسا آج ہے لیکن قدیم مذاہب میں ملحدانہ اور نیم ملحدانہ اظہاریئے عام ملتے ہیں۔

کنفیوشس ازم اور تاؤازم کو کبھی کبھی ایسے مذاہب قرار دیا جاتا رہا ہے جو منکر خدا کے زمرے میں آتے ہوں جب کہ دوسری طرف چین کے مقبول عام مذہب میں دیوتا اور روحوں کو مانا جاتا رہا ہے۔ بدھ مت کو بھی اپنی اصل میں ملحدانہ نظام الافکار و عقائد مانا جاتا ہے۔ اگرچہ بعد میں بدھ ازم کی ایک شاخ Mahayana نے خدا کے وجود کی تصدیق کر دی۔ قدیم یونان میں سقراط پر دیگر الزاموں کے علاوہ منکر خدا ہونے کا الزام بھی لگایا گیا تھا لیکن مقدمے کی کارروائی کے دوران سقراط غصے سے ججوں پر یہ کہہ کر چلایا ''سن لو میں تمہاری بجائے خدا کی اطاعت کروں گا۔''

جوہر پرست (Atomists) ڈیمو کریٹس اور اپی کیورین نے اگرچہ آسمانوں پر دیوتاؤں کے وجود کے ہونے پر تو اعتراض نہ کیا البتہ انہوں نے دنیا کا ایسا مادی نظریہ پیش کیا جس پر دیوتاؤں کا کوئی اثر رسوخ نہیں تھا۔ چنانچہ اپی گیورین (Epicureans) کو اسی بنیاد پر ملحد کہا گیا کہ وہ دیوتاؤں یا روحوں کو غیر فعال اور انسانوں کی دنیا سے بے نیاز سمجھتے تھے۔ یہی

وہ نکتہ تھا جس نے افلاطون کو بہت بے چین رکھا کہ دیوتا (خدا) اس دنیا کو بنانے والا تو ہوسکتا ہے لیکن کیا اس کا انسان کے ساتھ کوئی تعلق بھی ہے۔ افلاطون کہا کرتا تھا کہ جب کوئی سوچے سمجھے گناہ کرتا ہے تو یہ فرض کر لینا چاہیے کہ وہ

1- یا تو دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتا۔

2- یا دیوتاؤں کا انسان کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔

3- یا دیوتاؤں کو آسانی سے قربانیاں اور پرستش کی رسوم ادا کر کے خوش کر لیا جائے گا۔

4- یا انہیں ان کے مقاصد سے ہٹا دیا جائے گا۔

تاریخ میں الحاد کا آغاز شر کے مسئلے (Problem of Evil) سے اٹھا۔ یعنی دنیا میں پائی جانے والی برائی، ظلم اور ناانصافی کا وجود دیوتاؤں (خدا) کے تمام اثر ورسوخ کے باوجود کیونکر ہے چنانچہ کچھ مفکر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس دنیا کو بنانے والی کوئی مادے سے ماوراء ہستی تو ہوسکتی ہے لیکن اس کا انسانی دنیا میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ سے پیدا ہونے والے مذاہب کے سامنے یہ سوال اور بھی شدت سے آیا کیونکہ توحید پرست مذاہب خدا کو اس کائنات کا خالق بھی مانتے ہیں اور شخصی خدا (Personal God) بھی۔ ان دونوں کرداروں کا یکجا ہونا مذہبی علماء کی ذہانت اور دلائل کو فریب نظر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایک طرف خدا لامحدود (Infinte) ہوا ہے تو دوسری طرف شخصی خدا دعاؤں، پوجا پاٹ اور قربانیوں وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے۔ ایسے عقیدے کے مطابق خدا ایک روح ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ مکمل طور پر اچھائی کا نمونہ ہے۔ اس سے کوئی زیادتی اور ظلم سرزد نہیں ہوتا لیکن خیر محض کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر اس کے پاس طاقت ہے تو وہ لوگوں کو ظلم زیادتی کا شکار ہونے سے بچائے تا کہ لوگ دکھوں اور تکلیفوں میں نہ پڑیں لیکن یہ سب کچھ اس کی مکمل قدرت اور مطلق بادشاہت کے اندر واقع ہو رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اوقات ظالم خوب پھلتا پھولتا ہے اور نیک لوگ مصائب میں زندگی گزارتے ہیں۔ ھیوم اس سوال کو بڑی جامعیت سے اٹھاتا ہے کہ کیا خدا برائی کو روکنے کے لئے راضی ہے لیکن روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اگر ایسا ہے تو پھر وہ بے بس ہے لیکن اگر وہ بے بس نہیں ہے تو پھر وہ چاہتا نہیں ہے تو کیا اسے پھر بدی کا خواہاں خیال کیا جائے اور اگر وہ بدی کو روکنا چاہتا بھی ہے اور روکنے کی قوت بھی رکھتا ہے تو پھر بدی کدھر سے آتی ہے۔ خدا کی اچھائی کی صفت کو دنیا کے کھلم کھلا حقائق کے ساتھ ہم آہنگ (Reconcile) کرنے کی بہت سی معذرت خواہانہ کوششیں کی گئیں لیکن اگر غیر متعصب نظر سے اس دنیا میں رونما ہونے والے انسانی واقعات کو دیکھتے ہیں تو پھر اس نتیجے پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہاں کوئی ہستی قادر مطلق (All Powerful) ہونے کے ساتھ خیر محض بھی ہے اور انسانی زندگی کے ساتھ خصوصی دلچسپی بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ مفکرین کا ایک گروہ یہ کہہ اٹھا کہ اس دنیا میں بدی اور ظلم جس قدر عام ہے، وہ ایک ایسے خدا کے وجود کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ لازمی طور پر ملحدیت کی طرف چلے گئے لیکن ھیوم نے یہاں ایک اور سوال اٹھایا کہ خدا کو کیا خیر محض کہنا صحیح ہے۔ خود ھیوم کے الفاظ میں کہ خدا کو اچھائی کے مقابلے میں برائی سے بھی اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی سردی کے مقابلے میں گرمی سے۔

ملحدین کی دوسری دلیل اس مشکل صورت حال سے ماخوذ ہے۔ جس میں یہ بھی مانا جاتا ہے کہ خدا کا کوئی جسم نہیں اور پھر بھی وہ ہر جگہ موجود ہے۔ Sextus سے یہ دلیل وابستہ ہے کہ لامحدود (Infinite) خدا اور زندہ خدا میں عدم مطابقت پائی جاتی ہے کیونکہ تنقیدی فلسفیانہ مباحثہ سے ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ عقل سلیم (Common Sense) بھی یہی کہتی ہے کہ ہم کسی ایسی ہستی کو نہیں سمجھ سکتے جو پیار بھی کرتی ہے، معاف بھی کرتی ہے، حکم بھی دیتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کا کوئی محل وقوع اور جسم نہیں ہے۔ اسی سے متوازی فلسفیانہ دلیل نکلتی ہے کہ ''شخصی'' ہونے کے لئے کچھ خصوصیات درکار ہوتی ہیں مثلاً دوسری اشیاء اور افراد کے حوالے سے احساسات اور افکار کو کوئی معینہ مقام ہونا، ایک جسم ہونا جس سے وہ ہستی، وہ سرگرمیاں انجام دے سکے جو اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔ جب کہ مذہبی نقطہ نظر کے مطابق خدا بغیر کسی جسم کے (Bodyless) ہے۔ جو ہستی کے تصور کو کالعدم کر دیتی ہے جب کہ خدا سے منسوب سب کی سب سرگرمیاں جسم و جان سے متعلقہ ہیں۔ چنانچہ فلاسفی اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ اگر بن جسم کا خدا بے جوڑ اور بے ربط (Incoherent) ثابت ہو جائے گا تو پھر خدا کے نام پر تمام عقائد کے خلاف فیصلہ کن اعتراض مسلم (Established) ہو جائے گا۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ خدا کے وجود کے حق میں دلائل خواہ کتنے ہی پر نقائص کیوں نہ ہوں، وہ مجموعی طور پر خدا کے ہونے کے کچھ نہ کچھ امکانات ضرور فراہم کرتے ہیں لیکن اس پر انٹونی فلیو (Antony Flew) بڑے زوردار طریقے سے کہتا ہے۔

"An Accumlation of Failed Proofs Proves Nothing."

یعنی ناکام ثبوتوں کے ڈھیر بھی کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔ ناقص ثبوت اہلیت ہی نہیں رکھتا کہ اسے کچھ ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ ناکافی ثبوتوں کو جو لوگ قبول کرتے ہیں شاید ان سے خود ان کی اپنی کمزوریوں پر پردہ پڑتا ہو کیونکہ اگر سوراخوں والی ایک بالٹی میں پانی نہیں رہ سکتا تو کوئی وجہ نہیں یہ یقین کرنے کی کہ ایسی ہی دس دوسری بالٹیوں میں پانی رہ جائے گا۔ جدید سائنسی نظریات کے سامنے آنے سے خدا کے ہونے کے دلائل جتنے کمزور امکانات میں بدلتے جاتے ہیں، اتنا ہی زیادہ ایمان کے بارے یہ سوال بڑھتا جاتا ہے کہ عقیدے کی بنیاد ایمان ہو، یا عقل۔ خدا پر صرف عقیدے کی بنیاد پر ہی ایمان رکھا جا سکتا ہے کیونکہ خدا کے وجود کے حق میں اگر عقلی دلائل پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی تو پھر جوابی عقلی دلائل کا سامنا مشکل ہو جانے کے واضح امکانات ہیں۔

بائبل میں اگرچہ ملحدیت کے نظریئے کی کوئی باقاعدہ شہادت نہیں ملتی۔ البتہ ایک جگہ ایک کردار کے منہ سے ''کوئی خدا نہیں ہے'' (There is No God.) کا کلمہ کہلوایا ہوا ملتا ہے۔ بعض لوگ اس کا ترجمہ (God is Not Here) ''یہاں خدا نہیں ہے'' کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رومن شہنشاہیت کے زمانے میں عیسائیوں کو اکثر ''کافر'' کہا جاتا تھا کیونکہ وہ شاہی مذہب کے دیوتاؤں سے انکار کرتے تھے۔ دہریت ہمیں منظّم اور باتفصیل شکل میں جدید مغرب میں ملتی ہے جو کہ کٹر مذہب پرستی کے خلاف احتجاج کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ جدید دہریت کو عقلی اور رومانی دہریت میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

عقلی دہریت (Rationalistic Atheism)

عقلی دہریت اس جدید اعتماد سے پیدا ہوئی کہ اب سائنسی علم اس دنیا کے بارے وہ تمام وضاحتیں پیش کرسکتا ہے جس سے مذہب کے توہم پرستانہ تصورات متروک ہو سکتے ہیں۔ اس تحریک کے افکار کی ابتداء مغرب کے رینے سانس (احیائے فکر کا دور) میں ملتی ہے جس کے بعد یہ کافی عرصہ تک غیر معروف رہی، پھر اس تحریک کو عروج 18 ویں صدی کی روشن خیالی کے زمانے میں حاصل ہوا۔ جب اس نے ایک عظیم لہر کی شکل اختیار کرلی۔ فرانسیسی فلاسفروں میں بہت سے مشہور، بے باک اور بے لاگ فلاسفر ایسے تھے جو تصور خدا کو نہیں مانتے تھے۔ سکاٹ لینڈ کا ایک ارتیابی فلاسفر (خدا کے وجود پر شک کرنے والا) ڈیوڈ ھیوم (David Hume) نے اک دفعہ پیرس میں اپنے میزبان دانش ور دوست Holbach's Barond کو کہنے لگا "یار! مجھے کسی حقیقی ملحد سے ابھی تک ملنے کا موقع نہیں ملا۔" Holbach's نے جواب دیا۔ "جناب یہ جان کر آپ کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا کہ آج شام ایسے سترہ لوگوں کے ساتھ آپ کھانا کھانے جارہے ہیں۔" اس مثال سے اس وقت یورپ کے فکری موڈ کا پتہ چلتا ہے کہ وہاں عقل پرستی کی لہر کس قدر تیز ہوچکی تھی۔

رومانی دہریت (Romantic Atheism)

رومانی دہریت اخلاقی بنیادوں پر خدا کے خلاف ایک ریڈیکل احتجاج کے طور پر 19 ویں صدی میں ابھر کر سامنے آئی۔ خدا کے خلاف شکایات سے ان رومانیت پسند دہریوں کی تحریروں سے مغربی یورپ کا ادب بھرا پڑا ملتا ہے۔
Dostoyevsky's Ivan Karanmizov خدا کی اخلاقی بنیادوں پر نفی کرتے ہوئے سوال اٹھاتا ہے کہ اگر خدا کا تصور نہیں رہے گا تو کیا ہر چیز کی اجازت ہو جائے گی؟ اسی اثناء میں فلاسفر Ludwig Feverbach عقلی اور رومانی دونوں قسم کی دہریت کو یکجا کر چکا تھا۔ اس کی رومانیت اس کوشش میں تھی کہ علم الہیات (Theology) کو علم الانسانیت (Anthropolgy) میں تبدیل کردیا جائے تاکہ مذہبیات پر اس کے انسانی ساختہ ہونے کی مہر ثبت کی جاسکے۔ اس کی عقل پسندی فطری مادیت (Naturalistic Materialism) کی پیداوار تھی جس کے مطابق خدا کا تصور انسان کے اپنے ہی دماغ سے نکلا ہوا ہے اور پھر اسی تھیم (مرکزی خیال) کو سگمنڈ فرائڈ نے نفسیاتی اصطلاح میں ترقی دی۔ فیورباخ کا سب سے بڑا وارث کارل مارکس تھا جس کے الحاد کی بہت سی جڑیں تھیں۔ ایک طرف وہ رومانی انسان پرست یعنی Humanist تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ انسان کی حمایت میں خدا شکنی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ مذہب کو استحصالی طبقات کا دم چھلا دیکھ کر اسے محنت کش عوام کے لئے افیون قرار دیتا ہے کیونکہ مذہب حالت موجود (Status Que) کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور غریبوں کو انصاف دینے کی بجائے اسی دنیا میں عدل کے متبادل کے طور پر انہیں جنت ملنے کی تسلی میں چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف کارل مارکس عقل پرست بھی تھا اور سائنسی مادیت کی بنیاد پر بھی خدا کے وجود کی نفی کرتا ہے۔

دہریت کو نٹشے (Freidrick Naetzsche) کی شکل میں پھر ایک ابھار میسر آیا جب اس نے اپنی پر اسرار تحریروں سے ''پاگل آدمی'' سے کہلوایا کہ

"God is Dead, god Remain Dead and We have Killed Him."

نٹشے کے نزدیک قتل خدا ایک عظیم الشان کام تھا جس کے لئے انسان صرف یونہی کفارہ ادا کر سکتے ہیں کہ وہ دیوتا بن جائیں۔ نٹشے کی یہی تاویل عقلی نظام الافکار کی شکل میں ہمیں 20 ویں صدی میں وجودیت پسندوں (Existentialist) میں ملتی ہے۔ فرانسیسی فلاسفر ژال پال سارتر کو وجودیت کا بابا کہا جاتا ہے۔ سارتر کا کہنا تھا چونکہ کوئی خدا نہیں ہے لہٰذا انسان خود ہی اپنی اقدار کا خالق ہے اور اسے خود ہی اپنے فیصلے سے یہ متعین کرنا چاہیے کہ صحیح کیا ہے۔ البتہ وجودیت ایک نظام الافکار کے لحاظ سے نہ خدا پرست تھی اور نہ ملحد پسندانہ، ممتاز وجودیت پسند دانشور دونوں حلقوں میں پائے جاتے رہے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ایمان اور دہریت کو ایک دوسرے کے متضاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خلط رہے ہیں۔ ایک طرح کے تصور خدا رکھنے والے دوسری طرح کے تصور خدا رکھنے والوں کو ملحد کہتے رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی عام مشاہدہ ہے جو لوگ بظاہر خدا کو نہیں مانتے، ان کے اندر صداقت کی جستجو، علم کی چاہت اور انسان دوستی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جو بڑھ چڑھ کر خدا پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اسی ننگی حقیقت کے پیش نظر بیسویں صدی کے بہت سے علمائے مذاہب نے دہریوں کی بہت سی تعریف و تحسین کی ہے مثلاً ایک رومن کیتھولک Maritain جہاں چرب زبان دہریوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا، وہاں وہ سنجیدہ ملحدین کو صوفیوں کے قریب قرار دیتا ہے۔ بقول اس کے ''ایسے دہریوں کی عظمت اور ان کا بڑا پن ہے کہ وہ دنیا کی برائیوں اور جہالت کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔'' دیکھنے میں آیا ہے کہ دہریئے خدا پرستوں سے زیادہ نرم خو اور نیک ہوتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ خدا پرستوں کا خدا پر ایمان اندھے عقیدے کی بنیاد پر ہونے کی وجہ سے ان کا خدا کے ساتھ رشتہ میکانکی نوعیت کا رہتا ہے۔ اس میں روحانی گہرائی اور وسعت نہیں آ پاتی۔ جب کہ دہریئے ہونا، بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے کائنات اور انسانی زندگی کا گہرا سائنسی علم بنیادی شرط ہے تاکہ ان سب سوالوں کے جواب مل جائیں جن کے ''شارٹ کٹ جوابات'' کے لئے خدا کا تصور عام انسان کا سہارا بنتا ہے۔ دوسری طرف زماں و مکاں میں لامحدود کائنات کا گہرا شعور رکھنے کی وجہ سے دہریئے کی نظر بھی لامحدود وسعت کی حامل ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شعور کی ایک اور لطیف ترین صفت یعنی روحانی احساسات اس کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا کا نام لئے بغیر خدا کی بنیادی شرط لامحدودیت سے زیادہ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ بہ نسبت خدا پر زبانی ایمان رکھنے والوں کے کیونکہ ان کا زیادہ تر تعلق خدا کے اس حصے سے ہوتا ہے جو محدود اور شخصی نوعیت کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں لبرل اور روشن خیال اہل ایمان نے اکثر دہریوں کی جرات مندی کو سراہا ہے کہ وہ روایتی مذہب کے بتوں کو توڑتے ہیں چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ اہل ایمان اور دہریئے اکثر ایسے مشترکہ کاز پر اکٹھے ہو جاتے ہیں جو مقبول عام مذہب کی خوش دلی اور اطمنانیت پر تنقید کرے۔ یہ مل کر اس کٹر عقیدہ پرستی کو مسترد کر دیتے ہیں جس سے کسی معاشرے کے اندر یا مختلف معاشروں

کے درمیان مقدس جنگوں یا فرقہ پسندانہ لڑائیوں کی آگ بھڑکائی جاتی ہے۔ دہریوں کا کردار تاریخ کے کسی بھی حصے میں اور کسی بھی معاشرے میں ہمیشہ مثبت رہا ہے۔ انہوں نے جہالت کے مقابلے میں عقل کے چراغ روشن کیئے۔ آخر کیا بات ہے جو عقل سوچتی ہے وہ مذہب سے عام طور پر مختلف ہوتا ہے۔ فطرت جو راز کھولتی ہے وہ مذہب کے دیئے نظریئے سے متضاد ہوتا ہے۔ سائنس کی جامع صداقتوں کے سامنے مروجہ مذاہب سے فطرت کے برے مبہم اور غیر مکمل تصورات کے ٹکڑے پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ دیکھا فلاں بات کا اشارہ مذہب میں پہلے سے ہی موجود تھا۔ حالانکہ ان کی حقیقت صرف اتنی ہوتی ہے کہ قدیم انسان اپنے مشاہدات اور تجربات سے صداقتوں کے ٹکڑے اکھٹے کر چکا تھا جن کا اشارہ مذہب کی بعض باتوں میں منعکس ہوتا ہے مثلاً اگر کہیں آیا ہے کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ معلومات کسی آسمانی (Divine) ذریعہ نے پہنچا کر علم حیاتیات (Biology) میں بڑا اضافہ کیا بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک انسان اپنے مشاہدے سے سمجھ چکا تھا کہ زندگی کسی نہ کسی طرح پانی سے پیدا ہوئی ہوگی۔ چنانچہ دہریوں نے اس کائنات اور تاریخ کی مادی تعبیریں کر کے صداقت مطلق تک پہنچنے کے لئے عینیت پسندوں (Idealists) کی طرح خیالی گھوڑے دوڑانے کی بجائے کہیں زیادہ سعی کی ہے اور انسان کو بذریعہ عقل عظیم تر صداقت کے قریب کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے پھیلاتے ہوئے اس عام تصور کو بھی غلط ثابت کیا کہ مروجہ تصور خدا کے بغیر انسان روحانی طور پر خود کو خالی محسوس کرے گا۔ دنیا کے تمام عظیم دانش ور جو مذہبی تصور خدا پر ایمان نہیں رکھتے، وہ روحانی طور پر زیادہ مطمئن اور تونگر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ایمان موروثی یا اندھی عقیدت کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ ٹھوس حقائق اور کسب شعور کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ مروجہ تصور خدا کے انکار سے انسان اخلاقی طور پر بے راہ رو ہو جائے گا کہ دہریئے کسی بھی دعوے تقویٰ رکھنے والے سے کم شریف النفس نہیں پائے گئے بلکہ اخلاقی طور پر وہ زیادہ حساس ہو جاتے ہیں کیونکہ اخلاقی سوال گناہ و ثواب کا کھیل نہیں رہتا بلکہ اپنی بہترین انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بقاء کا سوال بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی اخلاقیات اور اصول پرستی کی جڑیں ان معاشروں میں کہیں زیادہ گہری ہیں جنہیں عام طور پر سیکولر اور مذہب سے بے گانہ معاشرے کہا جاتا ہے جب کہ تمام مذاہب زدہ معاشرے زباں سے اخلاقیات کے ''مامے'' اور عملاً اندر اسے اخلاقی طور پر مکمل دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ جہاں اپنی ذات کے مفاد کا سوال آتا ہے وہاں نہ خوف خدا یاد رہتا ہے نہ انسانیت کا خیال اور نہ وطن سے محبت باقی رہتی ہے، چنانچہ تمام وہ معاشرے جہاں مذہب کا بول بالا ہے منافقت اور بے اصولی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

لاادریت (Agnosticism)

لاادریت کو بھی انکار خدا کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جاسکتا ہے۔اس عقیدے کے مطابق کہا جاتا ہے کہ ہمیں وجود باری تعالیٰ کا علم وادراک نہیں ہوسکتا۔یہ تشکیک کی ہی ایک شکل ہے،جس کے مطابق انسانی ذہن کے پاس اتنی معلومات یا عقلی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ کسی مطلق صداقت کے بارے کوئی فیصلہ کرسکے اور خصوصی طور پر خدا کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے کوئی حتمی دعویٰ کیا جاسکے۔

انگریزی کی یہ اصطلاح ٹی۔ایچ۔ہکسلے (1869ء) نے وضع کی تھی۔دہریت کے برعکس یہ خدا کے وجود کی نفی نہیں کرتے بلکہ یہ خدا کے ہونے نہ ہونے کے قضیے کو معطل رکھتے ہیں کہ انسان کم ازکم ٹھیک طور پر ابھی نہیں جانتا۔روایتی لاادریت اپنی اصطلاح کے وجود میں آنے سے کئی صدیاں پرانی ہے۔سقراط سے پہلے کے فلاسفروں اور افلاطون کے وقت سوفسطائیوں (Sophists) نے بہت سے لاادریت کے سوال اٹھائے تھے۔سوفسطائیوں کو مکمل طور پر فلاسفر تو نہیں کہا جاسکتا، وہ چلتے پھرتے سفری معلم تھے جو فیس کے بدلے تقریریں کرنے اور انشاء پردازی کا فن سکھایا کرتے تھے تاکہ سیکھنے والے اچھی ملازمتوں کے مواقع حاصل کرسکیں۔سوفسطائیوں نے باقاعدہ طور پر خالص علم کی جستجو میں کم ہی دلچسپی لی لیکن وہ اپنے علمی نوعیت کے پیشے کی وجہ سے کسی قادر مطلق خدا یا صداقت کے بارے تشکیک کی حد تک پہنچ گئے تھے۔لہٰذا وہ بہت سی روایتی اقدار کو مسترد کرتے تھے۔سوفسطائیوں کے درمیان سب سے ممتاز مفکر پروٹاگوراس (Protagoras) تھا۔وہ یوں اپنے عقیدے کو بیان کرتا ہے کہ ’’ہر فرد کو بذات خود اس دنیا کا تجزیہ کرنا چاہئے۔‘‘اس کا قول تھا ’’انسان ہی ہر چیز کا پیمانہ ہے۔‘‘

Man is the Measure of All Things.

جدید لاادریت یورپ میں 18 ویں اور 19 ویں صدی میں ایک تحریک کے طور پر ابھری۔ڈیوڈ ھیوم (David Hume) جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، ایک عظیم لاادری مفکر تھا۔وہ ہر طرح کی مابعد الطبیعات (Metaphysics) کی نفی کرتا تھا اور جانتا تھا کہ ہر طرح کے علم کی کھوج حسیاتی اثرات کی اساس پر ہونی چاہیے۔خصوصی طور پر اس نے معجزے اور ابدیت کے عقیدے کو ناکافی شہادت کی بنا پر مسترد کردیا۔البتہ اپنے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے یہ ثابت کرنے سے گریز کیا کہ خدا نہیں ہے۔صاف ظاہر ہے کہ کسی معاملے کی نفی کرنے کے لئے اتنی ہی شہادت درکار ہوتی ہے جتنی اسے مثبت ثابت کرنے میں۔چنانچہ ھیوم کی یہ نصیحت تھی کہ ان تمام عقائد کے بارے فیصلہ کو معطل رکھا جائے جنہیں تجرباتی سطح پر رد نہیں

کیا جا سکتا۔ لیکن عملاً اس کے دلائل ہر طرح کے عقائد کی نفی ہی کرتے تھے کیونکہ وہ مصر تھا کہ ان عقائد کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔
19 ویں صدی کا انگلستان تو لاادریت کے جہاد کا منظر پیش کرتا ہے۔ ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) نظریہ ارتقاء کا ایک بااثر فلاسفر تھا۔ اس نے خدا کے بارے روایتی عقائد کو مسترد کر دیا اور ہر چیز کے آخری تجزیئے کو ''قابل علم'' (Knowledge) سے منسوب کر دیا، یعنی جس بات کی سمجھ آج نہیں آتی، اس کی کل سمجھ آ سکتی ہے۔ ہربرٹ سپنسر نے ھیوم کی لاادریت کے برعکس مابعدالطبیعات کو یہ کہہ کر ترقی دی کہ ''یہ کائنات جس طاقت کا اظہار کرتی ہے وہ مکمل طور پر ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے'' جس پر ریڈیکل قسم کے لاادریوں نے نکتہ اٹھایا کہ کسی ایسی طاقت کے بارے بات کرنا جسے مکمل طور پر جانا نہیں جا سکتا۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ چنانچہ انگلستان میں وہ حالات پک گئے تھے جب ھکسلے لاادریت کی اصطلاح ایجاد کر کے اپنے کیس کو پیش کرتا ہے۔ پہلے پہل اس نے اس لفظ کو بات چیت اور تقریروں میں استعمال کیا، پھر اس نے تحریروں میں بھی اس نظریئے کو اجاگر کرنا شروع کر دیا۔ ھکسلے نے بغیر کافی شہادت کے کسی عقیدے کو قبول کرنے پر شدت سے اعتراض کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے اصرار کیا کہ وہ کسی عقیدے کو نہ ماننے میں کوئی کٹر موقف نہیں رکھتا۔ اس نے اپنی سائنسی نیچرل ازم کی تھیوری کو اس اعتراف کے ساتھ کھلا رکھا کہ کائنات کے اندر کسی ایسی عظیم طاقت کا امکان ہے جو ہر جگہ حاضر بھی ہو اور ہر چیز کا علم بھی رکھتی ہو لیکن اسے بیان نہ کیا جا سکتا ہو لیکن اسے اپنے اس قیاس کی صداقت کے لئے کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ لہٰذا اس نے تمام مطلق سوالوں کے جواب اپنی لاعلمی کا اعترف کرتے ہوئے دیئے۔ لیکن ان تمام سوالوں کے جواب خود مذہبی پیشواؤں کے پاس بھی نہیں ہیں کہ وہ ان کے جوابات ایسے عقائد میں دیتے ہیں جنہیں پہلے فرض کر کے ایمان لے آیا جائے۔

لاادریت کی جڑیں مندرجہ ذیل نظریات میں پائی جاتی ہیں۔

1- Epistemology علم انسان کے ذرائع اور مواد کا علم جس میں سائنس کو تمام علم کا ماڈل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا معیار وہ دانش ورانہ طریقہ کار ہے جس میں شہادت کا اچھی طرح معائنہ کرنا ہوتا ہے اور ان قضیوں کے بارے فیصلہ کو معطل رکھنا ہوتا ہے جس کے لئے مناسب شہادت موجود نہ ہو۔

2- لاادریت کی دوسری جڑ اخلاقیات میں تھی۔ ایک لاادری بھی اتنا ہی پر جوش ہوتا ہے۔ اپنا فیصلہ دینے میں جتنا کوئی ایمان والا ہو سکتا ہے لیکن وہ اسے غیر اخلاقی حرکت سمجھتا ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھے جس کی حمایت کے لئے مناسب شہادت اور کافی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ھکسلے کہا کرتا تھا کہ اس کا کیس جتنا دانشورانہ (Intellectual) ہے اتنا ہی اخلاقی بھی ہے کہ یہ غلط ہے کسی آدمی کے لئے کہ وہ یہ کہے کہ اسے کسی مقولے (Proposition) کی معروضی صداقت پر یقین ہے جب تک کہ وہ اس کے لئے وہ شہادت پیدا نہ کرے جو منطقی طور پر اس یقین و ایمان کو حق بجانب نہ ثابت کر دے۔

ڈبلیو کے کلفورڈ (W.K. Clifford) کا تعلق ان لاادریوں سے تھا جو شدت پسند تھے۔ وہ اپنی کتاب ''عقیدے کی اخلاقیات'' (The Ethics of Belief) 1879ء میں لکھتا ہے ''یہ بات ہمیشہ ہر جگہ اور ہر ایک کے لئے غلط ہے کہ ناکافی

ثبوت کی بنا پر کسی بات پر یقین کر لیا جائے، چنانچہ ایسا عقیدہ خواہ سچا ہی کیوں نہ ہو، بذات خود گناہ ہے۔" یعنی خدا پر اندھے عقیدے کو بھی وہ شرف انسانیت سے گری ہوئی حرکت اور گناہ قرار دے رہا ہے۔ انسان ہونا ہی عقل سے مشروط ہے چنانچہ کوئی ایسا یقین و ایمان جو پہلے عقل کی نفی کرے اور اندھے ایمان پر زور دے۔ وہ دائرہ انسانی سے ہی گری ہوئی حرکت ہے۔ ایسا ایمان تو سب سے پہلے انسان کو انسان ہی نہیں رہنے دے گا۔ اور اگر انسان انسان ہی نہیں رہے گا تو اندھے عقائد پر اٹھی ایمان کی مقدس عمارت کے معنی کیا رہ جائیں گے۔ عجیب بات ہے اندھے عقائد رکھنے والے لوگ عقلی بات پر تو سو دلائل اور شکوک و شبہات پیش کریں گے لیکن اپنے عقیدے پر خود بلا حیل و حجت ایمان لائے ہوتے ہیں جو انہیں ان کے ماحول اور ورثے میں ملا ہوتا ہے۔

لاادریت کی اٹھان اس ماحول میں ہوئی تھی جب کائنات کا سائنسی علم انسان کو اس حد تک ہو گیا کہ مروجہ مذہبی عقائد کے پاس اپنی صداقت کو منوانے کے لئے اس وقت کے انسانی شعور کے مطابق دلائل اور ثبوت نہیں تھے۔ لہٰذا خدا پر ایمان تو ختم ہو گیا البتہ آخری فیصلہ کو معطل رکھا گیا کہ ابھی خدا کے نہ ہونے کے بھی مکمل دلائل موجود نہیں ہیں لیکن جب خدا کے نہ ہونے کی بحثیں زیادہ زور پکڑ گئیں تو لاادریت کے لئے اپنے اس پالیسی فیصلہ پر قائم رہنا مشکل ہو گیا کہ آخری فیصلہ کو مزید علم ہونے تک معطل رکھا جائے۔ ابتداً ان کا موقف تھا "ہم کسی بات سے انکار نہیں کرتے، ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے۔"

"We Deny Nothing, We Simply Say We Do Not Know."

لیکن صداقت پر ایمان کا جب اخلاقی سوال سامنے آیا تو وہ عملاً خدا کی نفی کرنے لگے۔ اب ان کا موقف تھا "ہم نہیں جانتے لیکن ایمان لانا بھی غیر اخلاقی حرکت ہے۔"

"We Do Not Know, But It is Immoral to Beleive."

یعنی جو لوگ بنا تصدیق خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ غیر اخلاقی عمل کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ امریکی ماہر نفسیات اور فلاسفر ولیم جیمز (William James) کا یہ کہنا تھا کہ لاادریوں کا خیال جذباتی امر تھا نہ کہ سائنسی فیصلہ۔ جیمز کی دلیل یہ تھی کہ غلطی کرنے کا "رسک" (خطرہ مول لینا) لینا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ سچ کی جستجو کو ترک ہی کر دیا جائے لیکن لاادری سچ کی جستجو کو ختم نہیں کر رہے تھے۔ وہ سچ کے حصول تک فیصلہ کو چھوڑ رہے تھے۔

لیکن جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مذکورہ بحث و تمحیص کسی خلا میں نہیں ہو رہی تھی بلکہ انسان کو فطرت کا علم اور اس پر اتنا کنٹرول حاصل ہو چکا تھا کہ اب تو ہم پرستی اور تقدیس کے نام پر قدیم عقائد کو مزید جاری رکھنا مشکل کام ہو گیا تھا کیونکہ ایمان کے لئے عقل و دانش پر مبنی دلائل نہیں بلکہ مکمل طور پر داخلی، پراسرار اور رازدارانہ قسم کے مذہبی دعوے اور خرافات سے پر تاویلات تھیں۔ الغرض خدا یا دیوتاؤں کے وجود اور ان کی نوعیت کے بارے سوالات ہمیشہ فلاسفی سے وابستہ رہے ہیں اور ان پر بحث ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ البتہ مغرب میں مذہبی زبان کا ہو بہو مطلب لینا اب تقریباً ترک ہو چکا ہے۔ سائنس کی

تحقیقات اور انکشافات کے بعد مذہب کی فلاسفی کی عمومی تفہیم پر ہی زور دیا جاتا ہے اور زندگی کے امور طے کرنے میں مذہب کا کوئی کردار باقی نہیں رہا ہے۔ البتہ پس ماندہ اقوام اور غیر صنعتی معاشروں میں آج بھی مذہب کا اثر رسوخ ازمنہ وسطیٰ کی یاد تازہ کرتا نظر آتا ہے۔

خدا کے وجود پر ایمان عقیدے یا کسی داخلی تجربے سے ہی کیا جاتا ہے۔ بہر حال اقرار خدا کے لئے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیئے جاتے ہیں۔

1- کائناتی ثبوت (Cosmological Proof)

2- فلسفہ غایات (Teleoplogical Proof) اس نظریئے کے مطابق کائنات کے تمام تغیرات کسی مقصدیت سے واقع ہوئے ہیں۔

3- علم الوجود (Ontological Proof) ایک مکمل اور ضروری ہستی کے طور پر خدا کے تصور سے ماخوذ نتائج اور مقاصد سے ثابت کرنا کہ خدا ہے۔

4- اخلاقی ثبوت (Moral Proof) مقاصد و معنی اور اخلاقی تجربات سے خدا کے وجود کو ثابت کرنا۔

5- عقیدے سے (By Faith)

لیکن خدا کے وجود کی حمایت کرنے والی کوئی بھی تھیوری آج کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک وہ اس سوال کا جواب نہ دے کہ خدا کا تصور جو انسان کی اپنی سوجھ بوجھ کے ساتھ قریبی طور پر جڑا ہوا نظر آتا ہے، وہ کہیں کائنات کے بارے انسان کے اپنے علم کی ہی جھلک تو نہیں۔ یعنی خدا انسان کی اپنی ایجاد تو نہیں۔

In The Notion of God which Correlates so Closely With the Self understanding of Humankind, Merely a Projection of humanity's Self Consciencness Onto an Understanding of Cosmos?

ورنہ خدا کے وجود کا انحصار سوائے عقیدے کے کچھ نہیں رہتا

غیر الہامی مشرقی مذاہب اور تصور خدا

مشرق وسطیٰ کے الہامی مذاہب کے مقابلے میں جہاں خدا کا تصور زیادہ تر انسانی اور شخصی اوصاف کا مالک بن جاتا ہے۔ مشرق کے دیگر مذاہب نے خدا کو لامحدودیت (Infinity) میں محسوس کرنے کی کوشش کی چنانچہ انہوں نے دنیا کے تمام مظاہر فطرت کو بالآخر ایک ہی حقیقت کا مظہر اور کائنات کی اساس قرار دیا۔ جو تمام واقعات اور اشیاء کے کثیر مجمع کو متحد رکھتا اور انہیں چلاتا ہے۔ ہندوؤں نے اسے برہما کہا، بدھ مت میں Suchness اور لاؤزو نے تاؤ کا نام دیا۔ ان سبھی مذاہب کا کہنا ہے کہ خدا کا فہم وادراک ہمارے دانشورانہ خیال کی سطح سے ماوراء ہے۔ وہ عقل وفہم سے بالاتر ہستی ہے جسے وجدانی طور پر ہی محسوس کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ان مذاہب نے خدا کو شخصی حیثیت دینے کی بجائے اسے اس کائنات کا جوہر مطلق قرار دیا جو اپنی ذات کا اظہار متنوع اشکال میں کرتا ہے، جو وجود میں آتی ہیں۔ کچھ عرصے بعد منتشر ہو جاتی ہیں اور پھر کسی اور شکل میں منتقل ہو جاتی ہیں علیٰ ھذا القیاس۔ یہ سلسلہ ناتمام چلتا رہتا ہے۔ سنسکرت کے پرانے فلسفیانہ رسائل اپنشدز (Upanishades) میں برہما کو بے شکل، متحرک اور ابدی قرار دیا گیا ہے۔ چین کے قدیم مذہب میں اسے تاؤ (راستہ، Way) کہا گیا گیتا میں کرشن خدا کے بارے تصوفانہ زبان میں کہتا ہے "اگر میں خود کو عمل میں مصروف نہ کروں تو یہ ساری دنیا تباہ ہو جائے" یعنی اگر حرکت کا عمل اٹھ جائے تو کسی چیز کا وجود باقی نہ رہے۔ اسی طرح ہندو مذہب میں شو (Shiva) کو ایک ایسے رقاص کی شکل میں دکھایا جاتا ہے جس کے آہنگ (Rytham) میں پوری کائنات والہانہ انداز سے یوں رقص کناں ہے کہ تمام فطرت (Nature) اس میں ڈوب کر ایک ہو جاتی ہے۔

چھٹی صدی قبل از مسیح کی درمیانی مدت کے دوران ایک غیر معمولی دور دیکھنے میں آتا ہے۔ جب اتنے زیادہ روحانی اور فلسفی جینئس پیدا ہوئے۔ کیفوشس اور لاوزو چین میں، ملک فارس میں زرتشت (Zorathustra)، یونان میں فیثا غورث کے علاوہ Heraclitus اور ہندوستان میں گوتم بدھ پیدا ہوئے۔ کائنات کی حرکت آفرینی کا فلسفہ گوتم بدھ نے ڈھائی ہزار سال پہلے پیش کیا۔ بقول اس کے کائنات ایک ناختم ہونے والا ہیئتی اور نوعی تبدیلیوں کا متحرک سلسلہ ہے جو باہمی طور پر ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے چنانچہ بدھ ازم میں بصیرت اور روشنی کا مطلب یوں بیان کیا گیا "جو زندگی کے بہاؤ میں مزاحمت پیدا نہ کرے، بلکہ اس کے ساتھ متحرک رہے۔"

Who Does not Resist the Flow of Life But Keeps Moving with it.

بعینہ جب تاؤازم کے ایک عالم سے کسی نے استفسار کیا کہ تاؤ کیا ہے تو اس نے جواب میں کہا ''چلتے رہنا'' چنانچہ بدھ، تاؤ اور ہندومت کا ایک حصہ اس دنیا کی حرکت، بہاؤ اور تبدیلی میں خدا کو سمجھنے اور اسے محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لاؤزو کائنات میں جاری جدلیاتی عمل کی یوں تعریف کرتا ہے۔ ''جب سب اس دنیا میں حسن کو خوبصورتی سے تعبیر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تب بدصورتی کا تصور بھی وجود میں آتا ہے۔ جب سب خیر کو اچھائی سمجھنے لگیں تو برائی پیدا ہوتی ہے۔'' یعنی اس کائنات کے اندر خیر وشر، دکھ اور سکھ یا موت وحیات ایسے مطلق قسم کے تجربات نہیں، جن کا تعلق قطعی مختلف زمروں (Categeries) سے ہو بلکہ یہ ایک ہی حقیقت (Phenomenon) کے دو رخ یا ایک ہی مکمل چیز کے دو مخالف سرے (Extreme Parts of a Single Whole) ہوتے ہیں۔ کرشن گیتا میں خدا یعنی مطلق صداقت کے قریب ہونے کو یوں بیان کرتا ہے کہ ''اس دنیا کے تضادات سے پرے...... جو ابدی سچائی ہے اس میں رہو۔'' یہی وہ باکمال انسانی ادراک کا نقطہ عروج ہوتا ہے جب وہ اس دنیا کی متضاد صفت صداقتوں کی معروضیت کو سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جب انسان اپنے اندر لامحدودیت (Infinity) محسوس کرنے لگ جاتا ہے جسے صوفیانہ روحانیت کہتے ہیں۔ سنسکرت کے پرانے رسائل میں ''خدا'' کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

''وہ حرکت میں بھی ہے اور نہیں بھی

''وہ دور بھی ہے اور نہیں بھی

''وہ ہر چیز کے اندر بھی ہے اور ان سب سے باہر بھی''

گویا خدا (کائنات) سہ جہتی (Three Dimensional) نہیں کثیر الابعاد (Multi Dimensional) ہے۔ اس لئے اس کی آخری حقیقت گرفت میں نہیں آتی۔ یہی وہ حیرت انگیز نقطہ اتصال ہے جہاں مشرق کے غیر الہامی مذاہب اس مادی کائنات کی جس فلسفیانہ تعبیر پر پہنچتے ہیں آج کی جدید ترین فزکس کی تھیوریاں (Quantum and Relativity) انہی حقائق کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی ہیں۔

''جہاں ثنویت (دوئی) ہوتی ہے وہاں ایک دوسرے کو دیکھتا ہے۔ ایک دوسرے کو چکھتا ہے، ایک دوسرے کے ذائقے کو محسوس کرتا یا کر سکتا ہے لیکن جہاں ہر چیز خود ہی ایک بن جاتی ہے تو پھر کوئی کسی کو اور کہاں دیکھے گا، کون کس کو سونگھ سکے گا، کہاں اور کون کس کا ذائقہ لے سکے گا۔'' یہ وہ مقام تھا جہاں پر مذکورہ قدیم مذاہب کے مفکرین نے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ اس مادی دنیا کی اس خصوصیت کو سمجھ گئے کہ یہ بیک وقت محدود بھی ہے اور لامحدود بھی...... اور اس کائنات کی بہترین تفہیم اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب بقول صوفیاء کے ''میں'' اور ''تو'' کی دوئی ختم کی جائے۔ جب مہاتما بدھ سے پوچھا گیا کہ روح سے کیا مراد لی جائے، تو اس نے کہا روح جملہ اجزاء کے مجموعے کی احدیت کا نام ہے۔ یعنی اجزاء کا مجموعہ بشمول کل ''روح'' ہے۔ روح کی ایسی شاندار تعریف کرنے کے بعد ہی مشرقی تہذیب کے علماء، جدید سائنس پر معترض ہوتے ہیں کہ سائنس کا اس دنیا کو جاننے کا طریقہ ناقص ہے۔ کیوں کے سائنس چیزوں کو اجزاء میں تقسیم کر دیتی ہے اور ایک ایک حصے کا الگ

الگ تجزیہ و تحقیق کرکے اس کے بارے علم حاصل کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سائنس کسی چیز کا As a Whole یعنی ''کل'' کا مطالعہ نہیں کرتی...... ان کا کہنا ہے کہ کوئی چیز دوسری چیز سے مکمل طور پر جدا وجود نہیں رکھتی...... چنانچہ سائنس کا علم ناقص رہ جاتا ہے۔ چیزوں کو کلیت (Totality) میں نہ دیکھنے کی وجہ سے کسی چیز کی روح تک نہیں پہنچ پاتی۔ وہ صرف اجزاء کی حقیقتوں کو ہی جان پاتی ہے۔ لہٰذا ان کا کہنا ہے کہ صرف مابعد الطبیعاتی طریقے سے ہی دنیا کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے سائنسی طریقہ کار (Methodology) پر مذکورہ اعتراض کا تجزیہ ضروری ہے۔ اس میں مختلف سوالات سامنے آتے ہیں۔ جسم کو سمجھے بغیر...... اگر روح کی سمجھ بھی آجائے تو کیا اسے نقائص سے آزاد اور حقیقت کا مکمل (Perfect) علم قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر سوال یہ آئے گا کہ روح پہلے ہے یا اجزاء......؟ روح اجزاء کو بناتی ہے یا اجزاء مل کر روح کی تخلیق کرتے ہیں، روح کے علم کے ان دعوے دار مذاہب نے انسان کا زیادہ بھلا کیا ہے یا سائنس نے؟ روح کے علمبردار...... تو ہم پرستانہ اور دیوی دیوتاؤ کے قصے کہانیاں سنا کر ''جسم'' کے بارے جو جہالت پھیلا چکے ہیں۔ اسے کس کھاتے میں ڈالا جائے گا؟ سائنس پر یہ اعتراض غلط ہے کہ وہ صرف اجزاء کا مطالعہ کرتی ہے کیونکہ سائنس دان جب جسم (Body) کے کسی حصے کا مطالعہ کررہا ہوتا ہے تو وہ اسے کسی خلا میں رکھ کر تجزیہ نہیں کرتا۔ اس کے مکمل دھیان میں یہ بات ہوتی ہے یہ جز دیگر اشیاء کے ساتھ جڑا ہوا اور ایک ''کل'' کا حصہ ہے اور ہر تخلیق کار ٹھوس مادی اشیاء اور علم کو ہی بروئے کار نہیں لا رہا ہوتا بلکہ وہ تخلیقی عمل کے دوران وجدان سے بھی کام لے رہا ہوتا ہے...... جسم کے علم کے بغیر صرف روح کا علم نہ صرف ناقص بلکہ فضول بھی ہے، کیونکہ عملی دنیا میں صرف روحانی علم کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس روح کا علم نہ بھی ہو...... تب بھی جسم کا علم بہت حد تک مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ گویا سائنس کا مادے کے اجزاء کے مطالعہ کا طریقہ کار روح پرستانہ میٹافزکس طریقہ کار سے بہتر ہے۔ سفر جز سے کل کی طرف ہونا چاہیے نہ کہ کل سے جز کی طرف۔ کیونکہ ''کل'' صرف ایک تجریدی تصور ہوتا ہے، جب کہ جز مادی وجود رکھتا ہے۔ تجریدی تصور ہر کسی کا مختلف ہوسکتا ہے کیونکہ وہ مکمل طور پر داخلی تجربے اور احساس کا نام ہے مثلاً ایک ملک کا نام ''چین'' ہے۔ تو ''چین'' بذات خود کچھ نہیں ...... وہ مخصوص لوگوں کی سرزمین کا نام ہے۔ کیا ان لوگوں اور اس زمین کے مطالعے کے بغیر صرف ''چین'' کا مطالعہ کوئی معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح ''روح'' کا مطالعہ جسم کے بغیر اور ''خدا'' کا مطالعہ اس مادی کائنات کے علم کے بغیر بے معنی ہے۔ اس مثال سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ پہلے اجزاء ہوتے ہیں، پھر کل ہوتا ہے۔ پہلے جسم اور روح بعد میں ہوتی ہے۔ جسم نہیں تو روح بھی نہیں ہوسکتی...... اسی طرح اگر چین کی سرزمین اور اس کے لوگ نہ ہوں تو ''چین'' بھی نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس کائنات کو بہترین طور پر سمجھنے کے لئے سائنس کا مادی نقطہ نظر دیگر تمام تصوراتی فلسفوں سے افضل ہے۔ تاہم ان غیر الہامی مذاہب کے مفکرین کا خیال ہے کہ سائنس دنیا کو مختلف اشیاء اور واقعات میں بانٹ دیتی ہے...... جب کہ وہ اپنی فطرت میں ایک ہیں۔ لہٰذا فطرت کی انفرادی صداقتیں صرف سراب ہیں۔ ہندو اور بدھ مت کے مطابق یہ سراب ہماری ناواقفیت اور لاعلمی کی وجہ سے دکھائی دیتا ہے، جو انسانی ذہن ''مایا'' کے سحر میں مبتلا ہو کر پیدا کرتا ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ سامنے ہے وہ حرکت و تغیر میں ہونے کی وجہ سے حقیقت نہیں ہے لیکن

انسانی دماغ چیزوں کو الگ الگ سے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے دوبارہ فطرت کی روح کے ساتھ ہم آہنگ (Adjust) کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کے لئے وہ خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر مراقبہ (Meditation) کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ سنسکرت میں ''سماوی'' کا مطلب ہی ذہنی توازن Mental Equilibrium کے ہیں۔

اشیاء اپنے طور پر کچھ بھی نہیں ہوتیں، وہ اپنے وجود کو فطرت کے باہمی انحصار سے ماخوذ کرتی ہیں۔ ایک بار جب زین (Zen) مذہب کے عالم سے پوچھا گیا کہ ''خدا کو پانے کا کیا راستہ ہے؟'' تو اس نے جواب میں کہا، ''یہ ایسے ہی ہے جیسے بیل پر سوار ہو کر بیل کی تلاش کی جائے۔'' زین مت میں زور دیا جاتا ہے ہماری جو اصل فطرت ہے، اس کی تکمیل کی جائے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم اپنے آپ کو اور ماحول کی تمام اشیاء کو Becoming میں دیکھیں۔ زین مت کی تعریف (Definition) یوں کی گئی۔ ''جب بھوکا...... کھاتا ہے اور تھکا ماندہ...... سوجاتا ہے'' ان کا کہنا ہے ''یہ'' ''وہ'' بھی ہے اور ''وہ'' ''یہ'' بھی ہے۔

"This" is Also "That" The "That" is Also "This"

جیسے زید خود کو یہاں پر کہ رہا ہوتا اور بکر کو وہاں پر۔ حالانکہ بکر کی نظر میں میں زید ''وہاں'' پر ہوتا ہے اور وہ خود ''یہاں'' پر اسی طرح تاؤازم میں خدا (تاؤ) نام ہے، متضاد جہتوں کے باہم اتصال و عمل کا۔ چنانچہ خدا کی حرکات کو مسلسل متضاد پہلوؤں کے اشتراک عمل اور ان کی باہمی اثر اندازی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسے کسی چیز کو سکیڑنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسے پھیلایا جائے! کمزور ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے طاقت والا ہو۔ زوال پذیری کے لئے سرفراز ہونا ضروری ہے۔ ''لینے'' کے لئے پہلے ''دینا'' لازمی ہے۔ تاؤازم میں کہا جاتا ہے۔

Be Bent And You Will Remain Straight
Be Vacant And You Will Remain Full
Be Worn And You Will Remain A New.

''جھکیں گے تو آپ سیدھے رہیں گے
خالی ہوں گے تو آپ بھر جائیں گے
استعمال ہوں گے تو آپ نئے بن جائیں ے۔''

یہی وجہ ہے کہ تاؤازم میں خیر کے لئے کوشاں نہیں ہوا جاتا بلکہ فطرت کے عین مطابق خیر اور شر کے بیچ ایک متحرک توازن قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف سچ پر چلتے رہیں اور صرف سچائی کی تکریم کرتے رہیں، ممکن نہیں ہے۔ گویا دیگر مذاہب جو صرف خیر پر ہی اصرار کرتے ہیں، ایک ناقابل عمل اور غیر فطری طریقہ کار کا پرچار کرتے ہیں۔ تاؤ ازم کا بنیادی ایمان اس پر ہے کہ انسانی شعور خدا کا مکمل ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ چند چنگ زو (Chung Tzu) عقل اور برہان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ایک کتے کو اس لئے اچھا نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بھونکتا بڑا اچھا ہے اور ایک شخص کو اس لئے عقل مند نہیں سمجھ لیا جائے گا کہ وہ بات بڑے سلیقے اور ہنر مندی سے کرتا۔'' انسانوں کے درمیان فکری تنازعات اور

مناظرے اس بات کا ثبوت ہیں کہ صاف دکھائی نہیں دے رہا۔ ان کا کہنا ہے کہ فطرت کا مشاہدہ کرو تا کہ خدا کی خصوصیات کو شناخت کر سکو۔ اس طرح تاؤازم کے ماننے والوں کا رویہ بنیادی طور پر سائنسی نظر آتا ہے لیکن تجرباتی طریقہ کار پر ان کا بھروسہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی سائنسی نظریات نہ بنا سکے۔ چنگ زو کا قول ہے ''تمام تضادات ایک ہی حقیقت کے دوسرے ہوتے ہیں، چنانچہ وہ ایک ہی ہیں۔

''All Opposites Are Polar, and Thus United''

اس طرح کی فکر صرف مشرقی مذاہب کی روایت ہی نہیں بلکہ اس زمانے میں اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار یونان میں Heraclitus نے بھی کیا تھا۔ مثلاً اس کے چند مشہور اقوال یہ ہیں۔ ''ہر چیز بہہ رہی ہے'' ''اوپر جانے اور نیچے آنے کا رستہ ایک ہی ہوتا ہے'' ''خدا، دن رات، گرمی سردی، جنگ امن، آسودگی اور بھوک کا ہی نام ہے'' ''ٹھنڈی چیزیں خود کو گرم کرتی ہیں اور گرم خود کو ٹھنڈا، مرطوب خود کو خشک کرتا ہے اور سوکھے کو گیلا کیا جاتا ہے'' ''آسانی مشکلات کے لئے رستہ بناتی ہے'' ''آواز کی لہریں ہی آواز میں آہنگ پیدا کرتی ہیں'' ''اگلا پچھلے کی پیروی کرتا ہے۔'' اس کے فطرت کے بھارے انہی گہرے خیالات کا نتیجہ ہے کہ Heraclitus کا اکثر ذکر آج کی جدید فزکس میں بھی کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا'' فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر عمل پیرا ہونے کا مطلب ہے اپنی اصل فطرت کے مطابق بلاارادہ خود بخود عمل کرنا۔''

Acting Spontaneously and According to One True Nature.

تاؤازم میں بھی اس بات کو یوں دہرایا گیا ہے ''جو سسٹم فطرت کی پیروی کرتے ہیں، وہی تاؤ (خدا) کے ساتھ بہہ رہے ہوتے ہیں۔'' عمل سے گریز خلاف فطرت ہے۔

Those Who Follow the Natural Order....
Flow in the Current of the Tao (God).

فطرت کو مطمئن کرنے کا مطلب ہے کام کرنا...... تبھی اعمال کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ گویا ناکامی اصل میں فطرت کے مطابق نہ چلنے کا نام ہے۔

مہاتما بدھ نے وقت مرگ جو آخری الفاظ کہے، وہ کچھ یوں تھے۔ ''فرسودگی و زوال ہر چیز کی فطرت میں مضمر ہے۔ تندہی اور جانفشانی سے جدوجہد کرتے رہو۔'' بدھ مت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک ایسا مذہب تھا جس میں نہ طبقات تھے، نہ ذات پات اور نہ ہی خدا کا تصور۔ چنانچہ بدھ مت کو Godles Classless Castless مذہب کہا جاتا ہے۔ بدھا کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ انسان کے اس تجسس کو مطمئن کرے کہ یہ دنیا آئی کہاں سے ہے یا خدا کس طرح کا ہے؟ مہاتما بدھ انسانی حالت کے بارے زیادہ متفکر تھا چنانچہ بدھ ازم میں انسانی نفسیات کو سمجھنے پر زور دیا۔ چنانچہ اس نے ''مایا'' ''کرما'' اور نروان کی نفسیاتی تشریحات پیش کیں، تا کہ انسان کو مصائب اور مایوسیوں سے نکالا جا سکے۔ ادھر ہندو مت اگرچہ اساطری قصوں اور رسم و رواج کا مذہب ہے لیکن ان کے نزدیک بھی سب دوتا ایک ہی عظیم خدائی حقیقت کے مظہر ہیں۔ اس کی خدائی کا عکس ہر جگہ موجود ہے۔ خدا اپنی انتہائی سطح پر ناقابل فہم ہے اور انسانی ادراک سے باہر ہے۔

ہندومت میں نسوانی دیویوں (Goddesses) کو عیسائیت کی طرح ''مقدس کنواری'' کے روپ میں پیش نہیں کیا جاتا، بلکہ وہ چونکا دینے والی حسینائیں ہیں جو ہم آغوشی کی حالت میں شہوت انگیز تصویروں میں نظر آتی ہیں کیونکہ ان کے خیال میں جسمانی اور حسی رخ بھی قدرت کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

مختصراً مشرق کے غیر الہامی مذاہب نے خدا کو لامحدود حرکت وتغیر اور جدلیاتی عمل میں دیکھنے کی جو کوشش کی اس کی وجہ سے ان کی فکر میں صرف فلسفیانہ گہرائی ہی پیدا نہ ہوئی...... بلکہ وہ حقیقی طبعی عمل کو سمجھنے کے بھی قریب تر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے آج جدید فزکس مادے کی تشریح میں جہاں پہنچ گئی ہے، وہاں ماہرین طبیعات (Physicists) کو جدید فزکس اور ان قدیم مذاہب کے تصورات میں بڑی مماثلت دکھائی دے رہی ہے لیکن مسئلہ پھر وہی آ جاتا ہے کہ مشرق میں اردگرد کی مادی دنیا سے صرف نظر کر کے آخری سچائی تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی رہی...... یعنی ا، ب کو پڑھے بغیر یے تک پہنچ گئے...... لہٰذا نہ دنیا ہاتھ آئی اور نہ ہی خدا ان کے کسی کام آ سکا...... آخری سوال کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ابتدائی سوالوں کے جواب تلاش کئے جائیں۔ مشرق میں خدا تک پہنچنے کا صحیح رستہ نہیں اپنایا گیا...... شارٹ کٹ مارنے کی کوشش کی گئی...... اور اپنے تئیں خدا کو پا لینے کے بعد مادی اور محدود دنیا کے علم سے بیگانہ ہو کر آج پس ماندگی کی عبرت ناک تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ فطرت اور اس کے قوانین کو نہیں سمجھا۔ ہر چیز کی تخلیق اور ہر ہونے والے واقعہ کو بڑی سادگی سے دیوی، دیوتاؤں، خدا یا اس کے کارندوں کے کھاتے میں ڈال دیا اور خود مادی دنیا کے علم سے محروم رہ گئے۔ جسم اور عقل کی بجائے روحانیت پر زور دیا، چنانچہ تاریخ کو بنانے کے عمل میں اپنے کردار سے ہی محروم ہو گئے جب کہ مغرب کی روایت میں عقل پرستی کو اولیت حاصل رہی ہے۔ وہاں پر عقل کو ہی فطرت کے سمجھنے کا دروازہ سمجھا گیا۔ چنانچہ فطرت ان کے سامنے راز کھولتی چلی گئی اور وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے چلے گئے۔ مشرق میں مذہبی پیشوائیت نے یا تو مادی دنیا کو 'مایا'' قرار دے دیا یا پھر عارضی ٹھکانہ۔ ذرے کے علم سے تو ناواقف رہے اور روح کائنات کی باتیں کرتے رہے۔ مشرق کے ایک طرح کے مذہب نے یا تو خدا کو انسان جیسا ہی ''بندہ'' بنا دیا یا پھر دوسری طرح کے مذاہب نے اسے حرکت، تغیر اور لامحدودیت میں اتنی دور جا کر سمجھنے کی کوشش کی کہ جو دنیا ان کے سامنے تھی، وہ اپنی حقیقت ہی کھو بیٹھی۔

تصوف اور خدا!

خدا کو پانے اور اس کائنات کے ساتھ اس کے رشتے کو سمجھنے کے لئے انسانی شعور ایک اور موڑ پر پہنچا، جسے تصوف کہتے ہیں۔ یہ انسانی شعور کی بڑی ہی لطیف (Subtle) داخلی کیفیت کا نام ہے جس میں انسان ایک ایسے روحانی اور وجدانی تجربے سے گزرتا ہے، جس میں ساری کائنات اپنے مادی اور روحانی معنوں میں ایک ایسے وجد انگیز نقطے پر سمٹ آتی ہے کہ اس میں اشیاء کی انفرادی حیثیت کے کوئی معنی نہیں رہتے اور صوفی لامحدودیت (Infinity) کے بحرِ بیکراں کے بہاؤ میں خود کو گم کر دیتے ہیں، جس میں ''میں'' رہتی ہے نہ ''تو'' صوفی کی فکر و نظر پوری کائنات کو محیط کر لیتی ہے۔ اس میں مادہ و روح، جمادات و نباتات، ارض و سماء اور حیات و کائنات کی تمام شکلیں ایک ہی رنگ کے مختلف روپ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انہیں خدا ہر ذرے میں نظر آنا شروع ہو جاتا ہے بلکہ ہر ذرہ...... خدا ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وحدت الوجود کا ایک پر اثر فلسفہ ایجاد ہوا۔ خدا...... جس پر مروجہ مذاہب اپنے حقوق ملکیت محفوظ کر چکے تھے اور اسے مختلف نام اور روپ دے کر آپس میں بانٹ لیا تھا، خالق اور مخلوق کی دوئی میں خدا محدود اور شخصی نوعیت اختیار کر چکا تھا۔ خدا کے ساتھ انسان بھی تقسیم ہو گئے۔ مذاہب نے لوگوں میں خدا کے نام کے ''بت'' بانٹ دیئے اور توہم پرستی پیدا کر کے ان کا خوب استحصال کیا...... اپنی اپنی عبادتیں، رسومات، مقدس کردار اور مقامات وجود میں آئے۔ ایسے میں کسے صحیح کہا جائے۔ ہر عقیدے کے نزدیک اس کا ''مال'' اصلی تھا اور دوسرے کا بالکل باطل...... اس صورت حال میں صوفی آگے بڑھتا ہے اور ''خدا'' کو گروہی اور انفرادی ملکیت کے شکنجے سے باہر لاتا ہے۔ اب خالق اور مخلوق الگ الگ ہستیاں نہیں رہتیں۔ خدا ہی کائنات بن جاتا ہے اور کائنات ہی خدا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوفی ازم خدا کے نام کی دکانداریوں پر ضرب کاری ثابت ہوا۔ وہ مذہبی بنیادوں پر منقسم اور فرقوں میں بٹی انسانیت کو یکجا کرنے کی ایک کوشش تھی جس سے صوفیانہ طرز فکر ملائیت سے براہ راست متصادم ہوئی (ملائیت کی اصطلاح یہاں پر تمام مذاہب کی مذہبی پیشوائیت کی علامت کے طور پر استعمال کی گئی ہے اور اسے ایسا ہی سمجھا جائے) ملا خدا کو نہایت چھوٹا کر کے اسے انسانی سطح کی حرکتوں پر لے آتا ہے۔ انسانی سطح کے تمام احساسات و جذبات اور انسانی طور طریقے خدا کی ہستی سے منسوب کر دیئے جاتے ہیں جب کہ صوفی کا خدا زمان و مکاں کے لامحدود امکانات میں بستا ہے۔ خالق اور مخلوق جب دو الگ الگ وجود نہ رہے...... تو سوال پیدا ہوتا ہے، پوجا کس کی اور پجاری کون......؟ کون کسے سجدہ کرے؟ خدا

لامحدود ہوا تو ساری انسانیت بھی ایک ہوگئی۔ جب اپنے اندر خدا پالیا، تو نام ونمود، بڑائی، خودغرضی، مال وحشم سب ہیچ اور ثانوی چیزیں بن گئیں۔ چنانچہ صوفیوں نے خود کو تمام جبلی اور غیر جبلی مفادات سے مبرا کر لیا۔ اس کے مقابلے میں روایتی مذہبی پیشوائیت نام ونمود، جاہ وحشم، مال ومتاع اور انا وتکبر میں سرتاپا ڈوبی ہوتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ملا عام طور پر بادشاہوں اور حکمرانوں کے قریب رہے ہیں۔ طاقت وروں کے مفادت کے مطابق مذہبی تاویلات پیش کرنا ان کا شیوہ رہا ہے۔ ملاؤں کی ذات کے قریب ہوکر اگر روزمرہ معاملات میں ان کے رویوں کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ غرض کے پتلے نظر آئیں گے۔

ان کے مقابلے میں صوفی ''میں'' کا نہیں ''تو'' کا شیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہے۔ ملائیت کا صوفیوں سے دوسرا ٹکراؤ اس بات پر ہوا کہ ملاؤں کے نزدیک مذہب طے شدہ قوانین اور ناقابل تغیر رسومات کا نام ہے۔ اس طرح کا رویہ انسان کی ذہنیت کو محدود کر دیتا ہے اور اس سے وسیع النظری چھین لیتا ہے۔ ملاؤں کی انھی عقیدہ پرستیوں اور اندھی تقلید پسندیوں کی وجہ سے صوفی بے اختیار کہ اٹھے کہ علموں بس کریں اور یار...... کہ وہ علم جو انسان کو محدود کر دے اور خدا کو ہی تقسیم کر دے، وہ علم کس کام کا۔ جب ''میں'' اور ''تو'' ایک ہوگئے تو ظاہر ہے خدا کے ساتھ رشتہ اب ڈر کی بنیاد پر نہیں رہے گا، چنانچہ صوفیوں نے خدا کے ساتھ رشتہ خوف کی بجائے عشق پر استوار کیا۔ عشق بڑے بلیغ معنی پیدا کرتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ جدا بھی ہے اور دوسرے کے ساتھ کشش میں جڑا ہوا بھی۔ گویا یہ کائنات عشق کے رشتے کے ساتھ ایک دوسرے سے بندھی ہوئی ہے۔ اس لئے صوفی کو ہر طرف خدا ہی نظر آتا ہے اور وہ خدا کے ساتھ اپنی اس یکتائی کو محسوس کر کے انتہائی انبساط انگیز کیفیت (Ecstasy) میں ڈوب جایا کرتے۔ عشق کے رشتے کی وجہ سے ہی صوفی خدا کو ''یار'' کہتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کے ساتھ روایتی رشتہ مطلق العنان بادشاہ کے مصاحبوں جیسا ہوتا ہے جس میں بادشاہ کی خوشنودی کے لئے خوب چمچہ گیری کی جائے، ثناخوانی کے پل باندھے جائیں، اس کے نام کی مالا جپی جائے، ذاتی مفادت کی بات ہو تو خدا کو جل دے دیا جائے۔ ناراض خدا کو خوش کرنے کے لئے آسان اور ریڈی میڈ قسم کے نسخے موجود ہوتے ہیں۔ کچھ مقدس الفاظ دہرا لئے، کوئی رسم ادا کر دی، کچھ اضافی پوجا کر لی چنانچہ خدا کے ساتھ تعلقات کمرشل صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر نیک کام کے بدلے مقرر کردہ شرح کے حساب سے ثواب کا فوری حساب کتاب کر لیا جاتا ہے جب کہ صوفی کا عمل عشق کی بنیاد پر ہونے کی وجہ سے کسی لین دین اور غرض سے بالا ہوتا ہے۔

تصوف اپنے جوہر میں مذہبی ہی تھا۔ صوفیوں کا بنیادی مقصد براہ راست صداقت کا باطنی تجربہ تھا۔ صوفی ازم میں زبان اس تجربے کو بیان کرنے کے لئے مسئلہ بن جاتی ہے لہٰذا وہ شاعری، علامتوں اور اپنے اردگرد موجود متھوں (مقبول عام قصوں) کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے کرداروں کو استعمال کر کے اپنے روحانی معنوں کا اظہار کرتے ہیں۔ صوفی حقیقت کے تجربے کو محسوس کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے، اسے بیان کرنے میں نہیں کیونکہ وہ اپنے اندر جو محسوس کرتے اس کا تجزیہ کر کے دکھا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ معرفت کا سارا عمل مکمل طور پر داخلی اور ذاتی سا تجربہ بن کر رہ جاتا ہے۔ جو دیگر لوگوں کی رسائی سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے عام لوگ صوفیوں کو ''پہنچے ہوئے بندے'' سمجھنے لگے اور انہیں بھی کسی نہ کسی شکل میں پوجنا شروع کر

دیتے۔ ملائیت اور صوفی ازم میں ایک اور فرق یہ ہوتا ہے کہ صوفی ''اندر'' کا ذکر بہت کرتے ہیں، ان کا سارا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ تبدیلی انسان کے مرکزے (Nucleus) میں واقع ہو جب کہ ملائیت کے پاس سوائے ''ظاہرداری'' کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہاں ظاہری پاک بازی، ظاہرانہ عبادت اور ظاہری رسومات، ظاہری کردار اور حلیے کو دیکھ کر انسان کے بارے رائے قائم کی جاتی ہے۔

تصوف کے موضوعات بھی فلسفے سے ملتے جلتے رہے ہیں یعنی خدا کی فطرت و نوعیت کیا ہے اور خیر و شر کے مسائل۔ تصوف کسی نہ کسی شکل میں تمام مذاہب میں موجود رہا ہے۔ اسے عمومی طور پر عوام میں بڑی مقبولیت ملتی رہی ہے۔ جب لوگ جبر کے حالات سے گزر رہے ہوتے ہیں تو تصوف کی شکل میں انہیں امید اور نئے معنے میسر آتے ہیں۔

مسلم تصوف

وفات رسول اللہ ﷺ کے بعد امت مسلمہ پارہ پارہ ہوگئی۔ ایک گروہ عرب قوم پرستی کے زیر اثر قبائلی اصل نسب اور خاندانی رشتے ناطوں کی بنیاد را پنے سیاسی مفادات کو مضبوط کرنے میں لگ گیا، مذہبی سطح پر وہ سنت رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے دعوے دار تھے۔ دوسرا گروہ زیادہ تر غیر عرب افراد پر مشتمل تھا۔ وہ اپنے قبل از اسلام ثقافتی ورثے سے متاثر تھے، وہ خاندان رسول اللہ ﷺ کے کچھ افراد کے ساتھ شخصی تقدس کی بنا پر ان کے قریب ہوگئے۔ امت مسلمہ میں اپنے اپنے مفادات کے لئے اقتدار کی لڑائیاں شروع ہوگئیں اور مذہب کا روحانی عنصر غائب ہوگیا۔ مساوات پر مبنی معاشرے کی بجائے مذہب کے نام پر ملوکیت کا دور چل پڑا۔ ایسے حالات میں ''زاہدوں'' کا ایک گروہ ابھر کر سامنے آیا جنہیں مذہب کے نام پر مفادات کی مذکورہ بالا لڑائیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے نہ صرف خود کو ان تمام خارجی جھگڑوں سے الگ تھلگ کر لیا بلکہ خود کو ایک باقاعدہ جماعتی شکل دینے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ ''حق'' کو پانا چاہتے تھے اور اسی کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر دیا۔

تصوف کے ارتقاء کے اولیں ایام میں صوفی راتوں کو جاگتے، تنہا اور خاموشی کی حالت میں بیٹھتے، کھانے پینے سے گریز اور خدا کے کسی اسم کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ راہ حق میں صوفی سنت اور سادھو اس دنیا کے معاملات اور مادی خواہشات سے خود کو الگ تھلگ کر لیتے تھے، اس لئے کہ معاشرہ مکمل طور پر ان قوتوں کے ہاتھوں میں جا چکا ہوتا تھا جنہیں اپنے دنیاوی مفادات کے علاوہ کوئی قدر عزیز نہیں تھی۔ مذہب کا ادارہ بھی انہی حاکم قوتوں کا مطیع ہو چکا ہوتا تھا۔ ہر سطح پر مفادات اور اقتدار کا حصول ہی دستور حیات بن چکا ہوتا، تب ذہین اور اہل دل افراد معاشرے سے خود بخود کٹ جاتے اور وہ ''راہ حق'' یعنی زندگی کے نئے معنوں کی تلاش میں نکل پڑتے۔ البتہ یہ بات تجزیہ طلب ہے اور متعلقہ دانشوروں کو اس پر تحقیق کرنی چاہیے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ مغرب میں معاشرہ جب فکری جمود اور اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوا تو وہاں ایسے مفکر، فلاسفر اور سائنس دان

پیدا ہوئے جو اپنے معاشروں میں فکری ارتعاش پیدا کر کے انہیں متحرک کر دیتے اور وہ قومیں اپنی فکری و مادی زندگی میں تجدید نو کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتیں۔ جب کہ مشرق کی روایت اس کے برعکس رہی۔ وہاں ''حق'' کو خارج میں نہیں، اپنی ہی ذات کے حصار میں پانے کی کوشش کی گئی۔ کوئی فکری اور معاشرتی تبدیلی پیدا کرنے کی بجائے دست برداری اور مجہول (Passive) کرداروں کی تصویر بن جاتے۔ صوفیوں (جو بنیادی طور پر مفکر تھے) نے مادی دنیا اور انسانی رشتوں کے اندر رہ کر کوئی ایسا سرگرم فلسفہ نکالنے کی کوشش نہیں کی تا کہ ان وجوہات کا خاتمہ ہو سکے جن سے ان کو معاشرے سے الگ تھلگ ہونا پڑا۔ وہ اپنی ذات کی حد تک ''حق'' اور کائنات کے راز کو پا جاتے۔ جس نے فکر انسانی کے لطیف حصوں کو ہمیشہ بے چین کیے رکھا ہے۔ اگرچہ اپنی علامتوں میں اس مروجہ فکری اور مادی نظام کے خلاف صوفی اپنے بھرپور ردعمل کا اظہار بھی کرتے رہے، جس کے نتیجے میں وہ تصوف کی راہ اپنانے پر مجبور ہوئے تھے لیکن اس دنیا کو بدلنے میں کوئی تاریخی کردار ادا نہ کر سکے۔ تاہم عقائد پرست ملائیت اور استبدادی حکمرانوں نے ان صوفیوں کی عوام میں مقبولیت سے کبھی کبھی خوف زدہ ہو کر انہیں ایسی اذیتیں پہنچائیں اور کفر کے وہ فتوے لگائے کہ مغرب میں فلسفے اور سائنس کے خلاف کلیسا کے جبر و تشدد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

صوفیوں کی تعلیمات میں جو ممتاز نکات نظر آتے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1- شخصی تصور خدا کے مقابلے میں لامحدود خدا کا تصور، خدا اور کائنات کی یکجائی۔ جس کے نتیجے میں انسان کے درمیان بھی تمام تفریقات باطل قرار پاتی ہیں۔

2- تصوف انسان اور خدا کے درمیان خوف کے رشتے کو ختم کرتا ہے اور خدا کو انسان کا ''محبوب'' قرار دیتا ہے۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو میکانکی اور رسمی عبادات کی جاتی ہیں، تصوف ان کے بارے برملا ناپسندیدگی کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔

3- انسان کی ''میں'' کو ختم کر کے ''تو'' میں بدل دیتا ہے۔ انسانی معاشروں کو اناؤں کے ٹکراؤ نے جو برباد کیا ہوا ہے اور ایک دوسرے کی صحت مندانہ نشوونما کے رستے میں جو رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی ہیں۔ تصوف انہیں منہدم کرتا ہے۔ انسان ''میں'' کی آبجو سے نکل کر ''تو'' کے بے کنار سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے جہاں اس دنیا کا ہر ذرہ اور ہر فرد بلا امتیاز عقیدہ اسے اپنا نظر آتا ہے۔ سب کے اندر اسے اپنے محبوب (خدا) کی جھلک دکھائی دے رہی ہوتی ہے جب کہ روایتی عقائد انسانیت کو ''میں'' اور ''تو'' میں تقسیم کرتے ہیں اور مخالف عقائد کے لوگوں کی دنیا و آخرت کے برباد ہو جانے کی دعائیں کرتے ہیں۔

4- تصوف میں اس دنیا اور زندگی کے فانی ہونے پر بہت زور پایا جاتا ہے۔ دراصل یہ بھی اس معاشرتی نفسیات کے خلاف ردعمل تھا جس میں اپنے انفرادی مفادات کی پوجا ایسے کی جاتی ہے یہ دولت، دنیا اور سانسوں کا رشتہ ابدی ہے گا۔ زندگی کے عارضی پن طرف توجہ دلا کر وہ لوگوں کے دلوں سے خود غرضی کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے، اور فطری حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے تھے، جس میں وجود اور عدم کا جدلیاتی رشتہ ہر لحظہ کائنات کے اندر چل رہا ہے۔

5- تصوف میں خدا اور حسن کو ایک ہی قرار دینے میں بھی بڑی گہری معنویت ہے۔ خدا کو حسن کی علامت قرار دینے سے اس کی شخصی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک تجریدی خیال میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیوں کا خدا کے ساتھ رشتہ عابد اور معبود کا نہیں تھا بلکہ ایک طرف صورت خدا حسن تھا اور دوسری طرف عشق۔ حسن سے ڈرا نہیں جاتا، اس سے صرف محبت ہی کی جا سکتی ہے۔ عشق کا رشتہ کسی طرح کی غرض اور مفاد کے خیال سے بے نیاز ہوتا ہے۔ جب کہ روایتی مذہب کے ہاں خدا کی عبادت کا سارا تصور یا تو اجر و ثواب کے لئے ہے یا پھر برتر طاقت کی طرف سے عائد کردہ فریضہ (Duty) جس پر اگر عمل نہ کیا گیا تو عبرت ناک سزا کا سامنا کرنا ہوگا۔ صوفیوں نے خدا کے ساتھ اس طرح کے رشتے کو ہمیشہ مضحکہ خیز قرار دیا ہے۔

تصوف کے ابتدائی دور میں صوفیوں کو بھی جنت کی امید تھی اور دوزخ سے ڈرا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ خدائی تادیب کا خوف خدا کے ساتھ محبت میں بدل گیا اور تصوف کے ارتقاء کے اگلے مرحلے پر جو صوفی آئے، ان کی درویشی میں خدا کے ساتھ عشق و محبت کا عنصر انتہائی نمایاں حیثیت اختیار کر گیا۔ اب وہ اس بات پر زور دینے لگے کہ خدا کی عبادت کا مقصد جہنم کی آگ کا خوف ہے اور نہ بہشت کی امید...... بلکہ یہ اس احترام اور محبت کے نتیجے میں ہے جس کی حقیقت اعلیٰ جبلی طور پر مستحق ہے۔ اس فکر کے داعیوں میں رابعہ بصریؒ، بایزید۔ سطامیؒ اور شبلیؒ نمایاں تھے۔ تصوف اندرونی استغراق اور خدا کے ساتھ ایک ہونے کا تجربہ ہے۔ صوفی اس عشق و مستی کے احساس میں بے خود ہو جایا کرتے تھے۔ محبت چونکہ ضابطوں اور قوانین کی پابند نہیں ہوتی، چنانچہ اکثر صوفیوں کا شریعت سے ٹکراؤ پیدا ہو گیا اور کٹر پرست، صوفیوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ امیہ اور عباسیہ ادوار کے حکمرانوں نے دولت اور طاقت کا ارتکاز اس قدر کر دیا تھا کہ اس کے رد عمل کے طور پر صوفیوں کی تحریک زور پکڑ گئی۔ انہیں دنیاوی اموال سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ اون کے موٹے اور کھردرے لباس استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ انہیں صوفی (صوف عربی میں اون کو کہتے ہیں) کہا جانے لگا۔ اس دور میں بڑے بڑے مسلمان مفکر اور سائنس دان بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے خدا اور کائنات کا دانش ورانہ علم حاصل کرنے کے لئے عقل اور خرد افروزی کو اپنا رہبر قرار دیا۔ ایک طرف سائنسی خیالات کا ابھار اور دوسری طرف صوفیوں کی عقائد پرست (Dogmatist) ملاؤں کی شریعت سے بغاوت پر استحصالی حکمران اس قدر پریشان ہو گئے کہ صوفی منصور حلاج کو بغداد شہر کے چوراہے پر اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے شہید کر دیا گیا، حالانکہ ''انا الحق'' کہہ کر وہ خود کو حق کے حوالے کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ سب کچھ ہی خدا ہے (God is All) یہ معرفت کی انتہائی شکل تھی۔ حلاج اپنے وقت کا بہت بڑا عالم صوفی تھا۔ اس نے عیسائیت، ہندوازم اور بدھ مت کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو شمع اور پروانے جیسا رشتہ قرار دیا کرتا تھا۔

1273ء میں ادھر ایک اور صوفی شاعر جلال الدین رومی افغانستان میں پیدا ہوئے لیکن وہ ترکی کے شہر اناطولیہ میں جا بسے۔ وہاں انہیں ایک استاد صوفی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جلال الدین رومی نے خدا کے عشق میں بے حد رومانی تاثر پیدا کرنے والی شاعری کو جنم دیا۔ رومی نے صوفی درویشوں کی ایک ایسی جماعت تشکیل دی جنہیں رقاص درویش (Darwishes Whirling) کہا جاتا ہے۔ وہ اک پرسوز (موسیقی) کی دھن پر عشق خدا کے جنون میں دائرہ بنا کر وجد

آفریں رقص میں یوں مشغول ہو جاتے کہ ان کے گھیرے دار کھلے لباس گرداب کی صورت ہوا میں لہرانے لگتے۔ دائرے کے مرکز میں خود شیخ رومی ہوا کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کی راتوں کا اسی ''سوز و ساز رومی'' میں بسر ہونے کا ذکر کرتے ہیں جب کہ خدا کے ساتھ ملا لوگوں کے مصنوعی، میکانکی اور مفاداتی رشتے کو نہ کسی سوز اندروں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کسی ساز آہنگ کی حاجت۔

اسپین کے ایک مشہور صوفی ابن عربی (1165-1210ء) جو مذہبی علوم کے بہت بڑے ماہرین خیال کئے جاتے تھے۔ انہوں نے تصوف میں نسوانی عنصر کو فروغ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا کو عورت کے روپ میں دیکھنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اسے کسی اور چیز کے تصور میں۔

To See God in Woman is More Perfect Than Seeing the Divine in any Other Forms.

ابن عربی کے نظریہ کائنات میں محبت بنیادی عنصر کی حامل تھی، چنانچہ وہ تمام مذاہب کے بارے رواداری کی شدت سے حمایت کرتے تھے کیونکہ ان کے نظریئے میں وجود (خدا بشمول کائنات) ایک ہی ہے۔ اس کائنات کی کسی بھی شکل اور صورت کو خدا سے جدا نہ قرار دیا جا سکتا ہے، نہ ہی اسے الگ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ خدا کے ساتھ جب رشتہ عشق ٹھہرا تو خدا کا تصور ایک مطلق العنان بادشاہ سے دوسری انتہاء یعنی انسانی محبوب کے خدوخال میں ڈھل گیا، چنانچہ صوفیانہ عشقیہ شاعری خدا کے ساتھ اظہار محبت میں ان تمام علامتوں سے بھری پڑی ہے جن سے انسانی سطح پر اک فرد محبوب کے بارے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔ رخ، زلف، خط، مست چشم، ابرو، لب، شراب، جام، ساقی، بحر، خرافات، مے خانہ، بت وغیرہ وغیرہ۔ ایسے لگتا ہے ملاؤں کے تجویز کردہ اس شرعی معاشرے کے خلاف یہ ایک نفسیاتی ردعمل تھا جو انسان کے فطری اور جبلی لطیف جذبات کے اظہار پر کڑی پابندی لگا کر شدید گھٹن پیدا کر دیتا ہے۔ مذہبی خیالات زندگی اور اس کے تقاضوں سے نفی پر مجبور کرتے ہیں۔ ملائیت ان تمام جمالیاتی پہلوؤں اور لطیف جذبات سے نفرت کی ترغیب دیتی ہے جو انسانی حیات کو پرمسرت بنائیں اور اس میں کشش پیدا کریں۔ اس میں مقصد حیات اس زندگی کے لطائف کے بدلے (Fantasies) سے بھری بعد از موت ابدی زندگی کے لالچ میں رکھ دی جاتی ہے۔ جس میں تمام دنیاوی وجبلی خواہشات کی انتہائی پیمانے پر تکمیل ہوگی۔ چنانچہ ملائیت زندگی کی لطافتوں اور جمالیاتی حسوں کو مکمل طور پر تباہ کرنے پر تلی ہوتی ہے۔ تصوف میں مسئلہ یہ تھا کہ وہ معمول کی زندگی سے کنارہ کش تھے، چنانچہ صوفی اپنے تصور خدا میں روایتی مذہب کی ممنوعہ اصطلاحوں کے ساتھ انسانی جمالیاتی حسوں کا برملا اظہار کرتے رہے، جس کا مطلب روایتی مذہب کی شدت پسندیوں سے بغاوت تھا۔ تصوف میں یہ بغاوت جب دوسری انتہا کو پہنچی تو صوفیوں کا ''ملامتی فرقہ'' ابھر کر سامنے آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا کی بہترین عبادت اس وقت ہو سکتی ہے جب عبادت گزار کو اپنے ہی ہم عقیدہ لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اپنی اس دلیل کو حق بجانب قرار دینے کیلئے انہوں نے روایتی مذہب کی تجویز کردہ تمام رسومات اور ضوابط کی کھلے عام روگردانی کو اپنی زندگی کا شیوا بنا لیا۔ ان کا مقصود تھا کہ عشق خدا میں انہیں دنیا کی کسی رائے اور لعنت ملامت کی پروا نہیں۔ اگرچہ یہ انتہا پسندانہ رویہ تھا جس نے تصوف کی تحریک کو نقصان بھی

پہنچایا لیکن مذکورہ عمل، شدت احساس کے مارے لوگوں کی مروجہ ناپسندیدہ نظام کے خلاف انتہائی بے بسی کی دلیل تھی کہ جس قدر دنیا کی لعنتیں ان پر برستی ہیں اتنا ہی وہ محسوس کرتے ہیں کہ نہ صرف وہ حق پر ہیں بلکہ اس پر ثابت قدم بھی ہیں۔

صوفیوں کے چند نمائندہ اقوال پیش خدمت ہیں جن سے ان کی ذہنی کیفیت کا بھی پتہ چلتا ہے اوا س کا بھی کہ ان کا تصور خدا روایتی مذہبی نقطہ نظر سے کس حد تک مختلف تھا۔

حسن البصری (728-692ء) کے نزدیک ''تقویٰ'' یعنی کریکٹر، صوم صلوۃ دونوں سے زیادہ ارفع ہے۔ انہوں نے ایک دفعہ کہا ''نیک راستی (تقویٰ) کا ایک چھوٹا سا دانہ ہزاروں من نمازوں اور روزوں سے بہتر ہے۔''

شبلیؒ نے ایک بار کہا، موت تین طرح کی ہوتی ہے۔ اس دنیا کی محبت میں، اگلی دنیا کی محبت میں اور خدا کی محبت میں۔ جو اس دنیا کی محبت میں مرتے ہیں، وہ منافق ہوتے ہیں۔ اگلی دنیا کی محبت میں مرنے والے زاہد جب کہ خدا کی محبت میں مرنے والے عارفین ہوتے ہیں۔

رابعہ بصریؒ خدا سے یوں مخاطب ہوتی ہے ''مجھے تمہاری عظمت کی قسم! میں تمہاری ثنا اس لئے نہیں کرتی کہ مجھے جنت کی خواہش ہے یا دوزخ سے ڈر لگتا ہے بلکہ میں تم سے محبت اور تمہاری تحسین، تمہاری رفعت اور شوکت کے مدنظر کرتی ہوں۔'' غور کیجئے خدا کی حمد کا یہ انداز ملائیت سے کس قدر مختلف ہے جس میں چمچہ گیری اور چاپلوسی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ جب کہ صوفی کے جذبات ایک سائنس دان سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں جو اس لامحدود کائنات کے حیران کن سلسلوں کو دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں۔

رابعہ بصریؒ سے ایک دفعہ پوچھا گیا ''کیا تم خدا سے محبت کرتی ہو؟'' اس نے جواب میں کہا ''ہاں'' اور جب اس سے شیطان کے ساتھ نفرت کرنے کے بارے استفسار کیا گیا تو رابعہ کا جواب تھا ''خدا کی محبت میں مجھے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ میں شیطان پر لعنتیں بھیج سکوں۔'' یہاں رابعہ کتنا بڑا فلسفہ پیش کرتی نظر آتی ہے جو ملائیت کے نظریہ مذہب سے کس قدر مختلف ہے۔ ان کا سارا وقت برائی کی خیالی علامت شیطان کو برا بھلا کہنے میں گزرتا ہے اور بظاہر ہر آن ''برائی'' کے خلاف مصروف پیکار نظر آتے ہیں لیکن رابعہ کا کہنا ہے کہ انسان اگر ہمہ وقت مثبت اقدار (خدا) سے خود کو وابستہ رکھے گا تو منفی اقدار (شیطان) کا خاتمہ خود بخود ہو جائے گا۔ انسان کو اپنی ساری توجہ مثبت اقدار کی تعمیر اور ان پر عمل درآمد کرنے میں صرف کرنی چاہیے۔ صوفیوں کا پیغام محبت تھا، وہ کسی سے نفرت نہیں کرتے تھے، برائی سے بھی نہیں کہ ان کی نظروں کے سامنے وہ مخصوص تناظر اور عوامل ہوتے تھے جن سے کوئی برائی جنم لیتی ہے اور دوسرے ایک زاویئے سے جو چیز ''برائی'' دکھائی دے رہی ہے وہ عین ممکن ہے کسی دوسرے زاویئے سے ''اچھائی'' ہو...... چنانچہ کسی عمل کو واقعتاً شیطانی قرار دینے سے پہلے اس پوری کائنات کا علم درکار ہوگا...... دوسری صوفیوں کی دلیل تھی کہ شیطانی اعمال کو خدا کے نظام قدرت سے باہر کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا خدا کی خدائی سے باہر کوئی چیز وجود رکھتی ہے؟ حد یہ تھی کہ رابعہ سے جب اس کی شادی کے بارے پوچھا گیا۔ تو اس نے کہا ''شادی...... ایک وجود سے معاہدے کا نام ہے اور یہاں ''وجود'' غائب ہے!'' جب فکر کی گہرائی کی حد یہ ہو کہ اس کائنات کے سلسلوں (خدائی)

میں خود اپنی ذات جدا نظر نہ آ رہی ہو وہاں شیطان اپنی آزادانہ ہستی میں کہاں نظر آئے گا۔ وہ تو کائنات کے لاانتہا باریک ریشوں اور سلسلوں میں گندھا ہوگا۔ کیا مثبت بار کو منفی بار سے جدا کیا جاسکتا ہے؟

رابعہ نے ایک دفعہ کسی کو تین اشیاء بھجوائیں۔ موم کا ٹکڑا، سوئی اور بال اور ان کی تشریح یوں کی۔ موم کے ٹکڑے کا مطلب ہے ''اس دنیا کو روشن کرو اور خود موم کی طرح جل جاؤ۔''

سوئی کا مطلب روحانی کام میں یوں مشغول رہو، جیسے سوئی سینے کے کام میں کہ سوئی نہ صرف خود اپنے تخلیق کردہ لباس سے بے نیاز ہوتی ہے بلکہ شکل سے بھی بانجھ معلوم ہوتی ہے۔ (یعنی تخلیق کار کے اندر کوئی تکبر، غرور اور تصنع نہیں ہونا چاہیے؟ اسے سوئی کی طرح بانجھ اور بے ثمر دکھائی دینا چاہیے۔)

''اور جب مندرجہ بالا دو خصلتیں پالو تو پھر بال کی طرح بن جاؤ......'' یعنی اتنے چھوٹے ہو جاؤ کہ خود کو نہ دیکھ سکو تا کہ تمہارے اندر تکبر اور غرور پیدا نہ ہو اور تمہارا کام ضائع نہ ہو جائے۔

ایک دفعہ رابعہ نے کسی کو چار درہم دیئے اور اسے کمبل خرید کر لانے کو کہا تو اس نے پوچھا۔ ''سفید لاؤں یا کالا؟'' رابعہ نے بے ساختہ کہا ''لو! کمبل ابھی خریدا نہیں گیا کہ اس کا رنگ وجہ اختلاف بن گیا ہے......! پیسے واپس دے دو، مجھے نہیں چاہیے۔'' اندازہ لگائیے کہ صوفیوں کا شعور کس قدر نازک خیالی تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ فطرت کے سارے عمل کو اتنی ہی باریک بینی اور گہرائی سے دیکھ رہے ہوتے تھے جس طرح ایک طبعیات کا عالم ایٹموں اور سالموں کی خوردبینی دنیا کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے۔

ایک بار کچھ مشہور مذہبی علماء رابعہ کو ملنے آئے، رابعہ نے ان سے پوچھا ''آپ خدا کی کیوں عبادت کرتے ہیں؟'' ایک نے جواب دیا ''اس لئے کہ دوزخ کی سات پرت ہیں، جس میں سے ہر ایک پر صدمے اور دہشت کی حالت میں گرایا جائے گا۔'' دوسرے نے کہا ''جنت میں اعلیٰ قسم کے خوبصورت گھر ہوں گے جہاں سلامتی اور امن کی مکمل ضمانت ہوگی۔'' رابعہ نے کہا ''صرف برا غلام ہی اپنے آقا کی سزا سے ڈر کر یا اس کے انعام کے لالچ میں خدمت کرتا ہے۔'' انہوں نے حیران ہو کر رابعہ سے پوچھا ''کیا تم کوئی طمع نہیں رکھتی؟'' رابعہ نے جواب دیا۔ کیا اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ہمیں اس کی عبادت کے لئے کہا گیا ہے۔ کیا ہم خدا کی حمد وثناء کرنا بند کر دیں گے اگر جنت اور جہنم کا وجود ختم ہو جائے گا۔ کیا خدا کے ساتھ بلامشروط محبت نہیں ہو سکتی۔

رابعہ سے پوچھا گیا ''کیا تم جس کی عبادت کرتی ہو، اسے تم نے سچ مچ دیکھا ہے؟'' رابعہ کا جواب تھا ''میں اس کی کبھی عبادت نہ کرتی...... جب تک میں اسے دیکھ نہ لیتی۔'' ایک بار ادائیگی حج کے دوران رابعہ نے کعبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''کیا یہی وہ گھر ہے جسے اس زمین پر معبود بنا لیا گیا ہے۔ جہاں خدا کبھی داخل ہوتا ہے نہ اس سے باہر نکلتا ہے۔'' شخصی تصور خدا کے جو جو شاخسانے ہیں اس پر ایسا تبصرہ صرف صوفی ہی کر سکتا ہے۔

''اونچی اونچی آوازوں میں خدا سے مغفرت طلب کرتی کہ اے خدا! ہمیں معاف کر دے، ہم پر رحم فرما...... منافقوں کا کام ہے، وہ توبہ کرتے ہیں، ایک اگلی توبہ کے لئے تا کہ توبہ کی توبہ پر ایک اگلی توبہ کی جائے۔'' رابعہ کی اس

بات پر کسی نے کہا ''دروازہ تو اسی کے لئے کھلے گا جو اس پر دستک دے گا۔'' یہ سن کر رابعہ نے جواب دیا ''تم یہ کب تک ایسے کہتے رہو گے...... کیا دروازہ کبھی بند بھی ہوا ہے؟'' رابعہ کا ایک قول تھا ''اپنی ذاتی صفات کو بھی یوں ہی پوشیدہ رکھو، جیسے تم اپنی برائیوں پر پردہ ڈالتے ہو۔''

جب رابعہ کو بتایا گیا کہ بغداد کے گورنر کی ایک دن کی کمائی آٹھ ہزار درہم ہے تو اس نے کہا ''ایک شخص کے پاس ساری دنیا بھی اس کے نام کیوں نہ ہو جائے وہ امیر نہیں ہو سکتا'' پوچھا ''ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟'' جواب تھا ''چونکہ یہ دنیا فانی ہے اور گزرتی چلی جاتی ہے...... یہ کسی کی ہو ہی نہیں سکتی۔''

ایک بار رابعہ سے محبت کے بارے کوئی خاص بات بتانے کو کہا گیا تو اس نے جواب دیا کہ ''عاشق اور محبوب کے درمیان کوئی تفریق (Seperation) وجود نہیں رکھتی۔''

اور آخر میں رابعہ کا وہ مشہور و معروف واقعہ پیش خدمت ہے جو روایتی تصور مذہب پر بڑی زبردست چوٹ ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ رابعہ ایک دن ایک ہاتھ میں شمع اور دوسرے ہاتھ میں پانی کی بالٹی اٹھائے بھاگے جا رہی ہے۔ لوگوں نے پوچھا، ''رابعہ تم کہاں جا رہی ہو؟'' اس نے جواب دیا ''میں جنت کو آگ لگانے اور دوزخ کی آگ بجھانے جا رہی ہوں کہ کوئی خدا کی عبادت یا خدمت جنت کی امید اور جہنم کے خوف کے بغیر نہیں کرتا۔'' دیکھئے رابعہ انسان اور خدا کے درمیان مروجہ عقائد کے تعمیر کردہ لالچ اور خوف کے اداروں کو ہی تباہ کر دینا چاہتی تھی، جس نے انسان اور خدا، دونوں کو مقام سے گرا دیا ہوا ہے۔

نظریۂ ہمہ اوست (وحدت الوجود) (PANTHEISM)

نظریہ ہمہ اوست سابقہ ابواب مشرقی مذاہب اور تصوف کی ہی ایک کڑی ہے۔ اس میں خدا اور کائنات ایک ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح خدا کی حیثیت غیر شخصی ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ نظریہ اس قدیم مذہب کا ہی پرتو تھا جس میں فطرت کے مظاہر کو خدائی صفات کا حامل جانا جاتا تھا۔ یہ نظریہ بھی تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ بہت سی حالتوں میں ملتا ہے۔ کچھ سختی کے ساتھ خدا اور کائنات کو مساویانہ جگہ پر رکھ کر دیکھتے ہیں البتہ وحدت الوجود کی انتہائی شکل میں خدا ایک بنیادی حقیقت جانا جاتا ہے جو کائنات کی شکل خود کا اظہار کرتا ہے۔

ایک ماڈل نظریہ ہمہ اوست میں خدا اور کائنات کو واحد اور غیر محدود (Infinite) مواد خیال کیا جاتا ہے اور کائنات کی تمام اشیاء کو حقیقی اور محدود مانا جاتا ہے جو اسی اصلی مواد (خدا) کی ہی اشکال ہیں۔ خدا ابدی قوت یا ''روح'' کائنات ہے۔ کچھ کے نزدیک کائنات یا اس کے اندر تشکل ہونے والی قوتیں خدائے بزرگ و برتر کا جزو ہیں جب کہ خدا بذات خود ماورائے ادراک ہے۔ گویا یہ مادی دنیا خدا کی قطبی فطرت (Polar Nature) کا ناقابل جدا آدھا حصہ ہے۔

قدیم یونان میں Xenophanes بڑا اکٹر وحدت الوجود تھا جو حقیقت (Reality) کو ایک ناقابل تغیر خدائی وجود قرار دیتا تھا اور تغیر پذیر دنیا کو محض اس کا ظہور کہتا تھا۔ حرکیاتی (Dynamic) وحدت الجودیت ہمیں Heraclitus میں نظر آتی ہے۔ وہ خدائی ذات کو اس قانون تغیر کے ساتھ منسوب کرتا تھا جو تمام اشیاء کی فطرت میں خلقاً داخل ہے۔ فلاسفر زینو 3080 ق م) کے ماننے والے رواقی فلسفیوں کی رو سے روح خدا دنیا میں خلقی طور (Inherently) پر شامل ہے اور وہی اس دنیا کی نظم و حرکت کا سرچشمہ ہے اسی لئے ان لوگوں نے خوشی و غم اور درد و مسرت سے بے نیاز رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اسی مکتبہ فکر کے ایک فلسفی اپکٹیٹس کی ایک بار کسی نے ٹانگ موڑنی شروع کر دی، اپکٹیٹس نے اس شخص سے کہا کہ اگر تم میری ٹانگ یونہی مروڑتے رہے تو وہ ٹوٹ جائے گی لیکن وہ شخص باز نہ آیا اور ٹانگ موڑنے کا سلسلہ جاری رکھا...... تا آنکہ فلسفی کی ٹانگ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ٹانگ ٹوٹنے کی کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی، اس کا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن اس سانحے پر اپکٹیٹس نے صرف اتنا کہا ''میں نہ کہتا تھا کہ ٹانگ موڑی جاتی رہی تو ٹوٹ جائے گی اور وہ ٹوٹ گئی......'' اپنی ہی ٹانگ ٹوٹ جانے پر اس قدر سوکھا تبصرہ رواقیت (Stoics) کے فلسفے کے عین مطابق تھا۔ جس میں صرف خیر مقصد حیات قرار دی گئی تھی اور ضبط جذبات کے ساتھ راحت و الم کے احساس سے آزاد ہو جانے کی تلقین کی جاتی تھی کیونکہ راحت ہو یا الم، دونوں کے اندر روح

خدا ہستی ہے۔

ازمنہ وسطیٰ کے بہت سے وحدت الوجودی مذہبی تصوف سے ہی پیدا ہوئے تھے۔ اسپینی مسلم فلاسفر ابن رشد (Averroes) ایمان رکھتا تھا کہ یہ دنیا محدود ہے اور دانش خدا سے ہی پھوٹ کر کائنات میں بہہ رہی ہے جو کہ اعلیٰ ترین دانش کا حامل ہے۔ ریناسانس دور کے بعد وحدت الوجودیت میں صورت پرستی (ماڈل ازم) ایک غالب عنصر اختیار کر گیا۔ Bruno اور Spinoza جیسے فلاسفروں کا کہنا تھا کہ آخری حقیقت وحدت مطلق اور لامحدود مواد (Substance) پر مشتمل ہے جسے مساوی طور پر فطرت اور خدا کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہی مواد (خدائی ذات) جب عالم وجود میں آتا ہے تو وہ اپنے اندر دنیا کی محدود وجودات (Entities) کو اتنی شکلوں میں گھیرے رکھتا ہے جتنی کہ اس کا لامحدود وجود تبدیل شدہ صورتوں (Modifications) میں ڈھل سکتا ہے۔ سپنوزا کے خیالات روشن خیال دور کی رومانیت اور آئیڈل ازم (عینیت پرستی) میں ابھر کر سامنے آئے۔ جرمن کا عظیم شاعر گوئٹے بھی خدا کی تعریف (Definition) فطرت کی تخلیقی قوت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ شوپنہار کی مذہبیت میں خدا غیر معلوم زمین اور تمام اشیاء کی وحدت کا نشان ہے۔ وحدت الوجودی فلسفے سے عالمی ادب ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ ادیب اور شعراء عموماً شعوری اور غیر شعوری طور پر وحدت الوجودی تصور خدا سے متاثر ہو کر لکھتے رہے ہیں۔ عامتہ الناس اور کم تر ذہین لوگوں کا مذہب......سیدھا سادا ہوتا ہے۔ وہ اپنی طرح کے سیدھے سادے تصور خدا (شخصی نوعیت کا) سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مذہبی پیشوا عوام کی اسی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر ایک شخصی تصور خدا کو بڑھاوا دیتے ہیں جب کہ ترقی یافتہ شعور نزاکت، لطافت اور پیچیدگی سے عبارت ہے چنانچہ مغربی شعراء ورڈز ورتھ، ایمرسن اور کولرج (Coleridge) سے لے کر جدید مغربی ومشرقی ممتاز شعراء کا کلام وحدت الوجودی خیالات کے رجحانات سے بھرا پڑا ہے۔

ترقی پذیر خدا کا تصور ہیگل اور شیلنگ (Schelling) کی تصوریت (Idealism) میں پایا جاتا ہے۔ ہیگل کے نزدیک روح مطلق جیتی جاگتی حقیقت کے طور پر اپنے پورے شعوری وجود میں آہستہ آہستہ فطرت کے ارتقاء کے ساتھ انسانی روح میں متشکل ہوتی ہے اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک روح مطلق (خدا) ہر چیز کو اپنی ذات کے اندر داخل کر کے انہیں ایک وحدت میں نہیں پرو دیتی۔ عصر حاضر کی وحدت الوجودیت کو تولدی Genetic Pantheism کہتے ہیں۔ یہ اپنے تئیں اس کائنات کی تخلیق کی تعبیر کرتی ہے۔ وہائیٹ ہیڈ (White Head) کے مطابق خدا قطبی فطرت (Polar Nature) کا حامل ہے۔ اس کے ایک طرف اساسی فطرت (Primordial Nature) ہے جو کہ خارجی طور پر لامحدود امکانات تک جاسکتی ہے اور یہ دنیا جو ہمارے سامنے ہے وہ اس کی ثانوی فطرت (Consequent Nature) ہے۔ Teilhard De Chardin خیال پیش کرتا ہے کہ دنیا میں خدائی قوت وجود کی اعلیٰ ترین سطحوں میں پیدا ہوتی ہے اور یہی عمل اپنے نقطہ عروج میں تاریخ کے کسی انتہائی نقطہ Omega Point پر ''ماورائے ذات'' شعور تک پہنچے گا۔ جیسا کہ ہم پچھلے ابواب میں دیکھ چکے ہیں کہ مشرقی مذاہب میں بھی وحدات الوجودیت کے اشارے ملتے ہیں، قدیم فلسفیانہ سنسکرتی تحریروں میں یہ خیال سامنے آتا ہے کہ برہما (جو حقیقت مطلق ہے) ہی تمام اشیاء کی وحدت اور اصل ہے۔ شنکر کا بھی کہنا تھا

کہ برہما (وجود مطلق) اور آتما (Self) دونوں ایک ہی ہیں۔ فلاسفر رادھا کرشن بھی وحدت الوجودی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کائناتی سرگرمی اور ممکنہ ابدیت ایک مطلق خدائے وحدت کے ایسے اجزاء ہیں جو باہم رشتوں میں منسلک ہیں۔

خدا کو نہ ماننے والوں کا وحدت الجودیت پر اعتراض رہا ہے کہ کائنات کی لاانتہا وسعت، وحدت (Unity) اور خلقی قوتوں (Inherent Forces) پر ایمان تسلیم لیکن اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔...... کہ انہیں کسی خدائی صفات کے ساتھ منسوب کیا جائے...... مشرق وسطیٰ اور عرب سرزمین سے جنم لینے والے مذاہب بھی وحدت الوجودیت کو نہیں مانتے۔ اس لئے کہ وہ ایک شخصی اور اخلاقی خدا پر یقین رکھتے ہیں جس نے سوچ سمجھے منصوبے کے تحت اس دنیا کو پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کا ایک الگ اور آزاد وجود ہے اور جو کائنات کے ساتھ بھی قریبی تعلق قائم رکھتا ہے۔ البتہ ان مذاہب کے اندر ہمیشہ ایسے صوفی، بزرگ اور اولیاء پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے شدت کے ساتھ وحدت الوجودیت کا پرچار کیا...... اور وسیع پیمانے پر خاص و عام حلقوں کو اپنے خیالات سے متاثر کیا۔

وحدت الوجودی نظریئے میں کچھ مشکلات بھی ہیں، چنانچہ اس پر مندرجہ ذیل تنقیدی سوالات بھی اٹھائے جاتے رہے ہیں۔

1- کچھ بھی کہا جائے، کائنات ہی خدا ہے یا خدا کا ناگزیر حصہ یا کائنات خدا کا ناگزیر جزو...... ان سب صورتوں میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خدا ابدی، لامحدود اور ضروری ہے...... کائنات جیسی ہے اسے ویسا ہی قبول کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ خدا کے اضافی تصور کا قافیہ لگانا کیوں ضروری ہے۔ یعنی کائنات کی صفات وخصوصیات کو اس کے ماوراء لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔

2- اس نظریئے کی دوسری مشکل یہ ہے کہ اگر یہ کائنات محدو ثابت ہوگئی (جیسا کہ آج سائنس کا دعویٰ ہے) تو خدا بھی محدود قرار پائے گا۔

3- تیسرا مسئلہ شر کے وجود کا ہے، اگر کائنات کو خدا کا روپ یا اس کے ناگزیر جزو کے طور پر مان لیا جائے...... تب بدی اور شر یا تو خدا کی ذات کا حقیقی حصہ قرار پاتے ہیں...... یا پھر فقط ہماری نظروں کا دھوکا۔

ڈارون اور خدا!

فطرت کا ترجمان

چارلس ڈارون کا دادا Erasmas ڈاکٹر، شاعر اور آزاد خیال مفکر تھا جو اپنی کاٹ دار نکتہ سنجی کے لئے مشہور تھا۔ وہ کائنات کے عمل میں دیوتاؤں کی مداخلت کے عقیدے کا مخالف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''جب سائنس کا دودھ پینے کو مل رہا ہے تو پھر مذہب کی کیا ضرورت ہے؟ کیا فطرت کی دیوی ہر چیز کی وضاحت نہیں کر رہی ......حتیٰ کہ خود اس کی تخلیق کیسے ہوئی؟ وہ فطرت کے مندر کا پجاری تھا اس کے لئے عقل، الٰہیات اور ترقی نبوت کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگلستان میں ایک نیا ایلیٹ (Elite) صنعتی طبقہ ابھر رہا تھا اور آراسمس جیسے آزاد خیال مفکر روح کے تصور کو ماننے سے انکار کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں زمین کو سورج کے گرد گھومنے کے لئے کسی فضل ربی کی ضرورت نہیں اور جاندار جسم بھی ایک مشین کی طرح ہی کام کرتا ہے۔

چارلس ڈارون 12 فروری 1809ء کو پیدا ہوا۔ ڈارون خاندان کا نام پہلے ہی ''تخریب کار'' دہریوں کے حوالے سے مشہور ہو چکا تھا لیکن ڈارون کی ماں خاموشی سے روایات پر عمل پیرا رہی۔ وہ اتوار کے روز بچوں کو گرجے لے جایا کرتی۔ ڈارون بچپن سے ہی اپنے اطوار اور دماغی لحاظ سے اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا، وہ زمانہ طالب علمی میں ہی ایک ایسی تحقیق میں ملوث ہو گیا جس کا مطلب فطرت کے اندرونی رازوں کو افشاء کرنا تھا۔ اس کے اساتذہ اسے بتا چکے تھے کہ فطرت پرست (Naturalist) کوشش کر کے نامیاتی (Organic) دنیا کی ترقی و ارتقاء اور اس کے اصل (Origin) سے پردہ اٹھا سکتے ہیں لیکن مشکل یہ تھی جو اس پردے کو ہٹا رہے تھے وہ مذہب (عیسائیت) کے مخالف تھے۔ چنانچہ اسے ''تخریبی سائنس'' سمجھا جاتا تھا۔ پادریوں کا کہنا تھا کہ ارتقا پرستوں کی جھوٹی فلاسفی لوگوں کو جمہوریت پسند اور چرچ دشمن بنا رہی ہے۔ فطرت پرست روح کی بجائے نیچ مادے پر یقین رکھتے ہیں اور اگر روح پر ایمان نہ رہا تو سب اخلاقی بندھن ٹوٹ جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اگلی زندگی کی بجائے اس دنیا میں تلافی چاہتے ہیں......غرضیکہ فیوڈل اشرافیہ اور ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے میں ایک تناؤ پیدا ہو چکا تھا۔ فطرت اور ماورائے فطرت وضاحتوں کے درمیان ایک کشمکش شروع تھی جو انسان کو مادی وجود قرار دے کر اس کی تعریف نو (Redefinition) کرنا چاہتی تھی۔ ان بحثوں میں فطرت سیکولر اور مسابقت خیز منڈی (Competitive Market Place) کے طور پر ابھر رہی تھی۔ نوجوان ڈارون سائنس کے سماجی اثرات کا نظارہ کر رہا تھا۔ ایک نئی دنیا وجود میں آ رہی تھی۔ کیمرج یونیورسٹی میں مذہب اور سیکولر قوتوں کے درمیان نظریاتی جنگ ہو رہی تھی۔ مذہب پر کھلم کھلا حملے ہو رہے تھے

اور اس بات کے دعوے کیئے جانے لگے تھے کہ عیسیٰ نام کے کسی شخص کا وجود ہی نہیں تھا اور عیسائیت کی ابتدا کے بارے جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ سب من گھڑت ہے اور نہ ہی یہ انسانیت کیلئے کوئی فائدہ مند ہے۔ عیسائی مذہب کا ظہور ایک قدیم و تاریک غیر الہامی مذہب (Pagan Religion) میں سے ہوا تھا۔ الغرض دہریت، جمہوریت پسندی اور انقلاب کی تیز ہوائیں چل رہی تھی اور مقتدر اداروں (Establishment) کا دفاع کمزور ہو رہا تھا۔ ان کی مراعات خطرے میں پڑ رہی تھیں۔ آزاد خیالی ایک سیاسی عقیدے کے طور پر مذہبی پیشوائیت کی ریڑھ کی ہڈی میں جھرجھری پیدا کر رہی تھی۔ اس ساری ہلچل میں چارلس ڈارون کو بھی سوچنا پڑ رہا تھا......لیکن وہ ان مباحث میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یونیورسٹی کے دوسرے سال میں پڑھائی جانے والی ایک کتاب ''عیسائیت کے ثبوت'' (Evidences of Christianity) کو ڈارون نے زبانی یاد کر رکھا تھا۔ وہ مصنف کے اس طرح کے دلائل اور منطق سے بے حد متاثر تھا کہ خدا کا وجود ہے اور اسے اپنا اظہار کرنا تھا۔ جس کے لئے بہترین طریقہ معجزے ہی ہو سکتے تھے۔ ان معجزوں کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تجربات سے متضاد ہیں، ان کی صداقت کے لئے کافی ''تاریخی شہادتیں'' موجود ہیں اور یہ حقیقت ہی کافی ہے کہ ابتدائی عیسائیوں نے عیسیٰ کے معجزوں سے انکار کرنے کی بجائے ظلم و ستم سہنے کو ترجیح دی چنانچہ عیسائیت خدا کا اتارا سچا مذہب ہے۔ وحی خداوندی نے اگلی زندگی میں سزا و جزا اور روز مکافات کا تصور دے کر بہت مفید کام کیا ہے۔ انسانوں کے اعمال کو منضبط کرنے اور حدود میں رکھنے کے لئے ابدی اذیت کا خوف بہت ضروری تھا اس سے عوام اپنی مشکلات کو قبول کر لیں گے۔ جب انہیں پتہ چلے گا کہ ہر ناانصافی کا ازالہ آئندہ زندگی میں کر دیا جائے گا۔ صرف یہی سچائی ہر چیز کی فطرت کو تبدیل کر سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ 1830ء کا وہی زمانہ تھا جب پیرس، انقلاب فرانس کی زد میں آ چکا تھا۔ رجعت پسند بادشاہ کے ساتھ پادری بھی اپنا اقتدار کھو چکے تھے، مذہب کی ریاستی حیثیت ختم ہو چکی تھی لیکن ادھر انگلستان میں فطری الہیات (Natural Theology) کے نام سے مذہبی تصورات کو عین فطرت کے مطابق قرار دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ جس کے مطابق فطرت میں سب اچھا تھا۔ حیات جوش پر تھی، حیوان و انسان کے پیچیدہ میکانکی اجسام سب زمانہ قدرت میں ڈھلتے ہیں، جو اپنی اپنی جگہ پر بہترین تخلیق ہیں اور ان کی حسن تخلیق اس بات کی غمازی ہے کہ انہیں کوئی نہ کوئی ڈیزائن کرنے والا ضرور ہے۔ خدا کے وجود کا اتنا زیادہ ''عقلی ثبوت'' انسان کو اکساتا ہے کہ وہ وحی خداوندی (مذہب) کے اشاروں کو سمجھیں۔

فرانسس بیکن نے ایک بار کہا تھا کہ سائنس نے فطرت پر کنٹرول کے طریقے سکھا کر انسان کو اعلیٰ وقار عطا کیا ہے۔ دوسری طرف مذہب کا بھی دعویٰ تھا کہ انسان خدا کی خصوصی اور اشرف المخلوق ہے۔ لہٰذا وہ ازل سے ایک بلند مقام کی حامل ہے لیکن نظریہ ڈارون کی صورت سائنس اور انسان کی تاریخ ایک ایسے دلچسپ موڑ پر پہنچی کہ سائنس کے ہاتھوں انسان کی ''عزت'' خطرے میں پڑ گئی۔ سوال یہ تھا کہ انسان اور گردوپیش کے سب جاندار اور غیر جاندار اشیاء کی تخلیق کیسے ہوئی؟ ایک صدیوں پرانا عقیدہ جسے مذہب کی حمایت حاصل تھی یعنی خدا نے تمام مخلوقات کو فرداً فرداً ڈیزائن اور تخلیق کیا ہوا ہے۔ چنانچہ تمام مخلوقات خدا کے ہاتھوں کی بے مثل صناعی اور اعلیٰ ترین بصیرت کا کمال ہیں۔ ان کی ظاہری شکل و شباہت اور باریک ترین

جزئیات کو خدا نے بہ نفس نفیس ڈھال رکھا ہے۔ اسی نظریئے کی وجہ سے خدا کے جمال وجلال کا رعب انسانی ذہن پر ثبت ہو چکا تھا اور انسان اپنے نائب الارض ہونے کے زعم میں مست تھا کہ فطرت ایک اور ہی کہانی سے پردہ اٹھا دیتی ہے جس سے مخلوقات کی تخلیق میں خدا کے براہ راست عقائد ڈھیر ہو گئے۔

چارلس ڈارون کی تحقیق کا سلسلہ اس وقت شروع ہو جب اسے برطانوی بحریہ کے ایک بیگل نامی جہاز میں بطور ایک ایسے سائنس دان کے بھرتی کر لیا گیا جس کے ذمہ برطانوی نو آبادیوں کے فطری ماحول کا مطالعہ اور ان کا سروے کرنا تھا۔ اس سے قبل یہ سوال اٹھایا جا چکا تھا کہ کیا تمام جانداروں کے شجرہ نسل کا پتہ لگایا جا سکتا ہے جو ہمیں ان کے مشترکہ ابتدائی سرے کی طرف لے جائے لیکن اس کا جواب اس لئے نفی میں دیا گیا کہ انسان کی ''عزت'' خطرے میں پڑ جانے کا ڈر تھا کہ چمپنزی اور گوریلے (Apes) انسان کے بزرگوں میں شمار ہوں گے لیکن ڈارون نے جزیروں اور جنگلوں میں جب جانور نما انسانوں کے قبائل کو دیکھا تو اس نے دل میں سوال کیا کہ ''کہاں ہے انسان کی شرف المخلوقیت جو گیلی زمین پر جانوروں کی طرح آلتی پالتی مارے ننگے دھڑ نگے مرد وزن اکٹھے اور سوائے زندہ رہنے کے زندگی کے کسی اور مقصد سے نا آشنا ہیں۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی اعلیٰ سلسلہ نسل (High Geneology) سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اس سوال کے جواب کی تلاش میں جت گیا کہ انسان کہاں سے آئے ہیں۔ ڈارون ایک عملی اور میدانی سائنس دان تھا اس نے پتھروں، پودوں، حیوانوں اور لاکھوں سال پرانے زیر زمین دب جانے والے ڈھانچوں (Fossils) پر کام شروع کر دیا تو اس پر یہ منکشف ہوتا گیا کہ تخلیق کے عمل میں الٰہیات کا کوئی دخل نہیں بلکہ یہ دنیا سست رفتار، بتدریج اور نہایت چھوٹی چھوٹی فطری تبدیلیوں کا مجموعہ ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد واقعتاً وحشی تھے ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی خالق دو طرح کے انسان پیدا کرے۔ ایک اتنے قدیم اور دوسرے نہایت مہذب وجدید؟ ڈارون اب بھی ''خالق'' پر ایمان رکھتا ہے لیکن اس کے لئے مذہب کا یہ دعویٰ مسئلہ بن گیا کہ یہ دنیا ''کن فیکون'' کی معجزاتی تخلیق ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ خدا ذاتی طور پر اور ماورائے فطرت طریقوں سے مداخلت نہیں کرتا، اس نے کائنات کی تخلیق کے وقت قوانین بنا دیئے جو ارضیاتی تاریخ کے ساتھ روبہ عمل رہے۔ ڈارون کو لگا کہ نسلوں کی انواع (Species) کی علت کی تلاش اس کو گہرے اور مشکل پانیوں میں لے جائے گی۔ زماں ہو یا پتھر دونوں بتدریج تبدیلی وترقی کا نتیجہ ہیں۔ جوں جوں تحقیق آگے بڑھتی گئی ''وقت'' سب سے بڑا خالق ابھرتا نظر آ رہا تھا۔ کیا جاندار پرانے وقتوں کی نشانیاں ہیں؟ حال تاریخی سچائیوں کی طرف لے جانے کا واحد راستہ ہے۔ ڈارون سوچ میں پڑ گیا تخلیق کا عمل خاص قوانین کے مطابق عمل پیرا ہے...... قانون ہی زمین پر حکمران ہے اور آسمانوں پر بھی۔ اس کے علاوہ کائنات کی کسی اور طرح تشریح خدا کی ذات کی تحقیر کرنا ہے۔ سورج، سیاروں، ستاروں اور جانداروں کے پیدا ہونے اور معدوم ہو جانے میں معجزوں اور قیامتوں کی باتیں افسوسناک ہیں۔ ڈارون کے ان خیالات کے زیر اثر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ فطرت (Nature) خود رو قوانین کی پیداوار ہے جس کا آغاز خدا نے کیا تھا چنانچہ سب لوگ خدا کے سامنے برابر ہیں لہٰذا ملاؤں کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ خدا کے نام پر زندگی کی تشریح کریں یا سائنسی افکار کو کنٹرول کریں۔ مذہب کی سرکاری حیثیت ختم ہو جانی چاہیے۔

مذہبی پیشوا خواہ مخواہ انسانوں کے ذہنوں پر حکمرانی کرتے رہے ہیں، ادھر مذہبی پیشوا مصر تھے کہ کائنات کے حرکت و عمل پر خدا کی براہ راست حکمرانی ہے اور یہ اسی کی مرضی سے چلتی ہے۔ خدا کی قدرت کے الفاظ فوراً عمل پذیر ہو جاتے ہیں اور مذہبی پیشوا زمین پر خدا کے نمائندے ہیں۔ اگر مذہبی اداروں کا کنٹرول ختم ہوا تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ ملاؤں کے ایسے ہی دعوؤں پر ایک اخبار نے مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ''ہمارے پادری سوچتے ہیں کہ اگر چرچ آف انگلینڈ نہ ہوا...... تو کھیرے۔ ٹماٹر اور سلاد نہیں اگیں گے!''

ادھر علم حیوانات (Zoology) بتا رہی تھی کہ جاندار اچانک اور الگ الگ پیدا نہیں ہوتے بلکہ یہ سب ایک دوسرے سے ایک بڑے نظام کے تحت جڑے ہوئے ہیں۔ چمگادڑ کے پر اور وہیل کے تیرنے والے عضو میں اسی جیسی ہڈیاں ہیں جو انسان کے بازو میں ہیں۔ سائنسی تحقیقات کے ان نتائج سے مذہب کے پیدا کردہ ان پرانے خیالات کی دھجیاں اڑ رہی تھیں جن کے مطابق خدا ایک ایک چیز کو خصوصی طور پر ڈیزائین کرتا ہے۔ اب ڈارون کا بھی فطرت کے ''کافر'' سائنس دانوں میں شمار ہونے لگا۔ اب اسے مذہب سے انحراف کرنے کے الزامات کا سامنا تھا۔ کہا جانے لگا کہ نظریہ ارتقاء کا مقصد انسان کو وحشی بنانا ہے اور مخلوقات کے درمیان میسر انسان کے اعلیٰ مقام کو تباہ کرنا ہے۔ ایک بار جب وہ برٹش میوزیم میں داخل ہوا تو ایک پادری نے اسے انگلستان کا سب سے خطرناک شخص قرار دیا۔ اب ڈارون مجبور ہو گیا کہ وہ اپنے نظریئے کا دفاع کرے جس کے لئے ذی شعور حوصلے IntellectualCourage اور مضبوط ذہن کی ضرورت تھی۔ اسے ثابت کرنا تھا کہ وہ بزدل روح کا نہیں بلکہ صاحب یقین دل کا مالک ہے۔ اسے اپنی تھیوری کے وسیع تر اطلاقات اور اثرات کے سوا اب بھی امید تھی کہ شاید ممکن ہو کہ اس کی تھیوری بنیادی طور پر عقیدہ خدا کے لئے چیلنج نہ بنے۔ اس لئے کہ فطرت کو یہ قدرت خود خدا نے ہی بخشی ہوگی۔ ظاہر ہے خالق انفرادی طور پر مخلوقات کو ڈیزائین نہیں کرتا اور اس کی تھیوری (Natural Seletion) خدا کے بالواسطہ ذرائع کے طور پر جانداروں کو پیدا کرتی ہے تاکہ وہ خود کو بدلتی دنیا کے مطابق Adapt کرتے رہیں۔ فطری الٰہیات والے دعویٰ کرتے رہے کہ خدا نے شکار خور اس لیے پیدا کیے تھے تاکہ بیمار اور بوڑھے جانور جلد موت سے ہمکنار ہو جائیں تاکہ وہ لمبی تکلیف سے بچ جائیں جب کہ ڈارون کی تھیوری موت و حیات کی جدوجہد کو ایک تخلیقی قوت کی صورت پیش کر رہی تھی کہ اگر ارتقا کے عمل کو آگے بڑھنا ہے تو جو غیر موزوں (Unfit) ہے، اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ چنانچہ مصائب سے دوچار ہونا دنیا کی لازمی خصوصیت ہے۔ اس طرح ڈارون زیادہ سے زیادہ ایک ایسے خدا کا تصور قبول کر سکتا تھا جو ایک بہت دور کی چیز ہے۔ وہ کائنات کو عمومی قوانین سے کنٹرول کرتا ہے اور اسے انفرادی مصائب اور اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جو لوگ انسان کو ''تکریم، عزت اور وقار'' کے نام پر ڈارون کی تھیوری پر معترض تھے، ان کے جواب میں ڈارون کا کہنا تھا کہ اسے نظریہ ارتقاء میں سماجی اور اخلاقی لحاظ سے کوئی خرابی نظر نہیں آتی کیونکہ وہ بالکل ننگے وحشی انسانوں کو دیکھ چکا تھا جو جانوروں جیسی جنگلی، احمقانہ، غیر اخلاقی اور مار دھاڑ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہاں انسان بمشکل ہی درندوں سے اوپر تھے۔ ڈارون کا کہنا تھا آپ کو یہاں انسان کا وقار خطرے میں نظر نہیں آتا۔ جہاں انسان پہلے ہی وحشی بن کر اپنے مقام کو گرا چکا

ہے۔ایک سائنس دان کی حیثیت سے ڈارون کا مقصد اشرافیہ کی تہذیب کا دفاع نہیں تھا بلکہ یہ وضاحت کرنا تھا کہ مہذب اور وحشی ایک ہی خالق کے ہاتھ کی تخلیق ہیں۔ وحشی اپنے ننگے اور گندے وجود سے خوش تھے اور وہ اپنی عادتیں بدلنے پر تیار نہ تھے۔ مہذب انسان جیسے ترقی یافتہ شہری زندگی بسر کر رہے ہیں اسی طرح یہ وحشی لوگ اپنے ماحول کے ساتھ خود کو ڈھال چکے تھے۔ ڈارون سوچنے لگا یہ تو ایسے لگتا ہے خدا ایک نہیں، دو ہیں......ایک خدا دو نہایت متضاد کلچر کیسے پھیلا سکتا ہے؟ کیا خدا نے ذاتی طور پر ان وحشی انسانوں کو نہایت تذلیل آمیز ماحول دیا ہے؟ یقینی طور پر خدا کی یہ مرضی نہیں ہوسکتی کہ انسان وحشیانہ زندگی گزارے۔ چنانچہ کیا ایک ایسے خدا کا تصور بہت نہیں ہے جو قانون ارتقاء کا استعمال کر کے انسانی نسل کو فطرت کے مطابق پھیلا رہا ہے؟ خدا پرستوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ خدا کی مرضی کے بغیر پتا نہیں ہلتا کہنے سے خدا کی عظمت میں اضافہ ہونے کی بجائے مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ادھر جرمنی کا ایک ماہر عضویات (Physiologist) جونز ملر (Johannes Muller) یہ کہہ چکا تھا کہ غیر نامیاتی مادے کو جاندار کرنے میں کسی خارجی تخلیقی قوت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس سادہ ترین جاندار مادہ جینی (Embryonic) جراثیم بھی اپنے اندر لانیفک (Intrinsic) خود تنظیمی (Self Organizing) انرجی کے حامل ہوتے ہیں۔ گویا جب غیر جاندار مادہ جاندار مادے میں تبدیل ہوتا ہے تو اس میں ''جان'' باہر سے داخل نہیں ہوتی۔ سادہ لفظوں میں مادے کی مخصوص تنظیم اور کیمیائی عمل کے نتیجے میں جان مادے کے اندر سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ ڈارون بھی یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ مادے میں حرکت (جان) خدا عطا کرتا ہے لیکن اس کا مسئلہ تھا کہ کسی ایک طرح کی نسل کسی دوسری طرح کی نسل میں کیسے تبدیل ہوتی ہے۔ ایک نوع کے کسی دوسری نوع میں تبدیل ہوجانے کے عمل (Transmutation) کو تخریبی اور مذہب دشمن کہا گیا۔ یہ بات ہر قدم پر کھل کر سامنے آتی ہے کہ مذہب اصلاً قدیم انسان کے سادہ شعور کو مقدس عقائد میں بدلے ہوئے ہے۔ صاف ظاہر ہے اولیں دور کے انسان کی سمجھ صرف یہیں تک جاسکتی تھی کہ انواع واقسام کی سب اشیاء کوئی بنانے والا (خدا) خود ہی گھڑتا ہے اور جانداروں کے اندر زندگی بھی وہی داخل کرتا ہے جس سے اجسام متحرک ہو جاتے ہیں اور پھر اس جان کو وہ نکال بھی لیتا ہے لیکن ایک سائنس دان کھلی صداقتوں کے سامنے اندھے عقائد کو خاطر میں نہیں لاسکتا چنانچہ ڈارون نے فطرت کے نشو ونما کے خودرو (Self Development) عمل کو بڑے آرام سے قبول کرلیا۔ اسے اس حقیقت نے خوف زدہ نہیں کیا کہ انسان بے دم بندروں (Apes) کی اولاد ہے اور نہ ہی انسان کے اس طرح وحشی ہو جانے کا خطرہ محسوس کیا بلکہ اسے غصہ چڑھا ان لوگوں کی ضد پر جو انسان کو ''چبوترے'' پر کھڑا کیئے ہوئے تھے۔

ڈارون نے محسوس کیا کہ زمین پر غیر نامیاتی مادے سے حیات کا ابتدائی ظہور یکبارگی معاملہ (One off Affair) تھا جو بہت دور دھندلے ماضی میں کہیں مدفن ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی جاندار کا جنم کہیں ہو گیا ہو اور کسی کا جنم کہیں اور ان کے درمیان آپس میں کوئی رشتہ وتعلق نہ ہو۔ حیات صرف ایک ہی واقعہ میں پیدا ہوئی اور پھر تاریخ کے ساتھ شاخ در شاخ ایک نہ ختم ہونے والے نشو ونما کے سلسلے میں پھیلتی چلی گئی۔ معیاد پوری ہونے پر پرانے ختم ہو جاتے ہیں اور دوسرے

ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جو بدلتے ماحول کے ساتھ خود کو نہیں بدلتے یا اس کے ہم رفتار نہیں ہوتے، ان کا خاتمہ یقینی ہے (یہی بات قوموں پر بھی صادق آتی ہے لیکن اس افسوس ناک حقیقت سے پہلوتہی نہیں کی جاسکتی ہے کہ بدلتے ماحول کے ساتھ بدلنے اور ہم رفتار ہونے میں مذہبی خیالات سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں، چنانچہ دنیا میں کسی ایسی قوم کی کوئی مثال موجود نہیں جو نہایت مذہبی بھی ہو اور ترقی یافتہ بھی......) ڈارون کا کہنا تھا کہ کسی ایک جاندار کو دوسرے جاندار سے اعلیٰ کہنا فضول بات ہے۔ شہد کی مکھی کی نظر میں انسان اشرف المخلوقات نہیں ہوسکتا۔ ڈارون اس خوف سے کہ اسے غیر ذمہ دار، غیر مذہبی اور اس سے بھی برا کہا جائے گا۔ اس نے ایک عرصہ اپنے تحقیقاتی کام کو دنیا سے چھپائے رکھا، حتیٰ کہ اس گھٹن اور دوہرے معیار کی زندگی نے اسے کئی جسمانی بیماریوں میں مبتلا کر دیا۔ ڈارون مذہب کے اس بت کو توڑ چکا تھا کہ انسان روز اول سے صاحب دانش پیدا ہوا تھا اور اس دنیا کو خدا شخصی طور پر چلا رہا ہے لیکن ''انسانی شاونزم'' اس کے آڑے آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی تھیوری جبلی موروثی اور دماغی مطالعہ کے علاوہ ساری مابعد الطبیعات کو بدل کر رکھ دے گی۔ اعتراض یہ تھا کہ اگر انسان وحشیوں کی فقط ایک بہتر قسم ہے تو اس کا روحانی وقار کہاں گیا اور اگر وہ خود اپنے آپ ہی بن گیا تھا تو خدا کے آگے اس کی اخلاقی جواب دہی کی ذمہ داری کا کیا ہوگا...... کیونکہ اب خدا اس کا خالق ہی نہیں رہا تھا۔ اس طرح معاشرے کے تانے بانے کو جواب دہی اور ابدی جزا و سزا کے تصورات نے جس طرح باندھ رکھا ہے، وہ سارا نظام تباہ ہو جائے گا۔ مذہبی حلقوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہر چیز ایسے ہی بنی ہونی چاہیے تھی۔ کیا اس میں کسی قدرت کاملہ کا ہاتھ نظر نہیں آتا...... ڈارون کا موقف تھا کہ ایک ماحول کی مخلوق دوسرے ماحول میں ''خدا کی بھیجی ہوئی'' مخلوق ہی سمجھی جائے گی۔ اسے یقین تھا کہ نظریہ ارتقاء ہر دماغی عضو پر جسمانی آسن کی وضاحت کرسکتا ہے خواہ اس کا تعلق ریڑھ کی ہڈی سے لے کر تلی تک اور عادتوں، جبلتوں، خیالات، احساسات، شعور سے لے کر اخلاقیات تک سب باتوں کا اصل معلوم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لئے اس ''حیرت انگیز تخلیق'' انسان کو فطرت کے کٹہرے میں ڈالنا ہوگا۔ انسان کوئی خصوصی مخلوق یا دیوتا نہیں ہے، یہ بھی دوسرے حیوانات کی طرح اپنی جبلتوں اور احساسات کو دوسری نسل کو منتقل کرتا ہے۔

ڈارون نے اپنی زندگی کے دن رات کیڑوں مکوڑوں، جانوروں، پودوں پر تحقیق میں ایک کر دیئے لیکن اس کی تحقیق کا ہر اگلا نتیجہ اسے پریشان کر جاتا...... کہ اس پر مذہبی پیشواؤں کا کیا ردعمل ہوگا۔ ڈارون کو گلیلیو یاد آتا ہے اور خیالوں میں خود کو اذیت دینے والی کرسی پر بندھا دیکھتا ہے لیکن وہ طے کرتا ہے کہ مستقبل کو آزاد کرانے کے لئے وہ ان مصائب سے گزر جائے گا۔ انسان کا خود کفیل اور آزاد ہونا......عقائد کی موت تھی۔ مذہبی پیشوائیت دیکھ رہی تھی کہ اگر جاندار خلیئے اپنی خود نشو و نمائی کی قدرت رکھتے ہیں تو پھر خدا کے الہیاتی رسوخ کا خاتمہ ہو جائے گا اور مذہبی پیشوائیت کی خدا کے نام پر انسانی روح اور جسم پر حکمرانی بھی جاتی رہے گی۔ ڈارون تمام ذہنی سرگرمیوں کو مغز (Brain) کے اندر ہونے والی تحریکوں سے وابستہ کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ عادتیں اور عقائد بھی ذہنی مشینری کے عمل سے جڑے ہوئے ہیں ہر جبلت اور ہر خواہش کے مرکز کو مغز کے اندر تلاش کیا جاسکتا ہے جہاں وراثت کی ارتقائی کڑیاں مل جائیں گی۔ حتیٰ کہ خدا کی ثنا خوانی سے لے کر دیوتاؤں کی محبت تک سب اس مادی

تنظیم کی ہی پیداوار ہیں۔ اب ڈارون کو مادہ پرست کہا جانے لگا۔ مادیت (Materialism) دراصل ایک فنی اصطلاح تھی، جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مادہ وجود رکھتا ہے (اور یقینی طور پر روحوں کا کوئی وجود نہیں، کم از کم مذہب کے بتائے ہوئے معنوں میں) اور خیالات ہمارے دماغ کی مادی سرگرمی کا نتیجہ ہیں۔ ڈارون کی دلیل تھی کہ جس طرح آپ کشش ثقل کو مادے کی ذاتی خصوصیت کے طور پر قبول کرتے ہیں اسی طرح ''خیال'' کو دماغ کا اخراج کیوں قبول نہیں کرتے۔ خدا پر ایمان کا خیال باہر سے ہمارے اندر نہیں آتا۔ انسان اپنے تکبر میں سوچتا ہے کہ وہ بڑی عالی شان تخلیق ہے، وہی اس قابل ہے جو خدا کا نائب بن سکتا ہے۔ جب کہ اصلیت یہ ہے کہ وہ جانوروں میں سے پیدا ہوا تھا۔ ہنسنا بھونکنے کا ہی اگلا ارتقائی قدم تھا اور مسکراہٹ ہنسنے کی ترمیم شدہ شکل ہے۔ رونا اور چلانا الجھن کی نشانی...... ایسی سب باتیں صدیوں پرانے انسانی تکبر کے منہ پر طمانچہ تھیں لیکن ڈارون کو اپنی جرات مندانہ تھیوری پر فخر تھا۔ چونکہ انسان کے آبائی سلسلے کا گہرا علم مل گیا ہے چنانچہ اب فلسفہ اور اخلاقیات میں ہی ایک انقلاب آئے گا۔ ڈارون کو گمان تھا کہ انسان کی اصلیت کا ثبوت مل جانے پر میٹافزکس کو بھی ضرور ترقی کرنی چاہیے۔ ادھر ڈارون فرانسیسی ریاضی دان آگسٹ کامٹ (August Comte) کی ''اثباتی فلاسفی'' (Positive Philosophy) سے بہت متاثر ہوا جس کے مطابق کائنات میں صرف قانون کی حکمرانی ہے۔ اس کا کہنا تھا اس کے علاوہ سب دوسرے نظریئے جو دینیات (Theology) سے اٹھے ہیں مصنوعی ہیں۔ وہ انسانی ارتقاء کی وہ اسٹیج تھی جب انسان خدا کے ہاتھ پر بھروسہ کرتا تھا یا ازمنہ وسطیٰ کا وہ مابعد الطبیعات کا دور تھا جب دنیا پر نظر نہ آنے والی روحیں اور پراسرار روحانی اثرات حکمران تھے۔ ڈارون اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ انسانی بچے آج بھی ان تمام پرانے مرحلوں سے گزرتے ہیں اور ثقافتی ارتقاء کے سلسلوں کا ذہنی اعادہ کرتے ہیں۔ قدیم غیر متمدن انسان بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کو خدا کی براہ راست مرضی کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ وہ آج کے ان لوگوں سے زیادہ ''قدیم'' نہیں تھے جو اب بھی معجزوں پر یقین رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خالق نے تخلیق آدم کے وقت ہی انسان میں تمام علوم داخل کر دیئے تھے۔ ڈارون اپنی تھیوری کو اور آگے بڑھاتا ہے انسان کا ''احساس خودی'' بھی تنظیم کے قوانین ہی پیدا کرتے ہیں۔ ڈارون یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ معاشرے کے ردعمل کے خوف اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے آدھے سر کے درد، پیٹ کی خرابی اور دل کی تیز دھڑکنوں جیسے عارضوں میں مبتلا ہو گیا لیکن دنیا اب اسے ایک مختلف رنگ میں نظر آ رہی تھی۔ بقول ڈارون ''اس دنیا کا کیا شاندار منظر ہے۔ موسموں، ارضی اشکال (Landscapes)، نباتات و حیوانات میں آنی والی تبدیلیوں الغرض ہر چیز کو وسیع و عریض قوانین کا سلسلہ کنٹرول کر رہا ہے۔'' یعنی ہر کام خدا کرتا ہے کا جملہ ہر کام قانون کرتا ہے میں بدلنے لگا۔ ڈارون کو محسوس ہوا کہ یہ نظریہ زیادہ شاندار ہے۔ اس بات سے کہ خدا نے ہر کیڑے مکوڑے کو انفرادی طور پر خود ڈیزائن اور تخلیق کیا ہے۔ کیا یہ کہنا خدا کی عزت گرانے والی بات نہیں کہ کروڑوں حقیر سے صدف نما آبی جانوروں کا سلسلہ قادر مطلق...... بہ نفس نفیس پیدا کرتا ہے۔ نہ ہی اس کے قوانین سپریم ہیں۔ ڈارون ابھی تک خدا کے وجود سے منکر نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کی تھیوری انجام کار ایک بے خدا (Godless) دنیا کا نقشہ بنا رہی تھی۔

ڈارون اس بات سے اتفاق کرتا تھا کہ ثواب و گناہ اور صحیح و غلط کے تصورات اپنے ثقافتی حالات سے مشروط ہوتے

ہیں۔ان کا روحانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔سب اخلاقی طور طریقے ضرورتوں اور خارجی اثرات سے پیدا ہوتے ہیں اور نیکی و بدی کے سب معیاروں کا انحصار معاشرتی سیاق وسباق پر ہوتا ہے۔ایک قبائلی لڑائی میں انسانوں کا قتل عام یا بغیر کسی غرض کے جان بچانا یکساں طور پر نیک کام ہوسکتے ہیں۔اس کرہ ارض پر نیکی اور بدی کے معیار اتنے اوٹ پٹانگ پائے جاتے ہیں کہ کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ کون سا عمل کس جگہ نیک ہوجائے اور دوسری جگہ بد۔ڈارون نے سوال کیا کہ اسے کیا کہا جائے گا جب (Polynesian) مائیں ادائیگی فرض میں اپنے بچوں کو ڈبو دیتی ہیں اور مشرقی (Potentates) کے قبائل انگلستان کے بادشاہوں پر ہنستے ہیں کہ ان کی سینکڑوں بیویاں نہیں ہیں۔اب یہ حقیقت کہ سب انسان کسی نہ کسی طرح کی اخلاقیات رکھتے ہیں،اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہرن کی طرح ایک معاشرتی جانور ہے۔

اخلاقی اعمال اس طرح جبلی ہوتے ہیں جس طرح ہرن خطرے کے وقت اپنے ہم جنسوں کو خبردار کرنے کے لئے آواز نکالتا ہے،اخلاقی قائدے سماجی جبلتوں میں ترتیب پاتے ہیں تاکہ ایک خاندانی اور انسانی جتھے میں سب کو پیوست کیا جائے۔وہ اپنے سماجی حالات میں باہمی تعلقات کو مضبوط کرنے میں مددگار ہوتے ہیں مثلاً بائبل کا یہ کہنا ''جیسا اپنے ساتھ کرتے ہو ایسا ہی دوسروں کے ساتھ کرو۔''یا ''ہمسائے کے ساتھ محبت ایسے کرو جیسے اپنے ساتھ کرتے ہو۔'' صاف ظاہر ہے یہ اخلاقی اصول ''آسمان'' سے نہیں اترے تھے بلکہ ہمارے آباؤ اجداد کے جنسی،پدری و مادری اور دیگر سماجی ماحول کے تقاضے میں فطری طور پر پیدا ہوئے تھے۔چنانچہ یہ کہنا غلط ہے کہ اخلاقیات یا دیگر مذہبی فرمان آسمان سے اترے تھے۔مذہب پرست ڈارون پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ انسان کو حیوانی سطح پر لاکر انہیں اخلاقی لحاظ سے بے لگام ہونے کی ترغیب دے رہا ہے لیکن ڈارون نے اس کے جواب میں زوردار موقف پیش کیا ''میرا نظریہ ارتقاء اور بائبل کی اخلاقیات دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔دونوں کا مطالبہ ہے کہ لوگ اخلاقیات کے مطابق چلیں تاکہ انسان کا مستقبل خراب نہ ہو۔فرق یہ ہے کہ ارتقاء پرست اپنے بچوں کی بقاء اور بہتری کے لئے زندگی بسر کریں گے جب کہ مذہبی لوگ ایسا ''اگلی زندگی'' کے لئے کرتے ہیں۔ دونوں کے لئے خدا کے سامنے فریضے کا مطلب مستقبل کی خوشی بہم کرنا ہے۔''ڈارون کا کہنا تھا کہ اگر ایک بے دم بندر (Ape) کو مہذب کرلیا جائے تو اس میں اور ایک جنگلی انسان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ڈارون نے انسان کے اندر پائے جانے والے غصے کے جذبات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ''ہمارے اندر غصے اور انتقام کے جذبات اس لئے ہیں کہ ہمارے حیوان آباؤ اجداد کو ان سے فائدہ پہنچا تھا۔ہمارے برے جذبات ہی ہمارے پست سلسلہ نسب کا پتہ دیتے ہیں۔بدمعاش ابلیس بن مانس کی صورت ہمارا ہی جد امجد تھا!!''یعنی انسان کے اندر جتنے بھی شیطانی جذبات ہیں وہ اس دور سے ورثے میں آئے ہیں جب انسان حیوانی سطح کی زندگی گزار رہا تھا۔ڈارون نے مختلف انسانی آبادیوں کے مثل قانون،سماجی رویوں کا مطالعہ شروع کردیا اور اس بارے اعداد وشمار اکٹھے کرنے لگا۔اسے لگتا تھا کہ ترقی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے لیکن وقت ایک چیستان کی طرح تھا۔ ایک وقت میں اسے حسن دکھائی دیتا تو دوسری طرف وہی دور تاریک بھی لگتا۔پرانے سماج کی سب بولیاں ریزہ ریزہ ہورہی تھیں۔ایک نیا خدا (وقت) زیر تفتیش آچکا تھا۔ڈارون آگے بڑھتا گیا اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ سب سوالوں کے جواب تلاش

کر لے گا۔ اس سے قطع نظر کہ اس میں سے شیطان نکلتا ہے یا دیوتا......قوانین فطرت (Laws of Nature) کا ایک ہنگام بپا تھا۔ ایک مبصر نے لکھا ''انسان کو کائنات اصغر کہا جا رہا ہے لیکن ہم اس عظیم چابی کو نہیں جانتے جو خفیہ کمروں کے قفل کھول دے۔'' لیکن ڈارون کا دماغ کہہ رہا تھا۔ ہم جانتے ہیں اب کچھ خفیہ باقی نہیں رہا......اور اس چابی کو مسلسل گھمائے جا رہا تھا۔ ڈارون ایک مخمصے میں پھنس چکا تھا۔ جھولی عقیدے سے خالی ہو رہی تھی لیکن شکوک و شبہات سے دامن نہیں چھوٹ رہا تھا۔ اس کے ارتقاء کا نظریہ سیکولر (غیر مذہبی) تھا لیکن وہ منکر خدا نہیں تھا۔ یہ کیسے ہوا خدا کے قوانین نے ہمارے جیسا دماغ بنا ڈالا، کیا اس سارے گڈ مڈ عمل کے پیچھے کوئی مقصد بھی ہے۔ وہ اب ماورائے فزکس سوالوں کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں ایک ''بے عقیدہ عقلی ایمان'' (Creedless Rational Faith) جنم لے رہا تھا۔ ڈارون کے مذہبی عقائد مل رہے تھے اس نے مابعد الطبیعات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ بقول ڈارون ''مابعد الطبیعات کا مطالعہ مجھے یوں لگا جیسے علم فلکیات کو میکانکی علم کے بغیر پڑھا جائے۔'' تجربہ بتاتا ہے کہ دماغی مسئلے کا حل صرف قلعے پر حملہ کر کے نہیں نکالا جا سکتا......دماغ جسم کا عضو ہے اور اس کے بغیر وہ کوئی کام ادا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہمیں بحث کے آغاز کے لئے کسی مستحکم بنیاد کی ضرورت ہے اور وہ بنیاد انسان کے ماضی کی طرف کا سلسلہ نسب تھا جو دماغ کے لئے بھی عقلی کنجی فراہم کرتی ہے۔ انسانی شعور شاید سخت ترین خول ثابت ہو لیکن ہمیں اس کے ابتداء و اصل کو دیکھنے کے لئے کتوں اور بن مانسوں کے مجموعی رویے کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ بقول ڈارون ''کردار اور شعور آسمانی کتب پڑھ کر نہیں بنے تھے بلکہ ہمارے حیوانی آباؤ اجداد کے احساسات سے بنے تھے۔ شعور آدمی کے کنٹرول سے باہر ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو آپ نیک کام کرنے پر مبارک باد دے سکتے ہیں لیکن اس کا عمل مشروط (Conditioned) ہے چنانچہ وہ کسی کریڈٹ کا مستحق نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح بدمعاشی بھی انسان کی خطا نہیں ہے بلکہ جسمانی بیماری ہے!!'' جو انسان کے حیوانی دور سے چلی آ رہی ہے۔

ڈارون نے ارتقاء کی تھیوری کا استعمال کرتے ہوئے تصور خدا کا یوں عقدہ حل کیا ہے ''ہمارا یہ کہنا کہ خالق کا تصور طبعی طور پر ہمارے اندر موجود ہے یہ اس کا نتیجہ تھا کہ ہم نے عظیم اور شاندار قوانین فطرت کا مشاہدہ کیا تھا۔ یہ جبلت بڑی عظیم تھی جسے سماجی طور پر مفید سمجھتے ہوئے ترقی دی گئی۔'' اب ڈارون کے لئے مذہبی عقائد ناقابل قبول ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے روحوں اور جنت و جہنم کے وجود پر اپنے برملا شک کا اظہار کر دیا۔ بالآخر ڈارون اس کنجی تک پہنچ جاتا ہے جو فطرت کے اس سارے عمل کا راز منکشف کرتی ہے، وہ تھی اس کی مشہور عالم تھیوری ''جو موزوں ترین ہے اسی کی بقاء ہے۔'' یعنی (Survival of the Fittest) فطرت میں شدید ترین مقابلہ بازی چل رہی ہے۔ ہر ٹشو، ہر عضو لاتعداد انواع میں ڈھل جانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن فطرت بہترین کا انتخاب کرتی ہے۔ موجود نمونوں کی صورت گری سلیکشن کے اسی عمل نے کی ہے۔ لاکھوں کی تباہی کے اوپر ایک کا انتخاب ہوتا ہے، پھر بھی حیوانات میں معدوم اعضاء کی باقیات بچ جاتی ہیں جیسے انسان کی دم کا نشان (Collyx) باقی رہ گیا ہے۔ اس نے اس خیال کی تضحیک اڑائی کہ خدا نے یہ نامکمل ٹکڑے بعد میں ریڑھ کی ہڈی کی گولائی کے لئے بنائے تھے۔ جب وہ انسان کا ڈیزائن مکمل کر چکا تھا!! ڈارون نے کہا کیا بکواس ہے ایک قادر مطلق خالق کا

ڈیزائن ہی ختم ہو جاتا ہے......! ڈارون کی دلیل تھی کہ انسانی فوسلز کی عدم موجودگی میں ہمارے جسم کے اندر ابتدائی زمانہ کے یہ نامکمل ٹکڑے انسان کے والدین کا سراغ دیتے ہیں۔ ہماری دم کا ٹنڈ (Stump) بندر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عادی (Habitual) رویے ہماری جبلتیں بن گئے اور انہوں نے ہمارے دماغ اور جسم میں تبدیلیاں پیدا کر دیں حتیٰ کہ جبلتیں بھی بن منصوبہ بندی کے پیدا ہوئیں اور فطرت نے جو مفید تھیں ان کا انتخاب کر لیا۔ کوئی علیم و خبیر خالق نہیں بلکہ فطرت ہی سب سے بڑی انتخاب کنندہ ہے۔ وہی ہر چیز پر نظر رکھنے والی ہے، وہ جتنی بے رحم ہے اتنی ہی صاحب لیاقت (Effecient) بھی ہے۔ مخلوقات کا معمار خدا نہیں بلکہ یہ فطرت ہے جو کروڑوں نمونوں (Variations) کو کھنگالتی ہے اور پھر اس کی یقین دہانی کرتی ہے کہ نئی ساخت کا ہر حصہ بہترین صورت کا حامل ہو اور مکمل طور پر دیگر نظام کے عمل میں شریک ہو۔

ڈارون کہتا ہے کہ یہ بات قرین عقل نہیں کہ خدا نے انسان کو سوچ سمجھ کر تخلیق کیا تھا، ڈارون کی بیوی ایما ایک جگہ لکھتی ہے ''ڈارون کی عادت تھی کہ جو بات ثابت نہیں ہو جاتی تھی، وہ اس پر یقین نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی اس عادت نے اسے دوسری چیزوں پر یقین کرنے سے روکے رکھا جنہیں اسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا جن پر وہ یقین رکھتا تھا۔'' ڈارون کو اس بات سے اذیت ہوتی تھی کہ سچ ہو اور ہماری سمجھ سے بالاتر ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ لہٰذا اگر کوئی بات سمجھ سے بالاتر ہو تو وہ سچ نہیں ہے۔ ڈارون نے اس عقیدے کو ماننے سے انکار کر دیا کہ مرنے کے بعد کوئی ابدی زندگی ہو گی نہ وہ ثابت ہو سکتی ہے نہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس کی بیوی کے مطابق جس سوال پر وہ تقسیم ہو گئے، وہ یہ نہیں تھا کہ بائبل ناقابل مواخذہ وحی الٰہی ہے بلکہ اس بات پر تھا کہ آیا اسے جنت یا جہنم میں ابد تک رہنا پڑے گا...... ڈارون نے اعلان کیا تھا کہ یہ دنیا نہ تو کسی خارجی خالق کی پیدا کردہ ہے اور نہ ہی اب ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ جاندار نہ تو پراسرار مخلوقات ہیں نہ ہی خدا کی مرضی کی تخلیق، سیاروں، ستاروں سے لے کر ہر چیز کا وجود عظیم قوانین کا نتیجہ ہے۔ یہ عقیدہ خدا کی ذات کے لئے تحقیر آمیز ہے کہ لاتعداد انواع کی دنیا تخلیق کرنے والا خالق کروڑوں رینگنے والے طفیلی (Parasites) کیڑوں میں سے ہر ایک کو خود پیدا کرتا ہے جن کا جم غفیر ہر روز دوسروں کی زندگی پر چڑھ دوڑتا ہے۔ اب ہم نے حیران ہونا بند کر دیا ہے بلکہ افسوس ضرور کر سکتے ہیں کہ جانداروں کا ایک ایسا مجموعہ براہ راست خدا کے ہاتھوں تخلیق ہونا چاہیے تھا جو اپنے انڈے دوسروں کی آنتوں میں دے اور دوسروں کے گوشت پر پلے......اور کچھ جانداروں کی مسرت چیر پھاڑ اور ظلم میں مضمر ہونی چاہیے تھی اور ہر سال بے حساب انڈوں اور زردانوں کا ضیاع ہونا چاہیے تھا......فطرت کی در پردہ جنگ میں قحط، موت اور غارت گری کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے کیا وہ خدائے بزرگ و برتر کا مشغلہ ہے؟ ڈارون نے زور دے کر کہا کہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے فطرت میں کسی کو کوئی مراعات میسر نہیں۔ ہر ایک کو مسابقت میں پھینک دیا گیا ہے جس میں صرف جوہر، استعداد اور ہنرمندی کو ہی انعام بخشا جاتا ہے۔ سماج ہو یا سائنس کی دنیا ہر جگہ نظام اور قانون کی حکمرانی ہے۔ دیوتاؤں کا دنیاوی معاملات میں کوئی دخل نہیں۔ ڈارون کے انہی خیالات پر ایک اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''کہاں گئے وہ قصے کہ اس دنیا کو خدا نے ڈیزائن کیا ہوا ہے۔ اگر خدا کا وجود ہوتا تو دنیا کم مصائب زدہ اور زیادہ لطف انگیز ہوتی۔ اس دنیا میں منافقت کم، خلوص زیادہ اور متقی و غیر متقی قصائی کم ہوتے۔'' ایسے خیالات کا ایک

طوفان اٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف بیسیوں آزاد خیال دانش وروں پر ریاست اور چرچ کے گٹھ جوڑ سے اہانت مذہب (Blasphemy) کے مقدمے دائر کئے جا رہے تھے۔ مذکورہ اخبار پر مقدمہ چلتا ہے، اس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ خدا کے وجود سے منکر ہے اور سمجھتا ہے کہ لوگ اتنے مفلس ہیں کہ وہ اب پادریوں کی فوج کو نہیں پال سکتے لیکن ڈارون اپنے حوصلے کو مجتمع کرتا ہے اور اس بات کے اعتراض کا اعلان کہ سب جاندار ایک ہی مشترکہ ماخذ سے نکلے ہیں اور ارتقاء کو کسی خالق کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے پادری خود ڈارون کے دوست تھے اور وہ خود ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا چنانچہ اس پر اپنے مراعات یافتہ طبقے سے غداری کرنے کا الزام آ رہا تھا۔ اس نے ارتقاء پر اپنے مضامین چھاپنے کے لئے بھیجتے ہوئے لکھا ''اگر میری تھیوری، جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ سچی ہے، کو ایک بھی اہل جج نے قبول کر لیا تو سائنس میں یہ بہت بڑا اقدم ہوگا۔'' ادھر مذہبی پیشوائیت مصر تھی کہ خدا نے اوپر سے فطری اور سماجی درجہ بندیوں کو بنا رکھا ہے۔ پروردگار کے بنائے نظام کو مسترد کرنا اور نظام جاریئے (Status Que) کی اجازت جو خدا نے دے رکھی ہے اسے چیلنج کرنا ساری تہذیب کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ مذہبی موقف کے حمایتی دانش ور نے برٹش ایسوسی ایشن میں تقریر کرتے ہوئے کہا ''نئی انواع (Species) پرانی انواع کے جوہری طور پر تبدیل ہو جانے کے عمل (Transmutation) سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ خدا کی تخلیقی قوت دوبارہ عمل پیرا ہوتی ہے'' تو مجمعے سے کسی نے آواز لگائی ''یہ خدا کا رپورٹر ہے!'' اس نے یہ کیسے جانا اور اس کا ثبوت کیا ہے؟ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا کہنا تھا ہمیں شبہ ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد چمپیزی تھے البتہ کائنات پر قانون کی حکمرانی کا جہاں تک سوال ہے، وہ صحیح ہے۔ خدا نے تخلیق کا ایک قانون جاری کر رکھا ہے تب سے کائنات خود کو کھولتی چلی جا رہی ہے۔ فطرت کو فطرت ہی رہنے دینا چاہیے اور اس پر مذہب نے جو روحانی غلاف چڑھا رکھا ہے وہ اتر جانا چاہیے تاکہ صداقت صاف صاف نظر آ سکے۔ چنانچہ نہ تو مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہے اور نہ ہی مذہبی اداروں کی۔ چرچ کے ریاست کے ساتھ ''ناجائز تعلقات'' کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ ڈارون نے ایک تقسیم پیدا کر دی کہ یا تو ماورائے فطرت (Supra-naturalism) نظام ہو سکتا ہے یا پھر قوانین فطرت کی حکمرانی ہو سکتی ہے۔ ڈارون نے تسلیم کیا ''میں جرأت مند آدمی ہوں، مجھے بے وقوف سمجھا جائے یا جان بوجھ کر حرکت کرنے والا لیکن میں ایک معروضی اور غیر جانبدار سائنس دان کی حیثیت سے پردہ اٹھا رہا ہوں۔''

ڈارون خدا کی خصوصی اور اشرف تخلیق انسان کا حشر نہ صرف وحشی قبائل میں دیکھ چکا تھا بلکہ مہذب معاشروں میں غلاموں کی نہایت اذیت ناک زندگیوں کا بھی مشاہدہ کر چکا تھا۔ وہ چلا اٹھا، تم کونسی تکریم آدم کی بات کرتے ہو، میں نے غلاموں کو اذیتیں دیتے اور ان کی قابل رحم کراہنے کی آوازیں سنی ہیں۔ میں ایک گھر میں رہ چکا ہوں جہاں ایک نوجوان غلام عورت کو روزانہ ہر گھنٹے بعد گالیاں دی جاتی تھیں اور اتنا مارا جاتا تھا کہ اس ''نیچ جانور'' کی روح ٹوٹ پھوٹ جائے۔ ایک چھ سات سال کی عمر کے لڑکے کے ننگے سر کو چابک سے پیٹے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ صرف اس وجہ سے اس نے مجھے صاف گلاس میں پانی نہیں دیا تھا...... میں ایک ایسی بوڑھی عورت کے سامنے رہتا تھا جو اپنی غلام عورتوں کی انگلیوں میں پیچ کسا کرتی تھی...... یہ ہے وہ سب بے دردی، ظلم اور لوٹ مار جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے اور ساتھ ہی مقدس آسمانی

آیات دہرائی جاتی رہتی ہیں...... ''ہمسایوں کے ساتھ اس طرح محبت رکھو جس طرح اپنے ساتھ رکھتے ہو۔'' کون خدا پر ایمان رکھتا ہے اور دعا گو ہوتا ہے کہ اس زمین پر خدا کی مرضی چلے۔ چار سو پھیلے ظلم اور استحصال کے وقت جہاں خون کھول اٹھتا ہے، احساسات پھٹ پڑتے ہیں۔ آپ کو انسان کی تکریم نظر نہیں آتی...... سیدھی سی بات ہے نیچر سے جب تک روحانیت کا فراک نہیں اتارا جاتا، اس کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ روحانیت انسان کو منافق بنا دیتی ہے۔ ہم دوہرے معیار اپنا کر حقائق سے آنکھیں موند لیتے ہیں۔ یوں گرما گرم بحثیں چلتی ہیں۔ فوربز (Forbes) کا کہنا تھا'' مچھلی، رینگنے والے جانور اور بن مانس خود سے ایک نوع سے دوسری نوع میں منتقل نہیں ہو سکتے۔ تمام انواع خدا کے اپنے خیالات کی مجسم تصویریں ہیں۔ صرف خدا کا دماغ ہی ان میں کوئی حقیقی تبدیلی لانے کے بارے سوچ سکتا ہے۔'' ڈارون سختی سے ایسے نظریئے کی تردید کرتا ہے جس کے مطابق انواع صرف خدا کے دماغ میں ہی تبدیل ہوتی ہیں اور اس کے دماغ میں پیدا ہونے والی تصویریں زمین پر جانداروں کی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے نظریات ہمیں روکے رکھیں گے کہ ہم ان تبدیلیوں کے پیچھے جو مادی میکانزم ہے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ڈارون نے مذہب کے حمایتی ایک دانش ور Coleridge کو بھی پڑھا۔ اس کے نزدیک مذہب ثابت کیا جانے والا نظریہ نہیں ہے بلکہ وہ زندگی اور روزمرہ زندہ رہنے کا عمل ہے۔ مذہبی احساسات روح کے اندر قدرتی طور پر پائے جاتے ہیں اور ان کا موروثی جبلتوں سے کوئی تعلق نہیں...... ڈارون اس کے جواب میں اپنی نوٹ بک میں لکھتا ہے'' اور جو ایمان نہیں رکھتے ان کے بارے کیا خیال ہے۔'' کولرج اس کا الزام اس غلام ارادے (Enslaved will) کو دیتا ہے اور کہتا ہے ایسے لوگوں کو قیامت کے حساب کتاب اور جزا و سزا کے لئے چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ سوال کرتا ہے کیا آپ میں سے کسی نے اس عام بیماری ''موت کے ڈر'' کا علاج دریافت کر لیا ہے لیکن ڈارون پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ عرصہ ہوا جسم اور روح، عقل اور جبلت کے امتیازات کو ترک کر چکا تھا، اسے ایسے لگا ان لوگوں کی مذہبی اپیل میں جہنم کی آگ کی بھاپ استعمال ہوتی ہے جس میں سب (اہل عقائد) ابدی طور پر جلتے رہیں گے......

ڈارون نے بھی دیگر تمام روشن خیال مفکرین کی طرح ابدی جہنم کے خوفناک عقیدے کو رد کر دیا۔ اس نے کہا جزا اور سزا کے ہمارے مذہبی عقائد کی بنیاد قدیم وحشیانہ دور کی توہم پرستی پر رکھی ہوئی ہے۔ موت، قحط اور سامی قبائل کی جنگوں کے درمیان ''خدائے قدوس'' پر ایمان اچانک پیدا نہیں ہوا تھا۔ مذہبی جبلت معاشرتی حالات سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک قوم کا خدا دوسری قوم پر غارت گری کی دوزخی آگ برسا رہا ہو تو ایسے میں ایک ہی خدا کا تصور بنے گا جو 'ایمان'' نہ رکھنے والوں کے لئے بے رحم ہی ہوگا...... اگر ایک ابدی وجود (خدا) کو ناراض کرنے کے جرم میں کسی شخص کو ابدی سزا کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے تو پھر ایک بچے کی جھنجلاہٹ بھی ابدی برائی کے کھاتے میں رکھی جا سکتی ہے۔ یہ تھے وہ خیالات جن سے ڈارون متاثر ہو رہا تھا...... اب وہ آسمانی کتب کے تجزیئے میں لگ گیا۔ عہد نامہ قدیم میں مذکور تخلیقی قصہ اور غیر طبعی اخلاقیات اور عہد نامہ جدید کی متھوں اور تضاد بیانیوں پر اس کا ایمان گر رہا تھا۔ عیسیٰ نے شاید وہ سب کچھ کبھی کہا ہی نہ ہو جو اس کے ساتھ منسوب کر دیا گیا...... اس طرح کی واردات میں کوئی بھی مذہب مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وقت، تعصب، عقیدت اور متعلقہ لوگوں کے

مفادات نے مذہبی روایات پر اتنی گرد اکٹھی کر دی ہوتی ہے کہ ان پر بن سوچے سمجھے ایمان لانا دانش مندی نہیں کہلائی جا سکتی۔ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے اور ایسے لگتا بھی ہے کہ اگر ایمان نہیں رہے گا تو انسان کی زندگی میں ایک بہت بڑا اخلاء پیدا ہو جائے گا۔ ڈارون اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے کہتا ہے ''میرے دماغ میں کوئی تشنج پیدا نہیں ہوا، میں نے اپنی روح کو بالکل خالی محسوس نہیں کیا اور نہ ہی عملی طور پر میرے اندر کوئی تبدیلی پیدا ہوئی۔'' گویا عقیدے کے بغیر انسان کسی ٹوٹ پھوٹ اور بحران کا شکار نہیں ہوتا بلکہ مصنوعی، نفسیاتی اور الجھاؤ پیدا کرنے والے ان روحانی سہاروں سے آزاد ہو کر انسان اندر سے اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ ڈارون نے اس بات کو واضح کیا کہ ''ایمان کے لئے صرف جذباتی لگاؤ ہی کافی نہیں، بلکہ اسکے لئے عقلی، اخلاقی اور تاریخی شہادتیں بھی درکار ہونی چاہیے۔ عیسائیت (مذہب) کو ایک ہی بار ہمیشہ کے لئے مسترد کر دینا چاہیے۔ اب نظریہ ارتقاء کی صورت ہمیں ایک نیا مسیحا مل گیا ہے جو اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ دماغی، اخلاقی اور مذہبی عقائد انسانی نسلوں کے سماجی ترقی و ارتقاء کا ہی ایک حصہ تھے۔'' سائنسی تحقیقات اور وسیع مطالعہ کے نتیجے میں اس کے عقائد مسلسل ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔ ڈارون کا ایک ''اخلاقی اور منصف کائنات'' پر اعتماد ریزہ ریزہ ہوتا گیا...... وہ انسانی، نباتاتی اور حیواناتی دنیا میں ایک بالکل غیر جذباتی اور بے رحم کھیل چلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ڈارون نے 1854ء میں رائل فلاسفی کلب میں شمولیت کی دعوت قبول کر لی۔ اب مالتھس، ہربرٹ اسپنسر، ھکسلے اور اسکاؤٹ تحریک کے بانی بیڈن پاول ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی حمایت میں اکھٹے ہو چکے تھے۔ بیڈن پاول نے مذہبی رنگ میں ہی دلیل دیتے ہوئے کہا ''خدا کی حیثیت قانون دینے والی کی سی ہے اور سائنسی قوانین ہی معجزوں کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ اس کے بعد معجزوں پر یقین رکھنا گویا خدا کے وجود سے انکار کرنا ہے۔'' یہ معجزہ پرستوں کے لئے بڑا منہ توڑ جواب تھا۔ ڈارون حیات کی اولین ابتدا (Ultimate Origin) کے سوال کا جواب دینے میں تامل کرتا رہا۔ بقول ڈارون ''زمین پر زندگی کا ابتدائی ظہور نا قابل تفتیش ہے، فطرت اور حیاتیات کے سائنس دان کے لئے جو بات اہم ہے وہ ہے حیات کے ظہور میں آنے کے بعد کی تبدیلیاں۔ پہلے حیاتیاتی مادے (Globule) سے ظہور کا سوال ایسے ہی لاتعلق ہے جیسے یہ کہا جائے کہ مادہ کہاں سے آیا۔ ڈارون کا اصرار تھا سوال ایک ہی ہے کہ آیا حیوانی اور نباتاتی حیات کسی مشترک اجداد سے تعلق رکھتے ہیں یا نہیں۔ ڈارون کے اولین ابتدا کے سوال کو نظر انداز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی سائنس نے اس سوال پر زیادہ تحقیقات نہیں کی ہوئی تھیں اور اس سے متعلقہ حقائق ابھی سامنے نہیں آئے تھے۔ البتہ آج سائنس کے پاس ''حیات ظہور میں کیسے آئی...... اور آتی ہے'' پر تفصیلی جواب اور حقائق موجود ہیں جنہیں متعلقہ سائنسی کتب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بر سبیل تذکرہ بتا دیا جائے کہ 1953ء میں شکاگو یونیورسٹی کے ایک طالب علم (Stanely Miller) نے اپنے استاد (Harold Urey) کے ساتھ مل کر لیبارٹری میں حیات کے پیدا کرنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ انہوں نے لیبارٹری میں وہ کیمیائی حالات پیدا کئے جو حیات کے ظہور کے وقت اس زمین پر تھے اور دیکھا کہ وہ کس طرح مختلف نامیاتی مالیکول (Organic Molecule) میں تبدیل ہو گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حیات کسی ماوراء قوت نے زمین پر نہیں اتاری تھی بلکہ وہ خود بخود ابتدائی زمین (آج سے 3.8 ارب سال پہلے پیدا ہو گئی تھی۔

ڈارون کی حکمت عملی تھی کہ حیات کی انواع کے حوالے سے ہی صرف بات کی جائے اور مذہب کے دیئے تخلیقی نظریئے کوخود بخود گرنے دیا جائے۔ حالات کے مزید سازگار ہونے اور سائنس کی سماجی بنیاد تبدیل ہونے کی وجہ سے ڈارون نے فیصلہ کیا کہ اب ''فطری انتخاب'' (Natural Selection) کی تھیوری پیش کردی جائے، جس نے بالآخر اس تصور پر آخری ضرب لگادی جس کے مطابق مخلوقات کی پیدائش ماورائے فطرت ہستی کی طرف سے ہورہی ہے۔ ڈارون نے اعلان کیا کہ تمام مخلوقات کارخانہ فطرت میں تخلیق پا رہی ہیں اور فطرت کی یہ ورکشاپ اپنے اندر خود بخود ترقی (Self Improving) کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ارتقاء اس کی معیشت ہے۔ بقائے حیات کی جدوجہد، مسابقت اور انتخاب اس کے بنیادی ستون ہیں۔ فطرت کی اس جنگ میں لاتعداد ہلاک ہورہے ہیں اور نئی مخلوقات جنم لے رہی ہیں۔ صرف تھوڑے اپنے کو بہتر کر پاتے ہیں، بہت سے صرف روٹی پر گزارہ کرتے ہیں جن کی جدوجہد فضول ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھا جارہا ہے۔ کمزور پاؤں کے نیچے کچل رہا ہے، اخلاقیات اور انسانیت کے دعوے دار الزام لگا سکتے ہیں کہ ڈارون طاقت ور کو کمزور کے کچل دینے کا فطرت اور سائنس کی طرف سے لائسنس دے رہا ہے لیکن اگر منافقت کی عینک اتار کر دیکھا جائے کہ آج تک جتنے بھی دینی اور سیکولر مساوات کے دعاوی نظام آئے ہیں سب میں فی الحقیقت یہی کھیل چلتا رہا ہے۔ طاقت ور کو ہمیشہ نفع بخش پوزیشن حاصل رہتی ہے اور کمزور کو کچل دیا جاتا ہے۔ اس عمل میں کسی طرح کی ''پرہیز گاری'' آڑے نہیں آتی۔ خدا، رسول، عبادتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ ڈارون سائنس دان اور فطرت کا ترجمان تھا، اس سے منافقت نہیں ہوسکتی تھی۔

ادھر ابھی تک ایسی آوازیں آرہی تھیں کہ ''یہ ناممکن ہے کہ Apes کھڑے ہوگئے ہوں اور انسان بن گئے ہوں۔ درندہ کسی اور نوع میں تبدیل نہیں ہوسکتا، انسان محفوظ ہے اس کی عزت کو کوئی خطرہ نہیں!'' لیکن نظریہ ارتقاء کی ناقابل تردید حقیقتوں کے سامنے آجانے سے مذہبی حلقوں نے مذہب کے پرانے موقف میں تبدیلی کرلی۔ اب وہ کہنے لگے کہ تخلیق ایک مسلسل عمل کا نام ہے ورنہ وہ یہی کہا کرتے تھے کہ خدا نے سب مخلوقات کی تخلیق ابتداہی میں پیدا کردی تھیں، البتہ کبھی کبھی خدا کی براہ راست مداخلت یعنی بذریعہ معجزہ فطرت کے کسی عمل میں تبدیلی آجاتی ہے۔ انسان کی ''عزت'' خطرے میں پڑ جانے کے سوال پر ڈارون نے کہا ''مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ میرے پاس انسان کی ''عزت'' کا کوئی تسکین بخش نظریہ نہیں ہے، میں مطمئن ہوں اس بات کا امکان ہے کہ انسان آگے بڑھتا رہے گا اور اسے اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی کہ ہم نہایت دور ماضی میں کبھی صرف درندے تھے۔'' اس نے وضاحت کی کہ فطرت ایک ناقابل تغیر مادی علت و معلول کی زنجیر ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو من جانب خدا ہو، فطرت کے اسباب کسی ایسی چیز کا پتہ نہیں دیتے جسے خدا کی مرضی کی مسلسل کاروائی قرار دیا جا سکے۔ کچھ ایسا نہیں کہ خدا مکھی کو ذاتی طور پر ڈیزائن کرتا ہو یا اس میں تبدیلیاں لاتا ہے۔ یہ فطرت کا انتخاب ہے جو فیصلہ کرتا ہے، کس نے کیسا ہونا ہے؟ کون معدوم ہوجائے گا اور کون باقی رہے گا؟ ڈارون کا یہ بھی کہنا تھا کہ ایک عقلی اور مبنی بر قانون فطرت شر کے مسئلے کا بھی حل پیش کرتی ہے۔ اگر ہر چیز خدا کی جانب سے ہوتی تو پھر بدی کیا ہے، میں اپنے آپ کو ایک ایسے عادل و مہربان اور قادر مطلق خدا پر ایمان لانے پر مائل نہیں کرسکتا کہ وہ ایک ایسے طفیلی (Parasite) کیڑے

(Inchneumonide) کو پہلے ڈیزائن اور پھر پیدا کرتا ہے جس کی کھلم کھلانیت جاندار تتلیوں کو کھا کر زندہ رہنا ہو۔ حالات کے سنگ خود کو اسی طرح ڈھال لینا صرف ایک ایسی دنیا میں ہی ممکن ہے جو قوانین کے مطابق چل رہی ہو......اور قوانین کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو......اس مفہوم میں خدا ایک غیر حاضر جاگیردار کی مانند ہے اور فطرت اپنے آپ میں خود کفیل اور خود مختار......

یہ تھا وہ ڈارون جس نے صداقت کی ایسی چھڑی لہرائی کہ فطرت کے بارے انسان کا قدیم بچگانہ نقطہ نظر یکسر بدل کر رکھ دیا۔ فطرت کے عمل سے خدا بطور ''معمار'' اب نکل چکا تھا اور جنسی انتخاب (Sexual Selection) کو فطرت کے آرٹسٹ کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اب انسان خود کو اور نیچر کو متنوع اور رنگارنگ دنیا کو اپنی اصل حالت میں دیکھ سکتا تھا کہ صدیوں پرانی کئی تہذیبوں سے پڑا روحانیت کا غلاف تار تار ہو چکا تھا۔ ڈارون نے اس نظریئے کی بھی مخالفت کی کہ خدا ارتقاء کی سمت کو متعین کرنے میں کوئی کردار ادا کرتا ہے۔ اس نے کہا فطرت کا عمل ایک ایسے معمار کی مانند ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے گرنے والے پتھروں میں سے ان پتھروں کو چن لیتا ہے جو اس کی عمارت کے لئے مفید ہیں۔ ان حالات میں کوئی یہ نہیں سوچ سکتا کہ پہاڑ کی چوٹی سے پتھر معمار کی خواہشات کے مطابق گریں۔

ڈارون کا ذہنی ارتقاء بھی اس کے نظریہ ارتقاء سے مشابہ تھا۔ جوں جوں صداقتیں کھلتی گئیں، وہ ایمان کی مست وادی سے لاادریت کے دشت وصحرا کی طرف بڑھتا گیا۔ کافی عرصہ اس کا موقف رہا کہ خدا ہے یا نہیں۔ اس کے بارے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ اہم بات یہ ہے کہ اس دنیا کے عمل میں نہ اس کا کوئی دخل ہے اور نہ ہی اس دنیا کو کوئی پیدا کرنے والا ہے۔

فرائڈ اور خدا!

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) (1856-1934ء) کے بعد علم نفسیات صرف اعصابی امراض کے علاج تک محدود نہ رہا بلکہ انسان کی ہر کاوش کے پیچھے کارفرما نفسیاتی عوامل کا سائنسی تجزیہ کرنے کی اسے اہلیت حاصل ہوگئی۔ آیئے دیکھیں، جدید علم نفسیات کا باوا آدم سگمنڈ فرائڈ ہمیں اس تصور خدا کے بارے میں کیا بتاتا ہے جو قدیم ترین تہذیبی انسان سے لے کر مفکروں، فلاسفروں، صوفیوں حتیٰ کہ جدید ترین ماہرین طبیعات کے شعور میں آسیب کی طرح پیچھا کر رہا ہے۔

فرائڈ 6 مئی 1856ء کو چیکوسلواکیہ میں ایک یہودی اون فروش کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کی ماں اس کے باپ جیکب فرائڈ کی تیسری بیوی تھی جو اپنے خاوند سے بیس سال چھوٹی تھی۔ فرائڈ بچپن سے ہی بے حد ذہین (قبل از وقت نشو ونما یافتہ) اور انتہائی سخت محنت کرنے والا شخص تھا۔ اس نے مذہب پر زندگی بھر عمل نہ کیا بلکہ اسے کبھی گماں بھی نہ ہوا کہ وہ یہودی نسل ہے۔ تاہم اسے نازیوں کی یہودی دشمن تحریک کا نشانہ بننا پڑا۔ فرائڈ خود تو ایک بہت ہی مہذب آدمی تھا لیکن وہ تہذیب کو جابرانہ خیال کرتا تھا۔ اس کے خیال میں تہذیب نے جبلتوں کی تسکین پر انسان کی برداشت سے زیادہ پابندیاں لگا دیں جس کے ردعمل میں انسان کے اندر اعصابی علامتوں نے سر اٹھایا۔ چنانچہ فرائڈ کو ابتدائی انسان کے مطالعہ میں بڑی گہری دلچسپی تھی۔ وہ علم انسانی (Anthropology) کے ان ماہرین پر تنقید کیا کرتا تھا جو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر اور میدانی کام (Field Work) کیے بغیر محض نظریاتی (Theoratical) موشگافیوں میں زندگی بسر کر دیتے ہیں۔

فرائڈ نے تمام مذہبی عقائد کو فریبانہ اور خیالی (Illusory) قرار دے کر رد کر دیا۔ فرائڈ کا آخری دم تک یہ خیال رہا کہ تاریخ میں پیچھے جا کر اس اصلی واقعہ (Actual Event) پر پہنچا جا سکتا ہے جہاں سے مذہب اور اخلاقیات کا آغاز ہوا تھا۔ اسے اس بات کا اعتراف تھا کہ مذہب کبھی کبھی اعصابی علامتوں (Symptoms) کو دبانے میں بھی کردار ادا کرتا ہے لیکن وہ سختی سے اس بات پر قائم رہا کہ مذہبی عقائد آرزو بھری پرفریب نظری (Wishful Illusion) کے سوا کچھ نہیں۔ فرائڈ کے الفاظ میں ''قدیم انسان نے فطرت کی دہشت ناکیوں کا اپنے سر پر چڑھا بھوت اتارنا تھا۔ اس نے تقدیر کے بے رحم کھیل کے ساتھ مطابقت پیدا کرنی تھی خاص طور پر تقدیر کا وہ ظالمانہ کھیل جو موت میں نظر آتا تھا، انسان کو ان مصائب کی تلافی کرنا تھا جو تہذیبی زندگی عمومی طور پر اس پر عائد کرتی جا رہی تھی۔'' چنانچہ فرائڈ کا ایمان تھا کہ مذہب انسان کی بے بسی کے احساسات سے پیدا ہوا تھا اور دیوتاؤں (خدا) کا تصور اس کا ہی پرتو تھا۔ قدیم بالغ انسان کی زندگی زلزلوں سے لے کر بیماریوں تک ہر

طرح کے خطرات سے دوچار تھی، جب کہ ایک بچے کی شکل میں وہ اور بھی بے بس تھا لیکن اپنے باپ کو پہچانتا تھا۔ خواہ وہ اسے کتنا ہی مرعوب کن (Formidable) دکھائی کیوں نہ دیتا ہو۔ کم از کم وہ اسے خطرات سے بچاتا تھا۔ فرائڈ لکھتا ہے ''نوزائیدہ بچے کی بے بسی اور اس کی باپ کی خواہش میں مذہبی عقائد کی پیدائش کو اخذ کرنا مجھے مسلمہ اور غیر متنازعہ دکھائی دیتا ہے چونکہ خوف کے احساسات صرف بچپن تک ہی محدود نہیں ہوتے، بالغ افراد بھی قسمت کی اعلیٰ تر قوت کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں بچے کی باپ کے تحفظ کی ضرورت سے زیادہ طاقت ور ضرورت کا تصور نہیں کرسکتا۔'' اس سے قبل فرائڈ ان خطرات کی اہمیت پر روشنی ڈال چکا تھا جو فرد کو اندر سے خوف زدہ رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ آسیبی رسومات اور مذہبی اعمال (Practices) کے درمیان یکسانیت کو بیان کرتا ہے۔ اس کی نظر میں آسیبی رسومات اپنی انا کو تحفظ فراہم کرنے کا ذریعہ تھیں۔ عبادت بھی یہی کردار ادا کرتی ہے۔ فرائڈ کے نزدیک مذہب، تہذیب کے ایک جزو کے طور پر کچھ جبلی ابھاروں (Impulsus) کو دبانے اور ان کی نفس کشی کرنے کی بنیاد پر قائم ہے۔ تاہم یہ ہیجانات ایسے نہیں ہوتے جیسے اعصابی خلل میں جنسی جبلت لازمی طور پر ہوتی ہے۔ وہ ابھار سماجی طور پر ضرر رساں ہوتے ہیں لیکن مکمل طور پر جنسی عنصر سے خالی نہیں ہوتے۔ نیک لوگ چونکہ دعاؤں میں اپنے گناہ گار ہونے کا اعتراف کر لیتے ہیں، اس لئے انہیں مذہبی رسومات ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے اندر جو گناہ کی ترغیب پیدا ہو رہی ہے، اس کے خلاف دفاع اور ان جبلی قوتوں کو دور یا کنٹرول کر سکیں جن کا انہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ انہیں اندر سے توڑ دیں گی۔ فرائڈ نے اس حد تک توثیق کر دی تھی کہ مذہب کو انسانیت کا عالمی نفسیاتی مسئلہ قرار دیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ مذہبی عقائد بھی ان نفسیاتی الجھنوں کی طرح ہیں جنہیں انسانیت اپنی جہالت اور کم عقلی کے دور سے اپنے لاشعور میں دبائے رکھے ہے۔

فرائڈ کی تھیوری کے مطابق مذہب اندر سے اٹھنے والے ان سرکش ابھاروں سے عبادات اور رسومات کے ذریعے فرد کو تحفظ دلانے کا وعدہ کرتا ہے جن پر تہذیبی زندگی انفرادی رضامندی کے بغیر پابندیاں لگانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ نفس کشی کسی حد تک اپنے معاشرتی ساتھیوں کے ساتھ یک جہتی کو ممکن بنا دیتی ہے اور یوں جبلتوں کی تسکین کی بے بسی کا احساس کم تر ہو جاتا ہے۔ دوسرے مذہب کسی نہ کسی شکل میں زندگی بعد از موت کا بھی وعدہ کرتا ہے۔ اس سے موت کی دہشت کم ہوتی ہے اور یہ بھی سمجھ لیا جاتا ہے کہ بطور انعام آسمانی لذتیں بھی فراہم کی جائیں گی، ان دنیاوی لذتوں کے بدلے میں جو اس نے سماجی رسم و رواج کو قائم رکھنے اور تہذیب کے مفادات کے لئے چھوڑ دی تھیں۔ فرائڈ تہذیب کے عمل کو اعصاب کے لئے اشتعال انگیز قرار دیتا ہے۔ اگرچہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ اگر آدمی بطور انسان زندہ رہنا چاہتا ہے تو پھر اس کے لئے تہذیب ضروری ہے لیکن وہ ان ''زخموں'' کی بات کرتا ہے جو تہذیب کے عمل کے دوران فرد پر لگتے ہیں، جب وہ اسے ایک فطری زندگی بسر کرنے سے روکتی ہے۔

فرائڈ کی ایک مشہور کتاب ''مغالطے کا مستقبل'' (The Future of Illusions) ہے جس میں وہ تصور خدا کو انسان کا وہم اور مذہب کو خوش کن سرابوں کا پلندہ قرار دیتا ہے۔ کسی معاشرے میں مذہبی نظریات کو اتنی اہمیت اس لئے دی جاتی

ہے کہ عقائد انسان کی جذباتی اور نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ انسان جب کسی معاشرے میں پرورش پاتا ہے تو وہ ریاضی کے قانون دو جمع دو چار کی طرح مذہبی نظریات بھی وراثت میں پاتا ہے۔ ان نظریات کو روحانی رنگ میں پیش اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان کی تاریخی اہمیت کو کم کر کے مذہبی اہمیت کو بڑھایا جائے تاکہ اہل ایمان مقدس تحریروں، شخصیات، واقعات اور کرداروں کو تاریخی تناظر میں رکھ کر کوئی معروضی تجزیہ نہ کر سکیں۔ مذہبی خیالات منطق کے ذریعے نہیں بلکہ ایمان کے راستے انسان تک پہنچتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگوں کو بہت عزیز ہوتے ہیں۔ وہ خود کو خوش قسمت اور ایمان کی دولت سے مالا مال خیال کرنے لگتے ہیں اور جو ایمان نہیں رکھتے انہیں کم فہم سمجھتے ہیں۔

مذہبی علوم اور دیگر علوم میں یہ فرق ہے کہ اگر ہم بچپن میں جغرافیے کا سبق پڑھتے ہیں تو جوانی میں دنیا بھر میں گھوم پھر کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے جو جغرافیے کے اساتذہ نے پڑھایا تھا لیکن مذہبی علوم پر یہ اصول لاگو نہیں ہوتا۔ ان کے بارے میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ انہیں شک کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ایک زمانہ تھا، مذہبی نظریات کو شک کی نظروں سے دیکھنے والے کو سزا ملا کرتی تھی۔ فرائڈ کہتا ہے کہ یہ کوئی موثر دلیل نہیں کہ ان نظریات پر اس لئے ایمان لانا چاہیے کہ ہمارے آباؤ اجداد ان پر ایمان لائے تھے، اس لئے کہ ہمارے بزرگ کئی حوالوں سے ہم سے کم علم اور کم فہم تھے۔ فرائڈ مذہبی تعلیم کے حوالے سے واضح کرتا ہے کہ بچپن میں ہمیں جو علم دیا جاتا ہے اس کا سب سے اہم حصہ جس کا تعلق زندگی کے رازوں سے ہوتا ہے سب سے زیادہ غیر معتبر ہوتا ہے کیوں کہ ہم اس کی کوئی تصدیق نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی کو مذہبی عقائد کے سلسلے میں شک یا سوال کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ مذہبی عقائد کے بارے جتنے بھی ''ثبوت'' فراہم کئے جاتے ہیں انکا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی تصدیق نہیں ہو سکتی اور اگر مذہبی لوگوں کا سوالوں اور اعتراضات سے سامنا ہو جائے تو وہ کہتے ہیں کہ مذہبی عقائد منطق کے دائرے سے باہر اور بالاتر ہیں۔ عقائد کو انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے انہیں عقل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ فرائڈ سوال کرتا ہے ان لوگوں کا کیا ہو گا جنہیں عمر بھر یہ تجربہ نصیب نہ ہوا یا عقل کو تیاگ کر کسی داخلی تجربے کی وجہ سے نظریات تبدیل کرنے کو تیار نہ ہوں۔

بقول فرائڈ ''جب میں اپنے بچوں کو پریوں کی کہانیاں سنایا کرتا تھا تو وہ پوچھا کرتے تھے ''ابو! کیا یہ کہانی سچی ہے؟'' اور جب میں یہ کہا کرتا تھا کہ وہ کہانی سچی نہیں ہے تو ان کے چہروں پر ناگواری کے جذبات نمایاں ہوتے تھے، انہیں یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہو۔ مذہبی لوگوں کا بچوں سے بھی برا حال ہوتا ہے کیونکہ عقائد کی پریوں کی کہانیوں پر تقدس کا ملمع چڑھا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدتوں عقائد کو انسانی فکر اور تجربے کے ترازو میں تولنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

عقائد کی نفسیاتی وجوہ تلاش کرنے نکلیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسان کو تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے تصور خدا فراہم کرتا ہے۔ اسے مختلف خطرات کے خوف سے نجات دلاتا ہے نیکی اور بدی کا ایک پیمانہ بھی دیتا ہے اور زندگی کی ناانصافیوں کا مرنے کے بعد ازالہ بھی فراہم کرتا ہے۔ کائنات کی ابتداء، جسم اور روح کے رشتے اور زندگی کے دیگر مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔ اس سے انسانوں کو بہت سے سوالوں کے بنے بنائے جواب مل جاتے ہیں اور انہیں اپنے مسائل پر غور کر کے حل تلاش نہیں کرنے

پڑتے۔اس لئے لوگ مذہب میں ایک گوشہ عافیت اور سکون محسوس کرتے ہیں۔‘‘

فرائڈ کہتا ہے کہ اگر ایک درمیانے طبقے کی پرورہ لڑکی یہ باور کرلے کہ ایک دن ایک امیر شہزادہ آ کر اس سے شادی کرے تو ایسا ممکن ہے اور بعض دفعہ ایسا ہوا بھی ہے۔لیکن آسمانوں سے اترے خدا کے کسی نمائندے کا اس دنیا کو جنت بنانا بعید از قیاس ہے اور اس کا بالکل امکان نہیں، چاہے ہم اس یقین کو سراب کہیں یا دیوانگی کا حصہ۔ یہ لوہار کے اس ایمان سے مختلف نہیں تھی کہ ایک دن اس کا سارا لوہا سونے میں منتقل ہو جائے گا۔نفسیاتی مریضوں کے مصنوعی ایمان (Delusions) کو ہم منطق کی رو سے غلط ثابت کر سکتے ہیں لیکن عقیدے کے مقدس نفسیاتی سراب کا کیا کیا جائے۔ مذہبی عقائد کی بدقسمتی رہی ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی سچا ثابت نہیں کر سکتے بلکہ ہم نے صدیوں کی محنت اور ریاضت سے جو علم حاصل کیا ہے، انسان اور کائنات کے بارے جن حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے وہ عقائد ان سے بالکل لگا نہیں کھاتے۔اگر سائنس آج بھی زندگی اور کائنات کے بارے کچھ سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی پھر بھی سائنسی نقطہ نظر وہ واحد معتبر طریقہ ہے جس سے ہم زندگی اور کائنات کے بارے میں حقائق اور بصیرتیں حاصل کر سکیں گے، جن پر انسان متفق ہو سکیں۔اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر اپنی شخصیت اور ذہن کے بارے جان سکتے ہیں لیکن عالم گیر صداقتیں تلاش نہیں کر سکتے۔

گفتگو کے اس موڑ پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر مذہبی عقائد عقل اور دلیل سے ثابت نہیں ہوتے تو ان پر ایمان لانے میں کیا قباحت ہے، ان عقائد سے بہت سے دکھی اور غمزدہ دلوں کو ڈھارس بھی ملتی ہے۔فرائڈ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ جس طرح کسی شخص کو کسی بات یا عقیدے پر ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ہم کسی کو ایمان نہ لانے پر بھی مجبور نہیں کر سکتے لیکن انسان کو آزاد ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ناقدانہ سوچ کو معطل نہ کرے اور اس قسم کی باتوں سے دھوکا نہ کھائے۔ جہالت بہرحال جہالت ہے چاہے اس کے حق میں کتنے ہی بچگانہ دلائل کیوں نہ پیش کئے جائیں۔زندگی کے کسی اور شعبے میں کوئی شخص ایسی کمزور بنیادوں پر اپنی زندگی کے فیصلے نہ کرے گا لیکن مذہبی عقائد کی بحث میں لوگ ہر قسم کے حقائق سے چشم پوشی اور بے ایمانی روا رکھتے ہیں۔ مذہبی لوگ خدا کا ایک ایسا تجریدی تصور پیش کرتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ذہنوں میں تخلیق کیا ہوتا ہے اور پھر مصر ہوتے ہیں کہ انہوں نے حقیقت پا لی ہے۔تصور خدا انسان کی اپنی بے بسی اور مجبوری کے احساس کا نتیجہ ہے لیکن یہی بے بسی اور مجبوری کی زمین خدا اور مذہب کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون لوگ ہے جنہوں نے ایسے عقائد کو جنم دیا۔ بات سمجھ میں آتی ہے کہ زندگی اور کائنات کا غیر منصفانہ نظام دیکھ کر انسان نے خواہش کی کہ کاش ایک ایسا خدا ہو جو زندگی میں انصاف نافذ کرے اور اگر اس دنیا میں نہیں تو اگلی دنیا میں انصاف کی فضا قائم کرے لیکن یہ خیال ایک خواہش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔کاش ہمارے آباؤ اجداد نے مذہبی عقائد میں پناہ لینے کی بجائے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قبول کرنے اور کائنات کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہوتی۔

فرائڈ کے سامنے یہ سوال رکھا گیا کہ انسانی تہذیب اور ثقافت کی عمارت مذہبی عقائد پر استوار ہے اور اگر انسانوں کو یہ درس دیا گیا کہ نہ تو کوئی طاقت ور اور منصف خدا اور نہ ہی کوئی روحانی دنیا موجود ہے اور نہ موت کے بعد زندگی کی کوئی حقیقت

ہے تو وہ تہذیب کی سب روایات، اقدار اور قوانین کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔ طاقت کا ناجائز استعمال اور ظلم کا دور دورہ ہوگا۔ چنانچہ اگر ہم پر یہ حقیقت آشکارا بھی ہو جائے کہ مذہب کے دامن میں سچائیاں نہیں ہیں، تب بھی انسانیت کی بقاء کے لئے ہمیں اس حقیقت کو عوام سے چھپا کر رکھنا چاہیے۔ اگر ہم نے عوام سے ان کے عقائد چھین لئے تو بڑا ظلم ہوگا، ان گنت لوگ انہی بیساکھیوں کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔ مزید برآں انسان کی بہت سی نفسیاتی اور جذباتی ضروریات کا سائنس کے پاس کوئی علاج نہیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ ماہر نفسیات جو ساری عمر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ انسانی اعمال اور زندگی کے محرکات کا تعلق عقل سے کم اور جبلتوں اور خواہشات سے زیادہ ہے، آج انسانیت کو ان کی جذباتی خواہشات کی تسکین سے روک رہا ہے اور عقل کا ایسا درس دے رہا ہے جو انسانی تہذیب کی بقاء کے لئے نہایت مضر ہے۔

فرائڈ نے اس کا جواب یوں کیا ''میری نگاہ میں انسانی تہذیب اور ارتقاء کے لئے ان مذہبی عقائد پر ایمان لانا نہ لانے سے زیادہ خطرناک ہے۔ مذہب نے انسانی معاشروں پر ہزاروں سال حکمرانی کی ہے لیکن اس دور میں بھی انسانی زندگی مصائب و آلام اور ناانصافیوں سے پر تھی۔ اس دور میں بھی انسان گناہ کرتے تھے۔ مذہبی کتابوں اور اعتقادات کو جب تنقید اور سائنس کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان میں بہت سی کوتاہیاں اور خامیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مذہبی اعتقادات اور غیر مہذب قوموں (Primitive People) کی سوچ میں بہت سی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ انسانی تہذیب کو غیر تعلیم یافتہ اور مجبور و معتوب عوام سے زیادہ خطرہ ہے۔ مذہبی عقائد کی عمارت ڈھے جانے سے انسانی تہذیب کسی بحران کا شکار نہ ہوگی بلکہ اسی طرح جب گاؤں کے ایک مقدس درخت کو کاٹا تو لوگ خوف زدہ تھے کہ ان پر کوئی قیامت ٹوٹے گی لیکن اس واقعے کے بعد نہ تو کوئی عذاب آیا اور نہ ہی لوگوں کی جانیں خطرے میں پڑیں۔

ہمیں انسانی مسائل کے لئے خدا کی مرضی کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ مذاہب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف قوموں اور مختلف مذاہب میں خدا کی مرضی کو مختلف ہی نہیں، متضاد انداز میں پیش کیا گیا ہے اور کسی انسان کے لئے ان کی صحت کی جانچ پڑتال کرنا ناممکن ہے۔ اگر ہم انسانی زندگی کے معقول اور منصفانہ قوانین اپنے شعور، علم اور آپس کے مشورے سے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں اس عمل میں خدا، مذہب اور آسمانی کتابوں کو لانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا کرنے سے وہ قوانین آسمانوں سے اتر کر زمین پر آ جائیں گے۔ ان میں حالات اور انسانی معاشرے بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی لائی جا سکیں گی اور وہ حقیقت پسندانہ بھی ہوں گے۔ آسمانی قوانین کے ایک طرف نفاذ سے لوگوں کے اندر تلخی پیدا ہو جاتی ہے جب کہ اپنے بنائے قوانین کے بارے لوگوں کا رویہ ہمدردانہ اور دوستانہ ہوگا۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ ان میں ان کی اپنی بہتری مضمر ہے چنانچہ ہمیں قوانین کو خدا کے ساتھ منسوب کرنا چھوڑ دیں اور اس درمیانی کڑی سے نجات حاصل کر لیں تو ہم ارتقاء کے سفر کو ایک قدم آگے بڑھائیں گے۔

تاریخ کے مطالعے اور نفسیاتی سائنس نے ہم پر یہ اجاگر کر دیا ہے کہ مذہبی عقائد پر ایمان لانے میں لاشعوری محرکات نے اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ ہم ان لاشعوری عوامل کی بجائے اپنے شعور اور عقل پر زیادہ انحصار

کریں۔جس طرح ایک ذہنی مریض اپنی الجھنوں کی تفہیم کے بعد اپنا نقطہ نظر اور لائحہ عمل بدلتا ہے اور زندگی کے فیصلے عقل و دانش کی بنیادوں پر کرتا ہے۔ مذہبی عقائد اور نظریات صدیوں کے سفر کے بعد اتنے گرد و غبار سے ''اٹ'' گئے ہیں کہ ان میں سے حق اور سچ تلاش کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ پرانے زمانے میں انسان کا شعور بچوں جیسا تھا۔ان کے ساتھ استعاروں کی زبان استعمال ہوتی تھی لیکن آج انسان کا شعور بالغ ہو چکا ہے اگر آج اس کے ساتھ زندگی اور دنیا کے بارے میں مذہب کی استعاراتی زبان میں بات کریں تو سائنس جب انہیں حقیقتیں بتائے گی......تو لوگوں کا یہ گمان کرنا لازم ہے کہ مذہب کے نام پر ان سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی بچہ پوچھے کہ نوزائیدہ کہاں سے آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ آسمانوں سے اترتے ہیں اور انہیں پرندے لے کر آتے ہیں لیکن اس بچے کو بڑے ہو کر حقیقت کا ادراک ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں والدین نے دھوکا دیا تھا۔اب ہم جان گئے ہیں کہ بچوں سے استعاراتی زبان میں بات کرنے سے بہتر ہے کہ ہم ان کی عقل کے مطابق انہیں زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں بتائیں۔یہی صورت حال مذہبی عقائد کو ماننے والے انسانوں کی بھی ہے۔

ایمان رکھنے والا اپنے عقائد سے عقل کی بجائے جذبات سے جڑا ہوتا ہے لیکن ہمارے اردگرد بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے معاشرے کے خوف سے مذہبی روایات کو زندگی کی دیگر تلخ حقیقتوں کی طرح قبول کر رکھا ہے۔میرے خیال میں انسانوں کا عقل اور شعور کو قبول نہ کرنے کا عمل اس مذہبی تربیت کا حصہ ہے جو انسانوں کو بچپن سے دی جاتی ہے۔ہم بچوں کو اتنی چھوٹی سی عمر میں خدا، مذہب اور حیات بعدالموت کے بارے تصورات سکھاتے ہیں۔ جب ان کی عقل انہیں سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے اور وہ انہیں بلاسوچے سمجھے قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میری نگاہ میں ہم اپنے بچوں کے ساتھ دو طرح کی ناانصافیاں کرتے ہیں۔ ہم انہیں انسانی زندگی کے جنسی پہلو کی صحیح تعلیم سے محروم رکھتے ہیں اور انہیں مذہب کی غیر ضروری تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ایسی تربیت سے بچوں کا ذہن اور شخصیت اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ جوانی کے بعد بھی ان میں سے بہت سے اس تعلیم و تربیت کے مضر اثرات سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ سے ہی ڈرتے رہتے ہیں اور عقل و شعور استعمال نہیں کرتے۔فہم و فراست کے استعمال کے بغیر ہم کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ انسان اپنی بلوغت تک پہنچیں گے، اگر کسی انسان کا بچپن جنسی اور مذہبی پابندیوں سے داغ دار ہو تو اس کے ایک صحت مند زندگی گزارنے کے امکانات اور بھی کم ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بہتر مستقبل کے خواب دیکھنے چاہئیں اور انہیں شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ ایسا مستقبل جس میں انسانی بچوں کو غیر ضروری تعلیم نہ دی جائے گی اور وہ اپنی عقل کا پورا پورا استعمال کر سکیں گے۔ مجھے اس بات سے اختلاف ہے کہ انسان مذہبی سراب کے بغیر زندگی کے مسائل اور حقیقتوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے، جن لوگوں کی پرورش صحت مند اور آزاد ماحول مین ہو گی وہ زندگی کے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کائنات کا مرکز اور خدا کا چہیتا نہیں سمجھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسے خیالات سے بچپنا جھلکتا ہے۔ انسان بچپن میں اپنے آپ کو والدین کا منظور نظر سمجھتے ہیں لیکن بالغ ہو کر زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو ان کا رویہ حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ اگر انسانوں نے اگلے جہانوں سے بے جا امیدوں کو چھوڑ کر اسی دنیا میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا شروع کیا تو انسانی زندگی

میں ایک توازن پیدا ہوگا۔ انسان بچپن میں اپنا برا بھلا نہیں جانتا، وہ اپنی خواہشوں اور جبلتوں پر عمل کرتا ہے۔ اس وقت جذباتی محرکات عقلی محرکات کی نسبت زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

عقل و دانش کا نظام بھی انسانیت کے لئے احترام آدمیت کا تحفہ لے کر آئے گا جس کی مذہبی لوگ خدا سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک حوالے سے ہمارے مقاصد ایک ہی ہیں لیکن راستے جدا ہیں۔ ہم اپنی محنتوں کا پھل قیامت کی بجائے اگلی نسلوں میں پانے کے متمنی ہیں۔ تجربات اور عقل کے سامنے مذہب گھٹنے ٹیک دے گا، یہ طے ہے کہ مذہب ایک سراب ہے لیکن سائنس کی تحقیقات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم سراب کا پیچھا نہیں کر رہے ہے۔ سائنس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ سائنس پر یہ اعتراض سچائی پر مبنی نہیں کہ وہ ایک قانون پیش کرتی ہے اور کچھ عرصے بعد اس کی تردید خود ہی کر دیتی ہے۔ سائنسی تحقیقات حقائق سے آہستہ آہستہ پردہ اٹھاتی ہیں وہ کوئی انقلاب نہیں لاتیں۔ فرائڈ خدا اور انسان کے رشتے کے بارے لکھتا ہے ''یہ ایک ایسا احساس ہے جسے انسان ابدیت کے سنسنی خیز محسوسات قلبی میں ڈوب جانے کا نام دینا پسند کرتا ہے۔ کچھ اس طرح کا احساس جس میں انسان لامحدودیت کو بے پایاں سمندر کی طرح محسوس کرتا ہے۔''
فرائڈ اس احساس کو اس کیفیت سے موازنہ کر کے دیکھتا ہے جو محبت کی انتہا میں ہوتی ہے، جس میں عاشق اپنے محبوب کے ساتھ خود کو یکجا کر لیتا ہے۔ فرائڈ اس کی تشریح یوں کرتا ہے کہ ایسی کیفیت اپنی اس ابتدائی حالت کی طرف مراجعت ہوتی ہے جہاں شیر خوار بچہ ماں کی چھاتی کے ساتھ چمٹا ہوتا اور خود کو ماں کے ساتھ ایک ہی محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ جوں جوں بڑا ہوتا ہے، ماں سے خود کو الگ محسوس کرنا سیکھ لیتا ہے۔ چنانچہ محبت میں بحر بے کراں کا احساس فریب نظر کے سوا کچھ نہیں۔ فرائڈ محبت کی حالت کو بھی پاگل پن کی ہی ایک قسم سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جیسے جیسے علمی بلوغت کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کا خود پر اعتماد بھی زیادہ ہو رہا ہے۔ کائنات بھی اس کی نظروں کے سامنے شفاف ہوتی جا رہی ہے، چنانچہ خوف کے سائے تلے تصور خدا کے ساتھ چمٹے رہنے کی ضرورت کا جواز باقی نہیں رہا۔ اب انسان کو کسی ذہنی تحفظ کی ضرورت نہیں، وہ اس کائنات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے۔

انتھونی سٹار (Anthony Starr) فرائڈ سے اختلاف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فریب نظری کا مرتکب اور خوش آئند مغالطّوں کا شکار کوئی بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وجد (وہ عصبی حالت جس میں ذہن سوائے ایک خیال کے بالکل خالی ہوتا ہے) جیسی انتہائی انبساطی حالت (Ecstasy) کے تجربے سے صرف صوفی ہی نہیں گزرتے بلکہ آرٹسٹوں سے لے کر محققین اور سائنس دانوں تک کو ایسے لمحات پیش آتے ہیں جو ان کی زندگی میں اتنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں کہ دنیاوی زندگی کے بارے ان کی سوچ میں مکمل اور مستقل نوعیت کی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے لہٰذا ایسے وجدانی تجربات و احساسات کو نہ ہی مکمل طور پر مذہبی معنوں میں لیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں مکمل طور پر فریبانہ قرار دے کر رد کیا جا سکتا ہے۔

فرائڈ مزید برآں اپنی مذکورہ کتاب میں یہ خیال پیش کرتا ہے کہ مستقبل بعید میں عقل و دانش بالآخر اپنا لوہا منوا لے گی اور مذہبی عقائد ترک کر دیئے جائیں گے۔ فرائڈ کے الفاظ میں ''ہم جتنی بار اصرار کر لیں کہ جبلتوں کے مقابلے میں انسان کی

دانش (Intellect) بے بس ہے اور شاید ہم یہ کہنے میں حق بجانب بھی ہوں، تاہم اس کمزوری کا ایک بڑا عجیب پہلو بھی ہے، گو عقل کی آواز نرم خو ہوتی ہے لیکن یہ اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھتی جب تک سماعتوں کو اپنی طرف مائل نہیں کر لیتی۔'' یعنی جہالت کی گھن گرج سے علم کو کہاں تک دبایا جائے گا۔ واہمہ، کھلی حقیقتوں سے کب تک آنکھیں چرائے گا۔ پس ماندہ فکر ترقی کے عمل کو سست تو کر سکتی ہے اسے شکست نہیں دے سکتی۔ فرائڈ (Intellect) کو سائنس کے مساوی قرار دیتا ہے۔ مذکورہ کتاب سے فرائڈ کا مشہور عام فقرہ پیش خدمت ہے ''نہیں'' ہماری سائنس کوئی سراب نہیں البتہ یہ فرض کرنا سراب ہوگا کہ جو سائنس ہم کو نہیں دے سکتی، ہم کہیں اور سے حاصل کر سکتے ہیں۔''

No. Our Science is no Illusion. But an Illusion it Would Be to Suppose That WHat Science Can Not Give Us We Can Get Elsewhere.

آج کے جدید انسان کا یہ ہے وہ شاندار اعلان جس میں وہ اپنے زمانے بچپن کے تمام تصورانہ نظام ہائے عقائد کو دفن کر دیتا ہے کہ اب اس کے پاس علم کی اتنی روشنی اور ٹیکنالوجی کی اتنی قوت میسر آ چکی ہے کہ اسے مزید اوہام کے سہارے زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

فرائڈ جب مذہبی خدا کی بات کرتا، تو اس کی طرف وہ ہمیشہ ''تمہارا خدا'' یا ''روایتی عقیدے کا خدا'' کہہ کر اشارہ کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب صدائے عقل (The Voice of Reason) ہوا کرتا تھا۔ فرائڈ نے ''ہمارے اور تمہارے خدا'' میں امتیاز کر کے مذہبی اور سائنسی فکر کے تضاد کو واضح کر دیا ہے۔ روایتی تصور خدا کو کتنا بھی پالش کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے ساتھ وابستہ دیگر عقائد عقل سے براہ راست ٹکراتے رہیں گے۔ اسی لئے مذہبی حلقوں کا اصرار رہتا ہے کہ خدا کے معاملے میں ''زیادہ عقل سے نہیں سوچنا چاہیے۔'' اس طرح وہ بالواسطہ اپنے کمزور موقف کو تسلیم کرتے ہیں کہ روایتی تصور خدا صرف اندھے عقیدے سے ہی قائم رہ سکتا ہے۔ انہیں پتہ نہیں چلتا کہ اس سے خالق کائنات کی عجب تصویر بنتی ہے کہ وہ اپنے ہی بنائے ہوئے سوچنے سمجھنے والے آلہ عقل کا سامنا کرنے سے گریزاں ہے اور انسانوں کے ادراک میں بذریعہ عقل اترنے کی بجائے ان کے اندر وہم بن کر جاگزیں ہونے کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ فرائڈ نے عقل کی آواز کو ''ہمارا خدا'' کہہ کر اس بات کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ آج خدا کے معنی بدلنے کی ضرورت ہے۔ زمانہ جاہلیت کے ہزاروں سال پہلے والے قدیم انسان کا بنایا تصور خدا اس علم کی توہین ہے جسے انسان نے اپنے ہزاروں سال کے تہذیبی اور ثقافتی سفر میں اپنی گہری مغزماری اور تجربوں سے اکٹھا کیا ہے۔

فرائڈ کا شمار ان مفکروں مین ہوتا ہے جنہوں نے 20 ویں صدی کے انسانی نقطہ نظر میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ڈارون نے واضح کیا تھا کہ انسان خدا کی کوئی خصوصی مخلوق نہیں بلکہ وہ صرف حیوانیت سے قدرتی طور پر نشو ونما پا کر انسانی سطح تک پہنچا ہے، جب کہ فرائڈ نے انسان کو خود اپنے بارے خوش فہمی پر مزید ضرب لگاتے ہوئے کہا کہ انسان اپنے ''دماغی گھر'' (Mental House) میں اتنا مالک و مختار نہیں ہے جتنا فرض کیا جاتا ہے۔ فرائڈ نے زور دے کر کہا کہ انسان کے فلسفہ و آرٹ میں اعلیٰ ترین کارنامے محض فروتر جبلی ابھاروں کی لطیف اور برتر شکلیں ہیں، اسی طرح فرائڈ نے معاشرے

میں ''نیکی، ایثار اور اخلاص کے پتلوں'' کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے پیچھے بھی جنسی لذت عطا کرنے والی خود اذیتی (Masochistic Self Punishment) اور اپنے سر پرستانہ جذبے کو پوشیدہ کرنے جیسے نفسیاتی عوامل ہوتے ہیں۔ فرائڈ بے باک اور طبع زاد (Original) مفکر تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ انسانوں کے بارے صداقت کے نئے پہلوؤں کو جان گیا ہے۔ مذہبی لوگوں کو بڑی آسانی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں تیار (Ready Made) صداقت مل جاتی ہے، جہاں کسی کھوج، تفتیش اور سچائی کے حصول کی تڑپ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب کہ سیکولر نقطہ نظر کے حامل افراد کو اپنی صداقت کی پیاس بجھانے کے لئے زبردست شوق، جذبے اور جدوجہد سے گزرنا پڑتا ہے۔ فرائڈ کے موت کے حوالے سے بھی خیالات قابل توجہ ہیں۔ موت تصور خدا کے پیدا کرنے میں ایک بڑا طاقت ور عنصر رہا ہے۔ بعد از فرائڈ موت کو ''موت کی جبلت'' کہا جانے لگا۔ اصول نروان کا کہنا ہے کہ کسی بھی جسم حیوانی (Organism) کی پیہم کوشش ہوتی ہے اس مقام تک پہنچنے کی جہاں کوئی بھی محرک (Stimuli) اندر یا باہر سے اس کے ابدی سکون میں مخل نہ ہو سکے۔ فرائڈ کے الفاظ میں ''ہم دو بنیادی جبلتوں کو ہی اس وقت فرض کرتے ہیں، ایک محبت (زندگی) کی جبلت (Eros) اور دوسری تباہی کی جبلت......اول الذکر جبلت کا مقصد عظیم تر اتحادوں (Unities) کو قائم کرنا اور انہیں محفوظ رکھنا ہوتا ہے، یعنی اس کام باہم جوڑنا ہے۔ اس کے برعکس دوسری جبلت کا نصب العین رشتوں کو توڑ کر چیزوں کو تباہ کرنا ہوتا ہے۔ تباہی کی جبلت کا بالآخر مطمع نظر جاندار چیز کو پھر غیر نامیاتی حالت (Inorganic State) میں لے آنا ہے۔ اسی سبب سے ہم اسے موت کی جبلت کہتے ہیں۔'' یعنی

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اجزاء کے درمیان ترتیب و پریشانی (زندگی اور موت) کا مستقل عمل جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔ وہ مادے کی خود اپنی فطرت میں شامل ہے نہ کہ کسی خارجی شعور کی مرضی و منشاء کا محتاج۔ تو پھر ''روح'' کیا ہے، انسان جو اپنے اندر ''میں'' محسوس کرتا ہے وہ کدھر سے آتی ہے اور کدھر کو جاتی ہے؟ مذہب نے ہزاروں سال تک اس سوال کا خوب استحصال کیا ہے اور تصور خدا کی ساری عمارت زندگی اور موت کے عمل کی لاعلمی (Ignorance) پر تعمیر کی۔ فرائڈ کے مطابق ''میں'' شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ انسان کی ''میں'' اور روح کا احساس اصلاً سطح جسم کی حس (Sensation) سے پکتا ہے چنانچہ ''میں'' اور روح کا احساس کا انحصار خود اپنے ہی جسم کو بطور الگ ہستی کے متصور کرنے پر ہے۔

"Ego Originaly Derived From Sensations
Springing From the Surface of the Body
The Sense of I Depends Upon the Perception
of Ones Own Body As a Seperate Entity."

جس کی وجہ سے ''انا'' تیسری اور خارجی دنیا کے درمیان میں ثالث (Intermediary) کا کردار ادا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جسمانی ادراک (Sensory Perception) اور حرکی سرگرمیوں (Motor Activity) کے درمیان

قدرتی تعلق ہونے کی وجہ سے ''روح'' رضا کارانہ حرکات کو کنٹرول کرتی ہے تاہم ''انا'' کا بنیادی کام تحفظ نفس ہوتا ہے۔

مختصراً انسانی ذہن کا سائنس دان سگمنڈ فرائڈ مذہب کو فریب نظر قرار دے کر اسے مسترد کرتا ہے۔ تاہم وہ کسی ایسی منظّم کوشش کی ضرورت کا قائل تھا جو جدید علم کی روشنی میں اس کائنات کے بارے کوئی مربوط مفہوم اجاگر کرے۔

آئین اسٹائن! خدا کا چیف انجینئر

مشرقی یورپ کے یہودیوں میں زندگی کی خوشیوں اور غموں کو بیان کرنے کے لئے ایک میوزیکل کہانی اسٹیج کی جاتی ہے جس میں پردہ اٹھنے کے بعد ایک بوڑھا یہودی چھوٹے سے گھر کی چھت پر بیٹھے سارنگی (Fiddle) بجاتے دکھایا جاتا ہے۔ اس بوڑھے یہودی کو جب بھی اپنا ساز بجانا ہوتا ہے وہ چھت پر جا بیٹھتا ہے۔ چھت پر جانا خدا سے اس علامتی قرب کا اظہار ہے جو ایک یہودی اپنے خدا کے لئے محسوس کرتا ہے۔ یہودیوں کا خدا کے ساتھ بڑا عجیب رشتہ رہا ہے۔ یہ اپنے کو خدا کی چہیتی قوم سمجھتے ہیں۔ انہیں خدا کے ساتھ اپنے خصوصی تعلقات کا بے حد زعم رہا ہے۔ عہد نامہ عتیق (تورات) سے ظاہر ہوتا ہے جیسے خدا کو اسرائیلی قوم کے علاوہ کسی اور قوم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ خدا اسرائیلی بستی کا ایک باشندہ معلوم ہوتا ہے۔ روایت کے مطابق خدا اسرائیلی بزرگوں (انبیاء) کے ساتھ باقاعدہ ایک رسمی عہد نامہ کے ذریعے خود کو پابند کر چکا ہے کہ وہ ہمیشہ اسرائیلیوں کے ساتھ رہے گا۔ کوئی کتنا ہی اپنا کیوں نہ ہو، اس کے ساتھ ہر وقت احترام اور اطاعت کا رشتہ تو برقرار نہیں رہ سکتا، چنانچہ یہودی گاہے بگاہے خدا سے الجھتے رہے۔ خدا کی حکم عدولی کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن اس سے خدا کے ساتھ یہودیوں کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ دو طرفہ وقتی ناراضگی کے ساتھ وہ رشتہ پھر بحال ہو جاتا ہے۔ اس لئے خدا نے ان کا نام پیار سے ''اسرائیل'' یعنی ''الجھنے والے'' رکھا۔

آئین اسٹائن کو بھی نہ صرف وائیلن بجانے کا شوق تھا بلکہ وہ بڑے مخصوص انداز میں اپنی تقریروں اور تحریروں میں خدا سے باتیں کرتا اور اس سے الجھتا نظر آتا ہے اور یہ سلسلہ اس کی نوعمری سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ ابھی 18 سال کا ہی تھا وہ اپنے دوست کو لکھتا ہے ''شدید محنت اور خدا کی قدرت پر غور و خوض کرنے والے فرشتے زندگی کی ہنگامہ آرائی میں میری راہنمائی کرتے ہیں...... کبھی ہمت بندھوا کر، کبھی حالات کے ساتھ سمجھوتہ کروا کر...... لیکن یہ سب کچھ بے رحمانہ شدتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔'' یہی آئین اسٹائن جب 40 سال کا ہوتا ہے، ساری دنیا میں اس کی تھیوری کی دھوم مچی ہوتی ہے، سائنس دان اس کی تھیوری پر اپنے تجربات کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک تار موصول ہوتا ہے جس میں آئین اسٹائن کو اطلاع دی جاتی ہے کہ سورج کی روشنی میں خم اس کے عمومی نظریہ اضافیت (General Theory of Relativity) کے عین مطابق ہے، تو اسے ایک طالب علم پوچھتا ہے...... سر! اگر آپ کے نظریئے کی تصدیق نہ ہو پاتی تو آپ کا ردعمل کیا ہوتا؟ آئین اسٹائن نے بے ساختہ جواب دیا...... ''پھر مجھے پیارے خدا پر بڑا افسوس ہوتا کہ میرا نظریہ تو بہرحال صحیح تھا......'' اس کے

دوسال بعد مئی 1921ء میں آئین اسٹائن کو پرنسٹن یونیورسٹی میں ایک لیکچر کے دوران ایک تجربے کے نتیجے کی ایسی خبر پہنچائی گئی کہ اگر وہ سچ ہوتی...... (جو بعد میں سچ ثابت نہ ہوئی) تو اس کے نظریئے کی تردید ہو جاتی۔ اس افواہ کو سن کر آئین اسٹائن نے کہا ''خدا لطیف ضرور ہے لیکن بد اندیش نہیں۔''

(Subtles is The Lord, But Malicious He is Not.)

آئین اسٹائن کے منہ سے لفظ خدا کے کثرت استعمال پر ایک بار اس کے ایک ہم عصر (Niels Bohr) نے اسے کہا ''خدا کو بتانا بند کرو کہ اس نے کیا کرنا ہے۔''

Stop Telling The God What to Do.

انسان کے عروج کی کہانی میں نیوٹن اگر ''عہد نامہ قدیم'' (تورات) کی حیثیت کا حامل تھا تو آئین اسٹائن کو ''عہد نامہ جدید'' (بائبل) کی حیثیت حاصل تھی۔ آئین اسٹائن کا شعور اس کائنات کے علم میں اتنا ڈوب چکا تھا کہ اس کی زندگی اور اس کے کام میں ہمیں ایک ''خدائی فکر'' دکھائی دیتی ہے۔ 1942ء میں جب آئین اسٹائن 63 سال کا ہو جاتا ہے وہ اپنے ایک ساتھی سائنس دان کو لکھتا ہے ''خدا کے ہاتھ میں پکڑے تاش کے پتوں کو دیکھنا بڑا مشکل نظر آتا ہے لیکن میں ایک لمحے کے لئے بھی یقین نہیں کر سکتا کہ خدا پانسہ (Dice) کھیلتا ہے اور وہ ٹیلی پیتھی ذرائع کو استعمال کرتا ہے۔ (جیسا کہ Quantum Theory) کے مطابق ایسا ہوتا نظر آ رہا تھا۔) مندرجہ بالا واقعات ہمیں آئین اسٹائن کو ایک ایسے آلے کے طور پر پیش کرتے ہیں جو خدا کے ''پتوں'' (Cards) کو جھانکنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس کے ساتھ بحث مباحثہ کے لئے بھی تیار رہتا ہے۔

بیسویں صدی تک کی تاریخ کا یہ عظیم سائنس دان جمعہ کے دن مارچ کے مہینے 1879ء یہودی ماں باپ کے گھر پیدا ہوا، جس کا نام البرٹ رکھا گیا۔ وہ ایک آزاد خیال ایسا گھرانہ تھا جہاں نہ مذہبی شدت پسندی تھی نہ اس گھر میں مذہبی مسائل اور خدائی فرمان زیر بحث آتے تھے بلکہ البرٹ کا باپ اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ یہودی رسوم ان کے گھر میں ادا نہیں ہوتیں۔ البرٹ کو جب 6 سال کی عمر میں پرائمری سکول میں داخل کرایا گیا تو اس وقت جرمن قانون کے مطابق سکول کی عمر کے تمام بچوں کے لئے مذہبی تعلیم لازمی تھی (تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں آج بھی ایسا ہی ہے) البرٹ کے اسکول میں صرف کیتھولک دینیات پڑھائی جاتی تھی۔ چنانچہ گھر میں ایک دور کے رشتے دار نے یہودی مذہب کی مبادیات پڑھانی شروع کر دیں۔ سکول اور گھر کی مذہبی تعلیم نے آئین اسٹائن کے اندر مذہبی شدت پسندی کا رجحان پیدا کر دیا۔ جیسا کہ اس عمر میں کچے ذہن کی وجہ سے نوجوان اکثر اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ 11 سال کی عمر میں ہی وہ اتنا جوشیلا ہو گیا کہ اس نے مذہبی کتب اور قوانین کا تفصیلی مطالعہ شروع کر دیا۔ مذہب کے زیر اثر اس نے سور کا گوشت بھی کھانا بند کر دیا۔ اس پر پرہیز گاری اور مذہبی جنون اس حد تک سوار ہوا کہ خدا کی حمد و ثناء میں اس نے مذہبی گیت بھی کہنے شروع کر دیئے جنہیں وہ سکول کے راستے میں بڑے جوش و جذبے سے گایا کرتا تھا......لیکن مذہب کا یہ جوش ایک سال بعد ہی اس وقت اچانک ٹوٹ گیا جب نوجوان آئین اسٹائن کا واسطہ سکول میں سائنس کے مضمون کے ساتھ پڑا۔ آئین اسٹائن مذہب کے چھوٹ جانے کا ذکر خود ان الفاظ میں کرتا

ہے ”مقبول عام سائنسی کتب پڑھنے کے بعد میں جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ بائبل کی زیادہ تر کہانیوں میں سچائی نہیں ہو سکتی......اس کا نتیجہ ایک مثبت آزاد خیال پسندی کی صورت میں ابھرا، جس کے ساتھ یہ تاثر بھی پیدا ہوا کہ ریاست نوجوانوں کو مذہبی تعلیم دے کر کذب کی مرتکب ہو رہی ہے اور انہیں سوچے سمجھے دھوکا دے رہی ہے۔ یہ بڑا اتباہ کن تاثر تھا۔ لہٰذا ہر اتھارٹی کے خلاف تشکیل کا احساس ابھرا۔ عقائد کے بارے شکوک وشبہات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ وہ مقدس عقائد جو مخصوص سماجی ماحول میں پائے جاتے ہیں...... یہ ایک ایسا رویہ تھا جس نے مجھے پھر کبھی نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ بعد میں...... جب مجھے علت و معلول کے رشتوں کی ایک بصیرت مل گئی۔ میں اس سے بخوبی واقف ہوں کہ جوانی کا مذہبی بہشت جو اس طرح کھو گیا، پہلی کوشش تھی......خود کو اپنی ذات کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی......ایسے وجود سے آزادی جس پر کہنہ احساسات، امیدیں اور خواہشیں غالب ہوتی ہیں۔ دوسری طرف نگاہوں کے سامنے یہ عظیم کائنات تھی جو ہم انسانوں سے آزادانہ طور پر وجود رکھتی ہیں جو ہمارے سامنے ایک عظیم ابدی پہیلی کے طور پر کھڑی ہے، اور یہ کائنات کم از کم جزوی طور پر ہماری سوچ اور جانچ پڑتال کی رسائی میں ہے۔ اس دنیا پر غور فکر نے مجھے چپکے چپکے آزاد کرنا شروع کر دیا تھا اور میں نے جلد ہی دیکھا کہ اپنی ذات سے باہر کی معروضی دنیا پر ذہنی گرفت اپنے امکانات کی حد تک میرے اندر کی آنکھوں کے سامنے شعوری اور غیر شعوری طور اعلیٰ نصب العین کی حیثیت سے تیرنے لگی۔ اس طرح ماضی اور حال کے وہ تمام بصیر لوگ جو باعث تحریک ہوئے تھے، ایسے دوست ہو گئے جو کھو نہیں سکتے تھے......اس نئی جنت کی طرف جانے والی راہ مذہبی جنت کے راستے کی طرح آرام دہ تھی، نہ ہی اس جیسی دلربا......لیکن یہ راہ خود کو قابل بھروسہ ثابت کر چکی تھی اور مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا......اس کے انتخاب میں......“

آئین اسٹائن نے سائنس کی دنیا میں داخل ہوتے ہی مذہب کے چھوٹ جانے کے جن تاثرات کا نہایت خوبصورتی سے اظہار کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک سوچنے سمجھنے والا ذہن مذہب کو ذرا سا بھی ناقدانہ نظر سے دیکھے، تو اندھے عقائد اور زمانہ جاہلیت کے تصورات پر مبنی مضبوط عمارت نہایت کھوکھلی نظر آنے لگتی ہے۔ تقدیس کی تنگ اور اندھی دنیا سے باہر نکل کر ہی انسان اور فطرت کے ساتھ باہمی مکالمہ کا آغاز کر سکتا ہے۔ عقائد کی زنجیروں سے آزاد ہو کر انسانی فکر کو آزاد ماحول میں زقند میسر آتی ہے، اس سے فطرت کے مخفی اسرار کھلنے شروع ہوتے ہیں۔ آئین اسٹائن اس بات کا بھی ذکر کرتا ہے کہ ”علمی جنت“ کا یہ سفر مذہبی جنت کے دل لبھانے والے رستے سے کس قدر مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہاں ”خدا والا ریڈی میڈ“ آسان نسخہ موجود نہیں ہوتا، جو کائنات کی تسخیر اور تفتیش کی بجائے پوجا پاٹ میں لگا دیتا ہے۔ سائنس کی دنیا میں خود ہی سوال کرنا ہے اور اس کا جواب بھی اس کائنات کو ہی میڈیم بنا کر اپنی دماغی صلاحیتوں سے حاصل کرنا ہوتا ہے، تب جا کر پر حقائق علم کی جنت میسر آتی ہے۔ مذاہب فطرت کے مقابل انسان کو حقیر اور کمزور قرار دینے کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن سائنس انسان کے اندر بھروسہ اور اعتماد پیدا کرتی ہے۔ وہ انسان کو سر اٹھا کر ”خدا“ سے ہم کلام ہونے کا حوصلہ دیتی ہے جس سے انسان مادے کی اندرونی اور بیرونی لامحدود حیرتوں سے بھری دنیا میں بہ نفس نفیس سفر کر کے اپنی دنیا کو خوب تر بنانے کی سعی کرتا ہے۔ جب کہ عقائد زدہ لوگ خیالی اور خوابی دنیا کی ذہنی لذت میں ڈوب کر اس قیمتی زندگی کو برباد کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئین اسٹائن کو اپنے دور شباب کی مذہبی

بہشت کے چھوٹ جانے اور سائنس کی دنیا کے انتخاب پر زندگی بھر افسوس نہیں ہوا۔

1905ء جب آئین اسٹائن سوئٹزرلینڈ کے شہر برن کے دفتر رجسٹری ایجادات میں کلرک تھا تو اس نے یکے بعد دیگرے علم طبیعات کی دنیا میں انقلاب برپا کر دینے والے نظریات پیش کئے۔ ان میں سے ہر ایک تھیوری آئین اسٹائن کو 20 ویں صدی کا عظیم سائنس دان بنانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن اسے اپنی اکیڈیمک پوزیشن حاصل کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جس کی ایک وجہ اس کا یہودی النسل ہونا بھی تھا۔

گو کہ آئین اسٹائن اپنی نوجوانی میں ہی چرچ اور ''سناگاگ'' (یہودی عبادت گاہ) کی کٹر عقیدہ پرستیوں سے آزاد ہو چکا تھا لیکن وہ سنوات بلوغت سے ہی تصور مذہب کے بارے اکثر و بیشتر اپنے خیالات کا اظہار اپنی تحریروں اور تقریروں میں کر دیا کرتا تھا۔ 1936ء میں جب اس کی عمر 57 سال ہو چکی تھی...... ایک نوجوان لڑکی نے اپنے خط میں یہ سوال کیا ''کیا سائنس دان بھی دعائیں مانگتے (Pray) ہیں اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو کیا دعا کرتے ہیں؟'' آئین اسٹائن کا جواب تھا ''ایک سائنس دان کے لئے اس یقین کی طرف مائل ہونا بہت مشکل ہوگا کہ حالات و واقعات کا سلسلہ پرستش اور دعاؤں کے زیر اثر تبدیل ہو سکتا ہے۔ دعا تو فقط ایک خواہش کا نام ہوتا ہے جسے ایک خیالی ماورائی ہستی کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے جب کہ اس کے برعکس ہر ایک شخص جو سنجیدگی سے سائنسی سرگرمی میں ملوث ہے، اسے فطرت کے نظام سے ایک ایسی روح کا احساس ضرور ہوتا ہے جو انسان سے بے انتہا اعلیٰ و ارفع ہے اور جس کے سامنے انسان کو اپنے طبعی اور فطری ضعف کے ساتھ انکسارانہ طور پر سرنگوں کر دینا چاہیے...... چنانچہ سائنسی مشغولیت و استغراق بھی ایک خصوصی قسم کے مذہبی احساسات کی طرف لے جاتی ہے، جو عام لوگوں کی مذہبیات سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہے۔''

مندرجہ بالا خط کی روشنی میں اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا آئین اسٹائن مذہبی تھا تو اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ 'ہاں' اس خصوصی مفہوم میں جس کا ذکر اس نے خود کیا ہے اور 'نہیں' اس روایتی و مروجہ مذہب کے معنوں میں، جس پر عام لوگ یقین کئے بیٹھے ہیں۔ آئین اسٹائن اس بات کو صاف کر دیتا ہے کہ روایتی عقائد کے مجموعے اور نظام سائنس کے لئے ناقابل قبول ہیں اور ان کا سائنس سے بنیادی و اساسی اختلاف ہے لیکن جہاں تک انسان کے روحانی احساسات کا تعلق ہے، لاابتدا و لاانتہا کائنات کے سلسلوں کا علم و ادراک بھی انسان کے شعور میں ایک گہری کومل کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ گویا آئین اسٹائن اس بات کی تصدیق کرتا نظر آتا ہے کہ روایتی خیالی خدا کے ایمان کے بغیر کسی طرح کا کوئی روحانی خلا پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ سائنس کا صداقت بھرا علم اسے کہیں زیادہ معتبر اور مثبت طریقے سے پر کر دیتا ہے۔ ''ملا کی اذان اور سائنس کی اذان اور'' کا ذکر آئین اسٹائن کے 1930ء کے ایک اور مضمون میں بھی ملتا ہے۔ جس میں وہ خود کو ایک گہرا مذہبی آدمی قرار دیتا ہے!

''کسی ایسی شے کے علم کا احساس جس کے اندر سے ہم نہیں گزر سکتے لیکن وہ اس عمیق فراست اور نہایت تابندہ ادراک کی صلاحیتوں کی زد میں ہے جو ہمارے ذہنوں کو میسر ہیں اور یہی علم اور جذبہ مل کر سچی مذہبیت پیدا کرتی ہیں۔ صرف اس مفہوم میں اور فقط اکیلے انہی معنوں میں، میں ایک گہرا مذہبی آدمی ہوں۔ میں ایک ایسے خدا کے تصور پر ایمان نہیں کر سکتا جو اپنی

مخلوقات کو جزا و سزا دیتا ہے یا وہ بھی ویسی ہی مرضی و منشا رکھتا ہے، جیسی کے ہم مالک ہیں...... میں کر سکتا ہوں، نہ میں کرنا چاہوں گا...... ایک ایسے فرد کا تصور، جو جسمانی موت کے بعد بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ کمزور روحوں کو خوف اور فضول قسم کی انانیت (Egoism) کے نتیجے میں پیدا ایسے خیالات کو پالنے دیجئے۔ میں کائنات کی پر اسرار ابدیت اور اس عالم کی شاندار ساخت کے علم اور مشاہدے سے ہی مطمئن ہوں۔'' انسانی تاریخ کا یہ عظیم سائنس دان باتوں باتوں میں مذہب کی پیدا کردہ کوتاہ نظری کے مقابلے میں سائنس کی اعلیٰ بصیرت کو کتنے عام فہم اور بجچے تلے الفاظ میں سامنے لاتا ہے، جس سے سائنس دان اور صوفی ایک ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی کو جیسی ہے، ویسے ہی اسے کائنات کے تناظر میں رکھ کر دیکھتا ہے، نہ فطرت کی لامحدود پہنائیوں سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے سربسجود ہوتا ہے اور نہ ہی اجر و ثواب کا متمنی۔ اس کے لئے ''خدا'' (کائنات) کی آگہی اور شعور ہی کافی ہے۔ آگے چل کر آئین اسٹائن کہتا ہے ''اس ساری کائنات کا مکمل علم تو ہم حاصل نہیں کر سکتے، البتہ اس کے جزوی علم کو پانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینی چاہیے۔ خواہ وہ علم اس کائنات کے مقابل کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ وہ علم اس عقلی استدلال (Reason) کی بنیاد پر ہوگا جسے فطرت خود آشکار کرتی ہے۔'' آئین اسٹائن اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ کائنات پر مکمل عبور منطقی اور فلسفیانہ طور پر ناممکن نظر آتا ہے۔

جب حد ہی کوئی نہیں، تو پھر اسے مکمل فتح کیسے کیا جا سکتا ہے لیکن انسان کو دنیاوی جزوی علم وسیع تر کرنے کے لئے ہر آن مصروف پیکار رہنا چاہیے۔ کسی علم کا خود کو مکمل اور حرف آخر کہنا بذات خود سب سے بڑی جہالت ہے اور جہالت عقل سے بہر حال نہیں پھوٹتی۔ عقل اس مادے کی مخصوص ترتیب و تنظیم اور ارتقائی عمل کی ایسی پیداوار ہے جو عین قوانین فطرت کے مطابق تشکیل شدہ ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں عقل اور کائنات کی طول موج (Wave Length) ایک جیسی ہیں جس سے عقل اس کائنات کی ترتیب و تنظیم کا عین فطرت کے مطابق ادراک کر لیتی ہے۔ عقل سے جدا کوئی دوسرا ذریعہ علم کائنات کی حقیقتوں سے ٹکرانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں قیاس فرضی اور اندھے عقائد کی ضرورت پیش آتی ہے اور انہیں عقل سے ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے، مبادا وہ ان کا پول کھول دے۔ 1930ء کے ہی ایک اور مضمون میں آئین اسٹائن مذہبی خیالات اور مذہبی اداروں کو خوف کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ ''قدیم انسان کے اندر جو مذہبی خیالات پیدا ہوئے، وہ ان تمام خوفوں کی پیداوار تھے، جن سے اس کا سامنا ہوتا تھا...... بھوک کا خوف، وحشی جانوروں کا خوف، بیماری اور موت کا خوف۔ چونکہ انسان اس وقت اپنی زندگی کے اس مرحلے پر تھا جہاں انسان کی علت و معلول (Cause And Effect) کے رشتوں کی تفہیم کی سطح بہت معمولی سی تھی۔ انسانی ذہن خیالی پیکر تخلیق کرتا جو کم و بیش خود اس سے ہی مشابہ تھے۔ وہ ان ارادوں اور اعمال کی نمائندگی کرتے، جن پر ان سارے پر خوف واقعات کا انحصار تھا۔ چنانچہ انسان کی کوشش ہوتی کہ وہ ان پیکروں کی شفقت اور نوازشات حاصل کرے۔ اپنے ہی ذہن کے پیدا کردہ خیالی پیکروں کی خوشنودی کے لئے پرستش کی رسومات ادا ہونے لگیں۔ انہیں منانے اور راضی کرنے کے لئے قربانیاں پیش کرنے لگا۔ فانی بشر نے دیوتاؤں کو سنوارنا اور سجانا شروع کر دیا۔ خوف کی کوکھ سے جنم لینے والے مذاہب کو اس طبقے نے انتہائی درجے تک پختہ کیا...... جس نے خود کو لوگوں اور ان

پیکروں کے درمیان (جن سے لوگ خوف کھاتے تھے) ثالث کے طور پر پیش کر دیا اور یوں عام لوگوں پر اپنی برتری قائم کر لی۔ بارہا یوں بھی ہوا کہ زعماء، سرداروں اور حکمرانوں یا مراعات یافتہ طبقے نے اپنے دنیاوی اختیارات کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشوئیت کے اعمال اور ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں تاکہ خود کو زیادہ محفوظ کر لیا جائے یا پھر سیاسی حکمران اور مذہبی پیشوا اپنے اپنے مفادات کی مشترک مقاصد کے لئے اکٹھے ہو گئے......'' یہاں پر آئین اسٹائن ایک سائنس دان ہی نہیں رہتا بلکہ وہ علم انسانیات، تاریخ اور تہذیبی ارتقاء پر ایک نہایت گہری نظر رکھنے والے ماہر کے طور پر بھی سامنے آتا ہے اور اس کی تصدیق کرتا ہے کہ خدا کا تصور انسانی واہمہ کی پیداوار تھی اور پھر کس طرح مذہبی پیشواؤں اور حکمرانوں نے اسے عوام کو بےوقوف بنانے کے لئے استعمال کیا۔ ایک اور جگہ آئین اسٹائن جدید انسان کی زندگی میں مذہب کے رول کے بارے لکھتا ہے '' انسانی زندگی کا کیا مطلب......؟'' اس سوال کا جواب پانے کا مطلب ہی مذہبی ہوتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سوال اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی......تو میرا جواب یہ ہوگا کہ کوئی آدمی اگر اپنی اور دیگر مخلوقات کی زندگی کو بے معنی سمجھے گا تو نہ صرف وہ خود خوش نہ ہوگا بلکہ بذاتہ زندگی کے لئے غیر موزوں بھی ہو جائے گا۔'' ہم دیکھتے ہیں کہ مذاہب کے داعی اس پر بڑا اتراتے ہیں کہ مذہب انسان کی زندگی میں معنی بھر دیتا ہے۔ مزید برآں خدا کے تصور کے بغیر زندگی کا کوئی مطلب نہیں رہے گا اور انسان اپنے اندر ایک خلاء محسوس کرے گا...... کہ آخر میری ہستی اور اس کائنات کا سارا ہنگامہ کس لئے ہے۔ زندگی کی مقصدیت کے مسئلے کو آئین اسٹائن نے بڑی خوبصورتی اور نہایت سادگی سے بیان کر دیا ہے کہ آج کے انسان کا شعور علم اور تہذیب کی جس سطح پر پہنچ چکا ہے وہاں سے اپنی زندگی میں مقصدیت کو پانے کے لئے کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں......سوال بڑا سادہ ہے کہ اگر انسان اپنی زندگی اور گردو پیش کی دنیا کو بیکار سمجھنے لگے گا تو بطور انسان خود اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جب کہ انسان کی ہزاروں سال کی تہذیبی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ انسان نے ہر مرحلے میں خود کو پہلے سے برتر ارتقائی سطح تک پہنچایا ہے۔ اپنے اندر پائی جانے والی خودغرضی اور درندگی کی حیوانی جبلتوں پر اس کے شعور اور فکر کی قوتیں ہمیشہ غالب رہی ہیں۔ انسان کے اندر سے فکر و عمل کی تخلیقی قوتوں کا جو سوتا پھوٹ رہا ہے، وہ کبھی بند نہ ہو پائے گا۔ مفکروں، فلاسفروں، صوفیوں، محققین اور سائنس دانوں نے بے لوث محنت شاقہ کی جو روشن مثالیں قائم کی ہیں، ان کے سلسلے کبھی کم نہ ہوں گے۔ اپنے اور ماحول کو خوبصورت بنانے اور انہیں زیادہ سے زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے تجسس کی جبلت خلقی طور پر انسان کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ اس کی زندگی سے مقصدیت کا احساس کبھی خارج نہ ہوگا۔ انسان تو کیا......اس کائنات میں کوئی عمل بے مقصد واقع ہو ہی نہیں سکتا......فرق یہ ہے کہ کائنات کے اندر مقصدیت ارادی اور شعوری نہیں ہے۔ علت و معلول کا لامحدود عمل خود بخود ایک طرح کی مقصدیت اور تناسب قائم کئے رکھتا ہے جب کہ انسان شعوری طور پر باہمی بقائے حیات کو قائم رکھنے اور اپنی تخلیقی جبلی صلاحیتوں کی تسکین میں بامقصد زندگی کے معنی حاصل کرتا ہے کہ مجھے کچھ کرنا ہے اور میں نے کچھ کر کے دکھانا ہے۔ انسان کی مقصدیت خود آگہی میں مضمر ہے۔ موت و حیات کے مذہبی عقائد کی رو سے پائدار مقصد حیات واضح نہیں ہوتا اور تاریخ گواہ ہے کہ تصور خدا کی بیساکھی نے انسانیت کو گمراہی و درندگی سے باز رکھنے میں کبھی کوئی موثر کردار ادا نہیں کیا۔ مختلف عقائد رکھنے والوں کے درمیان

فرقہ وارانہ تصادموں میں خدا کے نام پر جس درندگی اور انسانیت کشی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، اس سے ہر باخبر شخص واقف ہے۔ مذہب انسان کے اندر کوئی وسیع تر مقصد حیات پیدا کرنے میں اس لئے بھی قاصر لگتا ہے کہ اس میں خدا اور انسان تک کا باہم رشتہ جزا اور سزا کے عنصر کی وجہ سے بے غرض نہیں رہتا۔

ایسے میں انسانی زندگی میں کوئی اعلیٰ تر مقصد اور خوبصورت باہمی رشتوں کے قیام کا دعویٰ غیر منطقی ہی ہوسکتا ہے۔ یہ ہی وہ نکات ہیں جنہیں آئین اسٹائن کمال فن سے اختصار کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔

1950ء میں آئین اسٹائن کا برلن میں اس کے گھر سائنس اور مذہب کے موضوع پر انٹرویو میں جو پہلا سوال کیا گیا، وہ امریکی سائنس دانوں کے ایک اجلاس میں اٹھائی جانے والی اس تجویز کے بارے میں تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ سائنس خدا کی اب ایک نئی تعریف (Definition) پیش کرے...... آئین اسٹائن نے برجستگی سے جواب دیا ''بالکل مضحکہ خیز بات'' آئین اسٹائن نے چھوٹے سے کلمے سے ہی بڑا بامعنی جواب دے دیا۔ چنانچہ اس سے پھر پوچھا گیا کہ لوگوں کی خواہش ہے کہ سائنس انسان کی روحانی مدد اور انسپائریشن کا بیڑا اٹھائے کہ آج روایتی مذاہب ایسا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہے۔ آئین اسٹائین کا جواب تھا ''میرا خیال ہے کہ سائنس کی دنیا میں تمام نفیس غور وفکر یا سوچ بچار ایک طرح کے گہرے مذہبی احساسات سے اٹھتا ہے اور ایسے احساسات کے بغیر سوچ بچار مفید بھی نہیں ہوتی۔ میرا ابھی یقین ہے کہ اس طرح کی مذہبیت جیسی آج کی سائنسی تحقیق میں محسوس کی جارہی ہے...... ہمارے دور کی واحد تخلیقی مذہبی سرگرمی ہے...... البتہ سائنسی تھیوریوں کا مواد بذات خود پرائیویٹ طرز زندگی کے بارے کوئی اخلاقی بنیادیں فراہم نہیں کرتا۔'' آئین اسٹائن نے سب سے پہلے تو اس بات سے انکار کیا کہ سائنس انسان کی روحانی تشفی اور راہنمائی کے لئے مذہب کا متبادل رول ادا کرے۔ مسئلہ یہ ہے کہ سائنس مذہب کی طرح اٹل اور ناقابل تغیر فارمولے پیش نہیں کرسکتی۔ وہ کائنات کو سمجھنے کی انسانی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔ اب سائنس سے باہر سماجی علوم کا کام ہے کہ وہ سائنس کے دیئے ہوئے اس کائنات کی تفہیم کی روشنی میں زندگی کو محیط دیگر سوالوں کا جواب تلاش کرے۔ فزیکل سائنس کی علوم انسان اتنی بصیرت پیدا کر دیتے ہیں کہ اپنی روحانی اور نہایت لطیف ذہنی دنیا کو چھوڑ کر انسان کی روحانی رہنمائی کا منصب نہیں سنبھال سکتے۔ دوسرے آئن اسٹائن نے سائنسی لیبارٹریوں میں ہونے والے کام کو ''واحد مذہبی سرگرمی'' قرار دے کر دنیا بھر کے عبادت خانوں میں واقع ہونے والے پوجاپاٹ کے مذہبی افعال ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ آئین اسٹائن جانتا ہے کہ عبادت خانوں میں جو اعمال (Exercises) انجام دی جارہی ہوتی ہیں...... ان کی بنیاد واہمہ (Superstition) اور بے علمی (Ignorance) کے سوا کچھ نہیں۔ ان مقدس میکانیکی اعمال کو خدا سے قریب ہونے کا فعل کہا ہی نہیں جاسکتا۔ ''خدا'' سے حقیقی قرب کے مزے لیبارٹری میں بیٹھا سائنس دان اٹھا رہا ہوتا ہے...... جب کہ عقائد نظام قدرت سے دور بے عملی کی حالت میں خدا کے خیالی تصور سے ہی بہلائے رکھتے ہیں۔ دیواریں کھڑی کرکے ''خدا کے گھر'' بنالئے جاتے ہیں جب کہ خدا کا حقیقی گھر ہمارے سامنے پھیلی ہوئی لامحدود فطرت (Nature) اور کائنات ہے۔ جہاں بقول آئین اسٹائن سائنس دان محو عبادت ہوتا ہے۔

آئین اسٹائن سے اسی انٹرویو میں پوچھا گیا کہ جہاں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچ ہیں اور خاص طور پر انگریزی بولنے والے ملکوں میں...... وہاں سائنس کی مخالفت ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے۔ جب کہ یہودیت جو بڑا منظّم مذہب ہے، کی طرف سے سائنس کی مخالفت نہیں پائی گئی۔ آئین اسٹائن کے مطابق اسے سمجھنا بڑا آسان ہے کہ ایسا کیسے ہوا...... یہودی مذہب کسی بھی دوسرے نظریئے سے زیادہ زندگی کو ترقی وارتقاء کی بلند سطحوں پر ڈالنے کا نام قرار دیتا ہے۔ یہودیت عقائد کے معاملے میں تنگ نظم وضبط کی تلقین نہیں کرتی، جو کسی شخص کی زندگی کے بارے ذاتی نقطہ نظر پر اثر انداز ہو...... بلکہ حقیقت تو یہ ہے ایمان کی اصطلاح کے مقبول عام مفہوم میں یہودی مذہب اپنے لوگوں سے کسی ایمانی عمل (Act of Faith) کا تقاضا نہیں کرتا...... یہی وجہ ہے کہ ہمارے مذہبی نظریئے اور سائنس کے نقطہ نظر میں کبھی تصادم نہیں رہا......'' آئین اسٹائن یوں اس حقیقت کی طرف اشاہ کر رہا ہے کہ جو مذہب ''ضابطہ حیات'' بن کر اپنے ماننے والوں کے پاؤں کی زنجیر بن جائے گا...... اور ان سے فکر وعمل کی شخصی آزادی چھین لے گا...... وہ قوم نہ کبھی سائنس میں ترقی کر سکے گی اور نہ اقوام عالم میں کسی باعزت مرتبے پر فائز ہو سکے گی۔ مذہب کو عقیدے اور روحانی رسومات تک محدود رہنا چاہیے۔ آج کوئی قوم اگر مذہب کو ''ضابطہ حیات'' بنانے کی کوشش کرے گی...... تو اس کے پاس نہ کوئی ضابطہ رہے گا اور نہ حیات...... وہ ہر مسئلے کے اختلافی اور متضاد پہلوؤں میں الجھ جائے گی۔ علم، شعور، دنیا اور زندگی کے تقاضے اسے آگے لے جانے پر اکسائیں گے اور کہنہ ضوابط اور رجعتی رویوں میں تبدیلیوں کے متقاضی ہوں گے لیکن مذہبی پیشوائیت اور ''ضابطہ حیات مذہب'' کا بھرم وقت کے تقاضوں کے مطابق فیصلے کو روکے رکھے گا۔ آج کی دنیا میں پیچھے رہ جانے والی اقوام میں وہی ترقی کے نقشے پر ابھر رہی ہیں، جن کے پاؤں اور ذہن مذہبی ضابطہ حیات کے مقید نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہودی مذہب نے انسانی تاریخ کے عظیم ترین مفکر، فلاسفر اور سائنس دان پیدا کئے۔ حریت فکر کی روایت کے بغیر ایسا ہونا ناممکن تھا، چنانچہ جو قوم اس پرفریب مغالطے سے باہر نہیں نکلے گی کہ مذہب زندگی کے ہر معاملے پر محیط ہے، پس ماندگی، ذلت اور بحرانوں کی قید سے آزاد نہیں ہو سکے گی۔ کوئی قوم جب مذہبی عقیدے کو ضابطِ حیات سمجھنے لگتی ہے تو وہ تنگ نظری کی ایسی گہری کھائی میں گرتی ہے جس کی مثال ہم خود ہیں۔ نوبل انعام یافتہ سائنس دان (ڈاکٹر عبدالسلام) ہم میں پیدا ہوتا ہے تو اسے مختلف الطرز عقیدے کا حامل ہونے کی بنا پر کافر قرار دے کر ذلت کی جاتی ہے اور ملک کے اندر اس کے لئے کام کے مواقع تنگ کر دیئے جاتے ہیں۔ ادھر یہودی قوم کو دیکھئے کہ وہ کھلے عام روایتی خدا اور مروجہ مذہب کو مسترد کر دینے والے سائنس دان آئین اسٹائن کو اسرائیل کا صدر بننے کی دعوت دیتی ہے اور اسے یقین دلاتی ہے کہ تم اپنی لیبارٹری میں ہی رہ کر صدارت کے فرائض انجام دینا۔

کچھ تحریروں میں آئین اسٹائن اپنے مخصوص مذہبی احساسات کے اظہار کے لئے ''کائناتی مذہب Cosmic Religion'' کی اصطلاح بھی استعمال کرتا ہے۔ آیئے آئین اسٹائن کے اپنے الفاظ میں دیکھتے ہیں۔

''کسی ایسے شخص کے سامنے جو خود اس سے بالکل عاری ہو، اپنے خصوصی قسم کے مذہبی احساسات کی تفسیر بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ خاص طور پر جب اس کے ساتھ کسی ایسے خدا کے تصور کا کوئی واسطہ نہ ہو جو انسانی خصوصیات رکھتا ہو۔ تمام

ادوار کے مذاہب کے اعلیٰ افراد اسی طرح کے مذہبی احساسات سے خود کو ممتاز کرتے رہے ہیں۔ جس میں کوئی کٹر مذہبی تحکم و عقیدہ (Dogma) نہیں ہوتا اور کسی ایسے خدا کا تصور بھی نہیں کیا جاتا جو انسان جیسا ہو۔ لہٰذا کوئی عبادت گاہ اور مذہبی پیشوائیت (چرچ) بھی نہیں ہوسکتی۔ جس کی بنیادی تعلیمات اس شخصی خدا کی اساس پر ہوں، لہٰذا ہر زمانے کے انہی افراد میں سے جنہوں نے مذہب سے ہٹ کر سوچ اپنائی اور ان پر کفر کے فتوے لگے، ہمیں ایسے لوگ ملتے ہیں جو اسی طرح کے اعلیٰ نفیس روحانی احساسات کے حامل تھے...... اور جنہیں ان کے ہم عصروں نے دہریہ وملحد قرار دیا۔ انہی میں صوفی اور سنت لوگ بھی شامل ہیں۔ اس روشنی میں دیکھئے تو آپ کو ڈیموکریٹس، سپنوزا اور فرانکس آف اسیسی ایک دوسرے سے ملتے جلتے نظر آئیں گے چنانچہ ان ''کائناتی روحانی احساسات'' سے شخص کو کس طرح آگاہ کیا جاسکتا ہے، جس میں خدا کا کوئی معین شخصی تصور ہی نہ ابھرتا ہو...... اور اس میں کوئی مذہبی ضوابط وعقائد بھی موجود نہ ہوں۔

میرے نقطہ نظر کے مطابق سائنس اور آرٹ کا یہ سب سے اہم ترین کام ہے کہ وہ ایسے احساسات کو زندہ اور اجاگر کرے۔ ان لوگوں میں...... جو اسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح سے ہم روایتی مذہب اور سائنس کے باہمی تعلق کے سوال سے ایک بڑے ہی مختلف تصور تک پہنچ گئے ہیں۔ جب کوئی مادے کو تاریخی حوالے سے دیکھتا ہے تو لازم ہے کہ وہ سائنس اور مذہب کو ناقابل مصالحت حریفوں کے طور پر پائے...... اور ایسا ہونے کی بڑی واضح دلیل ہے کیونکہ ایک ایسا آدمی جسے مکمل طور پر یقین ہو، کہ کائنات کے اندر علت ومعلول کا لامحدود سلسلہ کارفرما ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے دل میں کسی ایسی ہستی کے بارے خیال دل میں نہیں لاسکتا۔ جو واقعات کے رستے میں اچانک اپنی مرضی سے مداخلت کردیتی ہو...... اور نہ ہی خوف کے پیدا کردہ مذہب سے اس کا کوئی واسطہ ہوسکتا ہے اور نہ کسی اخلاقی اور سماجی مذہب کے ساتھ کوئی تعلق...... چنانچہ یہ دیکھنا بڑا آسان ہے کہ کیوں مذاہب کے ادارے ہمیشہ سائنس کے ساتھ لڑائی لڑتے رہے ہیں اور اس کے عاشقوں کو ایذائیں پہنچاتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس میں جس کائناتی مذہبیت کی بات کرتا ہوں۔ وہ مضبوط ترین اور شریف ترین جذبہ محرکہ ہے...... سائنسی تحقیق کرنے کا...... میرے ایک ہم عصر نے بالکل صحیح کہا ہے۔ آج کے مادہ پرستانہ دور میں سنجیدہ سائنسی کارکن ہی حقیقت میں گہرے مذہبی افراد ہیں۔''

اقتباس بالا میں آئین اسٹائن کے ان مخصوص روحانی احساسات کا ذکر ہے، جن سے علم ودانش اور شعور وادراک کے اعلیٰ تر مقام پر ہر شخص دوچار ہوتا ہے اور جہاں پر مولوی، پنڈت اور پادری کا بتلایا ہوا نہایت بھونڈا اور غیر سائنسی مذہبی تصور قطعی ناقابل قبول ہوجاتا ہے۔ جس میں خدا بندوں جیسے اوصاف اور حرکتوں کا حامل بن جاتا ہے۔

آئین اسٹائن کا اپنے مخصوص مذہبی نوعیت کے احساسات کے ساتھ ''کائناتی Cosmic'' کا لفظ لگانا بڑے عمیق معنے رکھتا ہے۔ عقائد کی سب سے بڑی مشترکہ خرابی، جو انسانیت کے لئے نہایت تباہ کن ہوتی ہے۔ ذہنوں میں تنگ نظری پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ہر مذہب اپنے ماننے والوں کی سوچ اور فکر کا دائرہ محدود کردیتا ہے۔ سائنسی علم اور صداقت تک رسائی ذہن کو صرف کھلی فضا مہیا کرکے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ فکر اور سوچ کو محدود کرنے کا یہ عمل ہمہ جہت (All Round) ہوتا ہے۔

چنانچہ معاملہ سماجی، ثقافتی، سیاسی افراد کے مابین تعلقات کا مسئلہ ہو یا بین الاقوامی...... مذہب کا پیدا کردہ تعصب اور کوتاہ فکری ہر مقام پر سر اٹھاتی ملے گی۔ مذہب سوچ کے گرد دائرے اور دیواریں کھڑی کرتا ہے جب کہ سوچ کو فطری طور پر صداقت تک پہنچنے کے لئے لامحدود سلسلوں میں اترنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیوں، مفکروں اور سائنس دانوں کا دل بھی آسمانوں جیسا لامحدود ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے ذہن کے احاطے میں دنیا اور کائنات کے وسیع سلسلے سموئے ہوتے ہیں۔ اس میں ''میرے اور تیرے''، ''قرب و دور'' اور ''اپنے، پرائے'' کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ اشیاء کو مربوط سلسلوں میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ فکر کے اندر یہ لامحدودیت زمان و مکان کے ہر طرف عمودی اور افقی جانب چلتی ہے۔ چنانچہ صداقت کا ایک مربوط نظریہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب کی سوچ نہ صرف یک رخی ہوتی ہے۔ بلکہ اس میں بھی آپ کو زیادہ آگے جانے کی اجازت نہیں ہوتی...... ایسے میں صداقت کہاں مل سکتی ہے اور وسعت قلبی کہاں پیدا ہوگی۔ اس کے لئے فکر کو لامحدود کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ آئین اسٹائن اپنے مذہبی احساسات کے اظہار میں سماوی (Cosmic) کا لاحقہ لگاتا ہے۔ دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ آئین اسٹائن بہ تکرار سائنسی کارکنوں کو ہی فقط مذہبی افراد گردانتا ہے اور مذہب کے روایتی ٹھیکیداروں اور پیروکاروں کی مذہبی حیثیت کو چیلنج کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر میں ''خدا'' کو بے لوث چاہنے اور اسے پانے کی تمنا میں بے تاب سائنس کی لیبارٹریوں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے نئے مذہبی احساسات کے ساتھ آئین اسٹائن مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے سے متصادم نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کے خیال میں تو انہیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے بشرطیکہ مذہب اندھے عقائد کی بجائے سائنسی تحقیق و تفتیش کی کوکھ سے جنم لے۔ آئین اسٹائن کا جو مفہوم مذہب ہے وہ مولوی سے بالکل جدا ہے۔ وہ اسے بار بار مسترد کرتا ہے۔ چنانچہ سائنس دان ہی صحیح طور ''عالم دین'' کہلانے کے حق دار ہیں۔ اپنے اپنے مذاہب کے مخصوص حلئے بنائے اور چوغے پہنے پیشوا، جہالت کے چلتے پھرتے تودے ہیں۔ جن سے خاص طور پر ترقی پذیر اقوام کے عوام کی زندگی اور مستقبل سخت خطرے میں پڑا ہوا ہے۔ اس لئے کہ ان ہی اقوام کو سب سے زیادہ علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔

پرنسٹن یونیورسٹی کے ایک مذہبی سیمینار میں مئی 1939ء کی آئین اسٹائن کی ایک تقریر سے ایک اقتباس حاضر ہے

''پچھلی صدی میں یہ بات وسیع پیمانے پر گھر کر چکی تھی کہ علم اور عقیدے کے بیچ میں ایک ناقابل مصالحت تصادم ہے، ترقی یافتہ اذہان کے حامل افراد میں یہ رائے کافی عام ہو چکی تھی...... کہ عقیدے کی جگہ علم کو دے دی جائے۔ عقیدہ چونکہ علم کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ توہم پرستی پر کھڑا ہوتا ہے چنانچہ اس کی مخالفت ہونی چاہیے۔ اس نظریئے کا کمزور نقطہ تاہم یہ ہے کہ وہ تمام یقین کامل جو ہمارے کردار اور قوت فیصلہ کے لئے ضروری ہے انہیں مکمل طور پر ٹھوس سائنسی طریقے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ سائنسی طریقہ کار (Method) ہمیں اس کے علاوہ اور پرے کچھ نہیں سکھا سکتا کہ حقائق ایک دوسرے سے کیسے مربوط اور مشروط ہیں۔ اس میدان میں، میں انسان کی جری کوششوں اور کارناموں کو کسی طرح کم تر نہیں کرنے والا...... لیکن یہ مساویانہ طور پر واضح ہے کہ ''کیا ہے'' کا علم براہ راست اس کا دروازہ نہیں کھولتا کہ ''کیا ہونا چاہیے'' ایک شخص ''کیا ہے'' کا بڑا واضح ترین اور مکمل ترین علم رکھ سکتا ہے لیکن اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ اس سے یہ اخذ کر سکے...... کہ انسانی خواہشوں کا بالآخر منزل

مقصود (Goal) کیا ہونا چاہیے۔ معروضی علم کچھ مقاصد کے لئے بڑے طاقت ور ہتھیار (Instruments) مہیا کرتا ہے لیکن بذات خود آخری مقصد (Ultimate Goal) اور اس تک پہنچنے کی خواہش کسی دوسرے ذریعے (Source) سے آنی چاہیے...... یہاں ہمارا سامنا وجود کے بارے خالص عقلی نظریات کی اپنی حدود (Limits) سے پڑتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ ان بنیادی مقاصد کی اتھارٹی کہاں سے لی جائے گی...... کیونکہ ان کا صرف عقل سے جواز پیش نہیں کیا جا سکتا، نہ انہیں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کوئی صرف یہی جواب دے سکتا ہے کہ یہ ایک صحت مند معاشرے میں ان طاقت ور روایات کی طرح وجود رکھتے ہیں جن کی جھلک افراد کی قوت فیصلہ ان کی آرزوؤں اور ان کے کردار میں نظر آتی ہے۔ یہ کسی دلالت سے وجود میں نہیں آتے بلکہ بذریعہ الہام افشائے حقیقت ہوتی ہے۔ طاقت ور شخصیات کے میڈیم سے...... کسی فرد کو انہیں پر جواز ثابت کرنے پر مصر نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کی محض فطرت کو سمجھنے کی کوششیں کرنی چاہیے۔'' آئین اسٹائن ہمیں یہاں پر مابعد الطبیعات کو بھی کسی حد تک جگہ دیتے نظر آتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ دیکھا بالآخر سائنس کو بھی مذہب کی ضرورت پڑے گی۔

اس لئے کہ آئین اسٹائن کی مابعد الطبیعات کی پہلی شرط مروجہ مذہب اور کلاسیکل تصور خدا کی نفی ہے۔ صاف ظاہر ہے انسانی زندگی کے دیگر سماجی، ثقافتی، جمالیاتی، نفسیاتی اور اخلاقی معاملات کو فزکس، کیمسٹری یا بقول آئین اسٹائن ''خالص سائنس'' سے تو حل نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کا تعلق خالص سائنس سے باہر کے انسانی علوم سے تعلق ہے۔ لیکن ان علوم کی راہنمائی بھی اندھے اور ناقابل تغیر عقائد سے نہیں بلکہ خالص سائنس کے دیئے ہوئے مجموعی شعور سے ان کے بارے فیصلہ کیا جائے گا۔ چنانچہ خالص سائنس سے ان کا براہ راست تعلق نہ ہونے کے باوجود ان میں جو رویہ اپنایا جائے گا، وہ سراسر سائنسی ہوگا۔ چنانچہ اسے سائنسی مابعد الطبیعات (Scientific Metaphysics) کہا جا سکتا ہے۔ کوئی ذی شعور انسان مادے کے نہایت لطیف اور روحانی پہلوؤں سے اغماض نہیں برت سکتا۔ نہ ہی انسان کو روبوٹ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی زندگی کو محض میکانکی عمل سے سمجھا جا سکتا ہے لیکن یہ میٹا فزکس ایک ایسے روشن اور آزاد خیال انسان کی ہوگی جو خالص سائنس کے دیئے ہوئے نظریہ کائنات سے مسلح بھی ہوگا اور نئے سے نئے انکشافات اور تسخیر کائنات کے عمل کے ساتھ اپنے رویوں اور فکر و نظر میں تبدیلیاں بھی کرتا رہے گا...... کوئی قاعدہ اور قانون حرف آخر نہ ہوگا...... گویا اپنے آپ کی آخری اتھارٹی...... بالآخر انسان خود ہی ہوگا۔ جہاں تک آئین اسٹائن کی اس بات کا تعلق ہے کہ الہام سے ہی افشائے حقیقت ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ''الہام'' کبھی خلا میں نہیں ہوتا۔ اس کے پس منظر اور پیش منظر میں مخصوص مادی حقائق اور ٹھوس حالات اور علم کارفرما ہوتا ہے۔ ''الہام'' Out of Nothing کبھی نہیں ہوا۔ الہام انسانی شعور کی ہی کیفیت اور ذہن کی ہی خاصیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس پر مذہبی قائدین کا ہی اجارہ نہیں رہا۔ اس تجربے سے خصوصاً ہر مفکر اور تخلیق کار گزرتا ہے۔ جسے ہم ''اچانک خیال'' کہتے ہیں۔ وہ بھی الہام کی ہی ایک شکل ہوتی ہے لیکن اس کے لئے مخصوص مادی حالات اور واقعات و مسائل کے بارے تفکر لازمی شرط ہے۔ جس سے ہمارا دماغ، الیکٹرانک اور کیمیائی عمل کے بعد ''اچانک'' ایک فارمولہ ایک تھیسسین تخلیق کر کے باہر نکال دیتا ہے جو ہمیں ایسے لگتا ہے جیسے اسے میں نے تو نہیں بنایا......

آئین اسٹائن آگے چل کر اسی مذکورہ تقریر میں اپنے گہرے یقین کا اظہار کرتا ہے کہ سائنس اور مذہب قابل مصالحت ہیں۔ مذہبی روایات جو کہ علامتوں اور مقدس قصے کہانیوں پر مبنی ہیں۔ وہ سائنس سے متصادم نظر آتی ہیں اور ایسا وقت ہوتا ہے جب مذہبی خیالات میں کٹر عقیدہ پرستانہ قطعی فیصلوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ان موضوعات پر جن کا تعلق سائنس کی دنیا سے ہوتا ہے۔ چنانچہ سچے مذہب کی حفاظت کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ ان موضوعات پر تصادم سے گریز کیا جائے جو درحقیقت مذہبی مقاصد کے حصول کے لئے ضروری نہ ہو'' یعنی جہاں تک زندگی اور کائنات کی تشریح کا تعلق ہے وہاں سائنس کی برتری اور راہنمائی کو تسلیم کر لیا جائے اور مذہب صرف لوگوں کی انفرادی روحانی تسکین اور اخلاقی پہلوؤں پر ہی اپنی نظر رکھے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آئین اسٹائن یہ تقریر ایک مذہبی اجتماع میں کر رہا تھا اور اس کے سامنے مغرب کا ترقی یافتہ وہ معاشرہ تھا جس کی زندگی میں سائنس اولیت اور مذہب ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جب کہ ہم ترقی پذیر یا پس ماندہ اقوام کا مسئلہ آج بھی مختلف ہے جہاں ملائیت کی شکل میں ''مقدس جہالت'' دندناتی پھر رہی ہے اور عوام کی اکثریت تعلیم اور سائنسی علوم سے نابلد ہے۔ وہاں لوگوں کے اذہان کو سائنسی طرز فکر کی طرف مائل کرنا کٹھن ہے۔ ناخواندہ افراد کی بات ایک طرف رہی...... درمیانہ طبقے کے پڑھے لکھے علم و ادب سے وابستہ افراد بھی روزمرہ کی بات چیت میں خدا کی مہربانی اور خدا کی مرضی وغیرہ کے الفاظ اتنی زیادتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ وہ واقعات اور معاملات کو علت و معلول کے حقیقی تناظر میں ابھی تک بیان کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

دوسرے خدا کا نام ہر فقرے میں استعمال کر کے اپنے جعلی انکسار کا عکس ڈالنا بھی مقصود ہوتا ہے چنانچہ ان حالات میں ترقی پزیر معاشروں میں مذہبی ذہنیت واضح طور پر سائنسی فکر اور سماجی ترقی کے متصادم کھڑی نظر آتی ہے۔ آئین اسٹائن کی تجویز کردہ سیکولر راہ کو ابھی ترقی پذیر معاشروں میں قبول عام کا وہ درجہ نہیں ملا جس سے مذہب اور سائنس میں قابل مصالحت تعلق پیدا کیا جا سکے۔

1960ء میں نیویارک کے ''مذہب، فلسفہ اور سائنس'' کے ایک اور سیمینار میں آئین اسٹائن نے سائنس اور مذہب کے موضوع پر ایک بہت ہی جامع اور خوبصورت پیپر پیش کیا۔ ''یہ پوچھنے کی بجائے کہ مذہب کیا ہے۔ مجھے ترجیح دینی چاہیے یہ پوچھنے کی کہ وہ شخص آخر کیا چاہتا ہے جو مجھے اپنی مذہبی ہونے کا تاثر دیتا ہے وہ شخص جو مذہبی خیالات سے لبریز ہے...... مجھے ایسا لگتا ہے اسے اپنی بہترین قابلیت کا استعمال اپنی خود غرضانہ خواہشات کی زنجیروں سے آزاد ہونے پر لگانا چاہیے۔ اور ان افکار، احساسات اور آرزوؤں سے لبریز ہونا چاہیے جن کے حوالے سے وہ مذہب کے ساتھ چپکا ہوتا ہے کیونکہ وہ ذات سے ماوراء اور بلند تر اقدار کے قریب ہوتی ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے وہ قوت اہم ہے جو اس ماورائے ذات پر یقین کی گہرائی اور معنویت پیدا کرتی ہے۔

ایک مذہبی شخص اسی مفہوم میں دیندار اور خدا پرست ہوتا ہے کہ اسے ان ماورائے ذات اشیاء اور مقاصد کی اہمیت اور ان کی رفعت پر ذرہ بھر شک نہ ہو جنہیں عقلی اساس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سائنس کو صرف وہی لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو مکمل

طور پر سچ کو پانے اور سمجھنے کی آرزو میں مبتلائے عشق ہو چکے ہوں۔ اس طرح کے احساس کا سرچشمہ بہرحال مذہب کے دائرے سے اٹھتا ہے اس کے لئے اس امکان پر ایمان کی ضرورت ہوتی ہے کہ ضوابط جو اس دنیا کے وجود سے متعلق ہیں وہ عقلی ہیں۔ وہ عقل کی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ میں کسی ایسے صحیح سائنس دان کا تصور نہیں کرتا جو ایسے گہرے ایمان کا حامل نہ ہو۔'' اس کے بعد آئین اسٹائن اپنے خیالات کو ایسے بے مثال جملے میں مجتمع کرتا ہے کہ اس سے شاید اس طرح کا جملہ کہیں اور نہ بنا ہو۔

Science Without Relligion is Lame

Religion Without Science is Blind.

''سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے۔'' ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اقتباس میں آئین اسٹائن مذہب کے حوالے سے ایک نہایت اہم سوال بھی کرتا ہے اور اس میں سے ایک خوبصورت نکتہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے اس کی بجائے کہ مذہب کیا ہے پر بات کی جائے۔ یہ کیوں نہ دیکھا جائے کہ مذہبی لوگ آخر کیا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں خدا کے ساتھ محبت ہے تو اس کا مطلب اپنی ذات سے بلند تر ہو کر سوچنا ہے۔ ماورائے ذات مقاصد رکھ کر زندگی بسر کرنا نہایت قابل تحسین عمل ہے۔ بقول آئین اسٹائن عقلی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا۔ لیکن مشاہدے میں یہ آتا ہے کہ مذہبی لوگ عملاً اپنی ذات سے ماوراء کچھ سوچنے کی صلاحیت کم ہی رکھتے ہیں۔ وہ تو خدا کے ساتھ ہر وقت ثواب اور نیکیوں کا حساب کرتے رہتے ہیں وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کے تصور خدا میں کہیں خامی ہے۔ ان کی ''میں'' کیسے مر سکتی ہے۔ اپنی ذات کے بلند تر اور ارفع مقاصد حیات بے شک عقل کی اساس پر قائم نہ ہوتے ہوں، دماغ کے ساتھ ساتھ دل کی دنیا بھی انسان کی ذات کا اٹوٹ حصہ رہی ہے۔ انسان اپنی تمام جبلی خود غرضیوں کے باوجود اندر سے پاکیزہ، صالح اور نرم و لطیف اور خیر عام کے احساسات کا حامل ہے۔

ابہام یوں پیدا ہوتا ہے کہ آئین اسٹائین مذہب کے ایک مفہوم کو مسترد کرتا ہے اور دوسری طرف مذہب کے اور مفہوم کی طرف کھنچا بھی نظر آتا ہے، جن کا بہرحال تعلق روایتی مذہب سے ہرگز نہیں ہوتا۔

وہ اس بات پر زور دیتا نظر آتا ہے کہ سائنس کے نام پر کہیں انسان خالصتاً مادہ پرست اور مشینی نہ جائے کہ کچھ سوالوں کا جواب عقل سے نہیں دل، وجدان اور تجربہ سے ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مذہب سائنس کے بغیر یوں اندھا ہو کر رہ جاتا ہے کہ فطرت کی صداقتوں سے کٹ کر وہ اندھے عقائد کا بے کار مجموعہ بن جاتا ہے۔

برٹرینڈ رسل اور خدا

20ویں صدی کا دانا آدمی......عقائد اور اقدار

رسل نے اپنے ہم عصر فلاسفروں کے مقابلے میں بیسویں صدی کی فکری تشکیل میں بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ یہ اثرات صرف اس کے ریڈیکل خیالات تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ اس کی زندگی کی عملی مثال کا بھی اس میں برابر کا حصہ تھا۔ رسل 1872ء میں ایک انگریز نواب خاندان میں پیدا ہوا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ یاد نہیں کہ وہ کب فوت ہو گئے چنانچہ رسل کی پرورش اس کے دادا لارڈ جان رسل نے کی جو برطانیہ کے دو بار وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ رسل نے جن موضوعات پر لکھا وہ ریاضیات، منطق، سائنس، سیاسیات، اخلاقیات، سماجی مسائل اور فلسفے سے لے کر مذہب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ 1940ء میں اسے نیو یارک شہر کے ایک کالج میں پڑھانے سے ایسے الزامات کے تحت روک دیا گیا جو ان الزامات سے ملتے جلتے تھے جو 2339 سال پہلے ایتھنز میں سقراط پر لگائے گئے تھے۔ رسل نے مذہبی عقائد پر جو عمومی تنقید کی، وہ صرف پیشرو فلاسفروں سے اپنے اسٹائل، سلاست تحریر اور استقامت کے لحاظ سے ہی زیادہ جاندار نہیں تھی بلکہ اس کے صائب الرائے اور حق بجانب موقف اور اس کی پرمتانت جستجو نے اسے بیسویں صدی کا بجا طور پر ''دانا آدمی'' بنا دیا۔ اس لحاظ سے اسے اگر بیسویں صدی کا والٹیئر (Voltaire) کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

رسل نے مذہب پر بھی اچھا خاصا لکھا۔ مذہب پر اس کے اہم مضامین میں ''ایک آزاد آدمی کی عبادت'' (A Free Man's Worship)، ''سائنس اور مذہب'' اور ''میں کیوں عیسائی نہیں ہوں؟'' (Why I am not a Christian) اور ''میرا ایمان کیا ہے؟'' (What I believe) وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین میں رسل نے مذہب کی اسی اخلاقی اور سماجی اساس کے خلاف دلائل پیش کئے جس کی بنا پر مذہب اپنی فضیلت کا دعویٰ کرتا ہے اور ان مضامین میں اقدار کے انسانی ساختہ ہونے کے موقف کی پرزور حمایت کی۔ رسل نے اپنی 80ویں سالگرہ کے موقع پر کہا ''میں نے ذاتی اور سماجی دونوں طرح کی بصیرت (Vision) کی تلاش میں زندگی گزاری ہے۔ ذاتی سطح پر میری کوشش رہی کہ میرا ہر دم اس چیز کی طرف خیال رہے جو نیک (Noble) خوبصورت اور شریف ہو۔ دنیاوی معاملات میں لمحات بصیرت سے دانش مندانہ رویہ اختیار کروں اور معاشرتی لحاظ سے تصور میں ایک ایسے سماج کو قائم ہوتے ہوئے دیکھوں جہاں لوگوں کی نشوونما میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ نفرت،

حرص اور حسد اپنی موت مر چکے ہوں اور ایسے منفی جذبات کو پالنے کے لئے اب کچھ باقی نہ رہ گیا ہو۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن پر میرا ایمان رہا ہے اور اس دنیا کی تمام دہشت انگیزی کے باوجود میں اپنے ایمان سے ہلا نہیں ہو۔'' ''میرا کیا ایمان ہے؟'' میں رسل لکھتا ہے ''انسان فطرت کا حصہ ہے نہ کہ ایسی چیز جو اس سے الگ ہو۔ انسان کے خیالات اور اس کی جسمانی حرکات انہیں قوانین کی پابند ہیں، جن سے ایٹم سے لے کر ستارے تک حرکت میں آتے ہیں۔ یہ عالم کون و مکان انسان کے مقابلے میں بہت بڑا ہے لیکن اتنا بھی بڑا نہیں جتنا کہ کچھ سو سال پہلے نظر آتا تھا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک اور بڑے سے لے کر چھوٹے تک سائنس اس دنیا کی حدود کو چھوتی نظر آتی ہے۔ اب یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ یہ کائنات مکان میں محدود ہے اور روشنی چند سو ملین سال میں اس کے گرد چکر لگا لیتی ہے۔ مادہ الیکٹرون اور پروٹون پر مشتمل ہے۔ جن کا سائز محدود ہے اور جن کی تعداد اس دنیا میں محدود ہے اور ان کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کو ظاہری طور پر چند عمومی اصولوں میں مرتب کیا جا سکتا ہے جو کہ اس کا ماضی اور مستقبل متعین کر سکتے ہیں اور تاریخ کے چھوٹے سے چھوٹے حصے کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ گویا لگتا ہے کہ فزیکل سائنس ایک ایسے مرحلے پر پہنچ رہی ہے جہاں یہ مکمل ہو جائے گی۔ لہٰذا اس میں کوئی دلچسپی بھی نہیں رہے گی کیونکہ الیکٹرون اور پروٹون کے قوانین کو پالینے کے بعد باقی صرف جغرافیہ ہی رہ جاتا ہے۔ گویا جلد کائنات پر انسان کا سفر یوں اختتام پذیر ہوگا جیسے ایک بہت ہی اونچے پہاڑ کو سر کیا جائے اور اس کی چوٹی پر سوائے ایک ایسے دھند سے گھرے ریسٹورنٹ کے سوا کچھ نہ ملے، جہاں ادرک کی بیئر ملتی ہو اور وہ باقی ماندہ دنیا کے ساتھ وائرلیس سسٹم سے جڑا ہوا ہو۔

یہ ہے وہ مادی دنیا جس کا انسان حصہ ہے۔ اس کا جسم دوسرے مادے کی طرح الیکٹرون سے بنا ہوتا ہے لیکن یہاں پر کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا کہنا ہے انسانی عضویات کو کم تر کر کے طبعیات (فزکس) کی سطح پر لا کر نہیں دیکھا جا سکتا لیکن ان کے دلائل معقول نظر نہیں آتے اور بڑی محتاط زیرک فہمی کے باوجود یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ لوگ غلطی پر ہیں جنہیں ہم ''خیالات'' کہتے ہیں۔ وہ دماغ کے اندر بنے ہوئے انتہائی منظّم رستوں پر یونہی انحصار کرتے ہیں جیسے سفر، شاہراہوں اور ریلوے نظام پر منحصر ہوتا ہے اور سوچنے کے عمل میں جو توانائی استعمال ہوتی ہے وہ بھی کیمیائی عمل کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آیوڈین کی کمی ایک سمجھدار انسان کو احمق بنا سکتی ہے اور دماغ کی ساری کرشمہ سازی لازمی طور پر مادی ساخت کی مرہون منت ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم یہ نہیں فرض کر سکتے کہ کوئی اکیلا الیکٹرون اور پرٹون ''سوچ'' سکتا ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی توقع کرنے پڑے گی کہ کوئی اکیلا فرد فٹ بال میچ کھیل سکتا ہے۔ ہم یہ بھی فرض نہیں کر سکتے کہ کسی فرد کی سوچ اس کی جسمانی موت کے بعد بھی جاری رہ سکتی ہے کیونکہ دماغ کی تنظیم تباہ ہو چکی ہوتی ہے اور اس توانائی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا ہے جو دماغی راستوں (Traces) کا استفادہ کر کے ''سوچ'' پیدا کرتی ہے۔

خدا اور حیات جاوید کے تصور کو جن کی سائنس حمایت نہیں کرتی، ہمارے ہاں کی مذہب کے مرکزی ازعانی اعتقادات (بنا سوچے سمجھے Dogmas) ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کسی مذہبی عقیدے کا لازمی حصہ ہوتے ہیں کیونکہ بدھ مت میں خدا اور حیات ابدی کا تصور دونوں نظر نہیں آتے۔ جب کہ ہم لوگ ان کے بغیر مذہب کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ لوگ اس طرح کے عقائد کو پالنے کا عمل جاری رکھیں گے چونکہ یہ دل کو خوش کرنے والی باتیں ہیں۔ جس طرح خود کو پارسا اور دوسروں کو کافر و بدکار قرار دینا اپنی ذات کے لئے بڑا خوش کن امر ہوتا ہے لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے ان دونوں (ابدیت اور خدا) کی کوئی بنیاد اور زمین نظر نہیں آتی۔ میں نہیں کہتا کہ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے اور ایسے ہی میں یہ ثابت کرنے میں نہیں پڑوں گا کہ شیطان ایک افسانہ ہے۔ ہوسکتا ہے ہمارے مذہب کا خدا وجود رکھتا ہو۔ اسی طرح قدیم یونانیوں، مصریوں اور بابلیوں کے دیوتا بھی وجود رکھ سکتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک مفروضہ، دوسرے سے بڑھ کر امکانی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ عقل اور ممکنہ علم کے منطقے سے بالکل باہر کی چیزیں ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی بھی اس لائق نہیں کہ اسے غور و فکر کے قابل سمجھا جائے۔ شخصیات اس روزمرہ دنیا کا حصہ ہوتے ہیں، سائنس جس سے متعلق ہوتی ہے۔ اور وہ حالات جن میں ان کا وجود متعین ہوتا ہے قابل دریافت ہیں۔ پانی کا قطرہ ابدیت کا حامل نہیں ہوتا، وہ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں محلول ہوسکتا ہے۔ اس لئے اگر پانی کے قطرے نے خود کو برقرار رکھنا ہوتا تو اس میں آبی پن کی ایسی صفت چاہیے تھی جو اس کے تحلیل ہونے کے بعد بھی قائم رہتی۔ صاف ظاہر ہے اس خیال کو ہمیں مشکوک نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ ہمارا دماغ غیر فانی نہیں ہے اور زندہ جسم کی منظّم توانائی موت کی حالت میں غیر متحرک ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اب وہ کسی اجتماعی عمل رو پذیر کرنے کے لئے میسر نہیں رہتی۔ ساری شہادت ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ ہماری ذہنی حیات، ہماری دماغی ساخت اور منظّم جسمانی توانائی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ فرض کرنا عین عقل مندانہ ہے کہ ذہنی حیات (Mental Life) وہیں ختم ہو جاتی ہے جب جسمانی حیات کام کرنا بند کر دیتی ہے۔

مذکورہ نتیجہ کے خلاف مختلف حلقوں کی طرف سے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ علم نفسیات کی تحقیق کرنے والوں کے دعوے کے مطابق ان کے پاس ایسے سائنسی شواہد موجود ہیں اور طریقہ کار کے لحاظ سے وہ سائنسی طور پر صحیح بھی ہیں کہ ذہنی حیات جسمانی موت کے بعد بھی خود کو برقرار رکھتی ہے۔ گو اس پر مختلف آراء ہوسکتی ہیں لیکن میرے نزدیک علم فزیالوجی کے مقابلے میں علم نفسیات کی دلیل کمزور ہے۔ لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ کسی بھی لمحے ان کی دلیل اتنی مضبوط ہو جائے کہ ایسی صورت میں ذہنی حیات کی بقاء پر یقین نہ کرنا غیر سائنسی ہو جائے۔

جہاں تک موت کے بعد جسمانی طور پر پھر سے زندہ ہو جانے کا سوال ہے، وہ ایک الگ موضوع ہے۔ اس کا شاید مطلب جسمانی موت کو ملتوی کرنا ہوتا ہے حیات جاودانی پر یقین کر کے لوگ دراصل اس کی آرزو کر رہے ہوتے ہیں، وہ لوگ علم فزیالوجی کے دلائل پر یہ کہہ کر معترض ہوتے ہیں کہ روح اور جسم مکمل طور پر دو مختلف النوع اور الگ چیزیں ہیں۔ مزید یہ کہ روح، ان اعمال سے بالکل مختلف ہے جن کا اظہار جسمانی اعضاء کے تجربے سے ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ مابعد الطبیعاتی توہم پرستی ہے۔ دراصل روح (Mind) اور مادے کی الگ الگ اصطلاحیں ہم نے اپنی عملی سہولت کے پیش نظر وضع کی ہوئی ہیں۔ یہ الگ الگ مطلق حقیقت کے طور پر وجود نہیں رکھتی۔ جیسا کہ روح کی طرح الیکٹرون اور پروٹون محض منطقی افسانے ہیں۔ اصل میں وہ ایک تاریخ، واقعات کا تسلسل ہوتے ہیں نہ کہ مفرد مستقل مزاج وجود۔ روح کے معاملے میں بھی نشو و نما کے

حقائق سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ جو حاملہ ہونے سے لے کر دوران حمل اور نوزائیدگی کے مرحلے سے واقف ہیں۔ وہ یہ یقین نہیں کر سکتے کہ اس سارے عمل اور مراحل میں روح کوئی غیر منقسم اور کامل و مکمل چیز ہوتی ہے۔ وہ بدیہی طور پر جسم کے ساتھ نشو ونما پاتی ہے۔ اور اس کا استخراج مادہ تولید اور بیضہ کے ملاپ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اسے غیر منقسم نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اس کا الگ تھلگ وجود ہو سکتا ہے۔ اس بات کو نظریہ مادیت سے بھی نہیں جوڑا جا سکتا بلکہ صرف یہ تسلیم کرنا ہے کہ ہماری دلچسپی کی حامل ہر چیز مادے کی ہی تنظیم کا نام ہے وہ اصلی اور ابتدائی مواد نہیں ہے۔

علمائے الٰہیات یہ ثابت کرنے کے لئے بڑے دلائل پیش کرتے ہیں کہ روح غیر فانی ہوتی ہے لیکن صرف ایک ٹیسٹ سے ان کی تمام دلیلیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ یہ سب لوگ ثابت کرتے ہیں کہ روح ہر جگہ سرایت کر جاتی ہے۔ تو ہم اتنے بھی مضطرب نہیں ہیں کہ لمبی زندگی پانے کے لئے اتنے پھیل جائیں!! تمنا و خواہش کی حیران کن قوت کی یہی ایک مثال کافی ہے جو اچھے بھلے لوگوں کو اندھا کر کے مغالطے میں ڈال دیتی ہے۔ میں یہ یقین نہیں کر سکتا کہ اگر انسان کو موت کا خوف نہ ہوتا تو روح اور اس کے غیر فانی ہونے کا خیال انسان کے دل میں اٹھتا۔

خوف مذہبی عقیدے (Dogma) کی بنیاد ہے۔ اگرچہ انسانوں کا انفرادی اور اجتماعی خوف ہماری معاشرتی زندگی پر غالب ہوتا ہے لیکن یہ فطرت (Nature) کا خوف ہے جو مذہب کو جنم دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مادہ روح کے درمیان فرق کم و بیش محض فریب نظری کے سوا کچھ نہیں لیکن ایک اور تضاد اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ان حالات اور چیزوں کے درمیان جو ہماری خواہشات سے متاثر ہوتی ہیں اور ان کے درمیان جو ان سے متاثر نہیں ہوتیں، لیکن ان دونوں کے درمیان کوئی نمایاں اور غیر متغیر خط موجود نہیں۔ جوں جوں سائنس ترقی کی منزلیں طے کرتی جا رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ حالات اور چیزیں انسان کے زیر کنٹرول آتی جا رہی ہیں۔ تاہم کچھ چیزیں انسانی کنٹرول سے باہر بہر حال رہیں گی۔ ان میں ہماری دنیا کے بڑے بڑے حقائق شامل ہیں جو علم فلکیات سے متعلق ہیں۔ وہی حقائق جو ہماری سطح زمین کے قریب اور اوپر ہیں، صرف انہیں کو ہی ہم کسی حد تک اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال سکتے ہیں بلکہ سطح زمین پر بھی ہماری طاقت محدود ہے۔ سب سے بڑھ کر یہی کہ ہم موت کو نہیں روک سکتے۔ اگرچہ ہم اکثر اسے التواء میں ڈال دیتے ہیں۔

مذہب انسان کی اس کمزوری کو حل کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ اگر اس دنیا کو خدا کنٹرول کر رہا ہے اور خدا ہماری دعاؤں اور نمازوں سے ہماری مرضی کے مطابق ڈھل جاتا ہے تو گویا قادر مطلق کے ساتھ ہماری بھی حصہ داری ہو گئی۔ اس طرح پرانے وقتوں میں دعاؤں کے جواب میں معجزے رونما ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ خدا پر ایمان ابھی تک دنیائے فطرت (World of Nature) کو آسان پیکر میں ڈھالنے کا مقصد پورا کرتا ہے۔ اور جس سے انسان یہ محسوس کرنے لگ جاتا ہے کہ فطرت کی قوتیں اس کی اتحادی ہیں، اسی طرح بعد از موت ابدی زندگی کا خیال موت کی دہشت کو دور کرتا ہے۔ وہ لوگ جو یہ یقین کرتے ہیں کہ جب وہ مرینگے تو انہیں ایک ابدی روحانی مسرت میسر آئے گی۔ ان سے توقع کی جانی چاہیے کہ وہ موت کی ہیبت کے بغیر نزع کے وقت سے گزر جائیں گے لیکن متعلقہ طبی عملہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ایسا اکثر نہیں ہوتا۔ ابدی

زندگی کا خیال موت کا خوف تو کچھ کم کر سکتا ہے لیکن مکمل خاتمہ نہیں ہوتا۔

مذہب (جس کا سر چشمہ ہی دہشت ہے) کے ہاں بہت سے پر شکوہ (Diginified) قسم کے خوف ملتے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ مذہب لوگوں کی سوچ ان کے بارے ایسی کر دیتا ہے کہ وہ ان خوفوں کو قابل ملامت نہیں سمجھتے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو مذہب نے نوع انسان کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اس لئے کہ خوف تو سب بڑے ہوتے ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جب میں مروں گا تو میں سڑ گل جاؤں گا۔ میرا کچھ باقی نہیں بچے گا۔ حتیٰ کہ انا (روح) وغیرہ سے بھی کچھ نہیں۔ میں جوان نہیں ہوں اور میں زندگی سے محبت کرتا ہوں لیکن مجھے نفرت ہے کہ میں اپنے خاتمے کے خیال سے تھر تھر کانپنے لگ جاؤں۔ مسرت کے لمحات کی لذت اس سے کم تر نہیں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ختم ہو جانا ہے۔ اس طرح خیال اور محبت اپنی قدر اس لئے نہیں کھو دیتے کہ وہ سدا بہار نہیں۔ بہت سے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے بڑے فخر سے پھانسی کے پھندے کو اپنے گلے لگایا ہے۔ یقینی طور پر صرف ایسے لوگوں کی سر بلندی ہمیں اس دنیا میں انسان کے حقیقی مقام کے معنی سمجھاتی ہے۔ مذہب کے روایتی (انسانی ساختہ) قصوں کے بند کمروں کی گرمائش کے بعد اگر سائنس کے کھلے دریچوں کی ٹھنڈی ہواؤں سے ہم پر کپکپی طاری کیوں نہ ہو جائے۔ ہمیں ان سے گریز نہیں کرنا چاہیے کہ بالآخر تازہ ہوائیں چستی وقوت پیدا کرتی ہیں۔ کھلی اور کشادہ جگہوں کی ایک اپنی ہی الگ شان ہوتی ہے۔

فطرت کی فلاسفی ایک چیز ہے اور اقدار کی فلاسفی بالکل دوسری۔ ان کو خلط ملط کرنے سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ''کیا ہے'' اور ''کیا ہونا چاہیے'' یا جو ہمارے خیال میں اچھا ہے دو مختلف چیزیں ہیں۔ بلاشبہ ہم فطرت کا حصہ ہیں جو ہمارے اندر خوف، امیدیں اور خواہشات پیدا کرتی ہے۔ ان قوانین فطرت کے مطابق جنہیں علم طبعیات منکشف کر رہی ہے۔ اس تفہیم میں ہم فطرت کا حصہ ہیں۔ ہم سب فطرت کے ماتحت ہیں۔ قوانین فطرت کا نتیجہ اور ہم نے تادیر ان کا ہی شکار رہتا ہے۔

فطرت کی فلاسفی کو ہمیں ناواجبی طور پر اس کرہ ارض تک محدود نہیں کر دینا چاہیے۔ اس لئے کہ ہماری زمین ایک کہکشاں کے لاتعداد ستاروں میں سے ایک چھوٹے سے ستارے کے کئی سیاروں میں سے فقط ایک چھوٹا سا سیارہ ہے۔ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ فطرت کی فلاسفی کو ایسے نتائج پیدا کرنے کے لئے خم دے دیا جائے جو اس غیر اہم سیارے کے نہایت چھوٹے سے طفیلیوں (Parasites) (یعنی انسان) کے دل کو خوش کرے۔ نظریہ روحیت'' (Vitalism، یہ نظریہ کہ جانداروں کے اندر طبعی اور کیمیاوی اجزاء کے علاوہ ایک علیحدہ سے روح حیوانی ہوتی ہے) اور نظریہ ارتقاء والے غیر منطقی اور غیر متناسب طور پر زندگی کے ان حقائق میں کائناتی اہمیت تلاش شروع کر دیتے ہیں جن میں ہماری ذاتی دلچسپی ہے۔ اس عظیم جہان کے بارے ابھی تک ہم جو جانتے ہیں۔ اس کے مطابق یہ دنیا نہ اچھی ہے نہ بری۔ اور نہ ہی وہ ہمیں خوش یا ناخوش کرنے کے لئے فکر مند ہے۔ اس طرح کی سب فلاسفیاں محض انسان کی خود اپنی ذات کی اہمیت کو بڑھاوا دینے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہیں اور علم فلکیات کی تھوڑی سی سدھ بدھ ان کی صحیح کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اخلاقیات کی فلاسفی سے بالکل برعکس ہے۔ فطرت

کے بارے جو کچھ ہم جانتے ہیں حقیقی یا تصوراتی۔ اس کی جانچ پڑتال ہم خود ہی کرتے ہیں اور کوئی خارجی پیمانہ نہیں ہے جو ہمیں دکھائے کہ ہمارے تخمینے غلط ہیں لیکن اقدار کی دنیا میں ہم فطرت سے عظیم تر ہیں کیونکہ یہاں پر فطرت غیر جانبدار ہے۔ اسے اچھائی برائی سے کوئی تعلق نہیں، نہ ہی اسے ستائش دنیا کی تمنا ہے نہ ہی ملامت کا خوف۔ یہ ہم خود ہیں جو اقدار کو جنم دیتے ہیں اور ہماری اپنی خواہشات ہوتی ہیں جو انہیں ڈگری عطا کرتی ہیں۔ اخلاقیات و اقدار کی اقلیم میں ہم بادشاہ ہیں اور یہاں ہمارا فطرت کے آگے جھک جانا، خود کو تخت سے معزول کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہمیں نے اس بات کا تعین کرنا ہے کہ اچھی زندگی کیا ہے نہ کہ فطرت یا کسی اور غیر مرئی خدا نام کی طاقت نے......''

یہ تھے رسل کے خیالات خدا، مذہب اور ان سے متعلقہ موضوع کے بارے میں۔ رسل بھی دیگر دانشوروں کی طرح مذہبی عقائد کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ہم فطرت کے عمل کی ہی پیداوار ہیں یعنی خاص طور پر بنائی ہوئی مخلوق نہیں ہیں۔ ہماری سوچنے کی صلاحیت جو ہمارے اندر ایک روح ہونے کا احساس دلاتی ہے، وہ بھی اس مادی دنیا، الیکٹرون، پروٹون اور کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے اور جسم کے برباد ہونے کے ساتھ اس خصوصی احساس (روح) کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ روح بھی جسم کے ساتھ ہی نشو نما پاتی ہے اور اس کے ساتھ ڈھلتی ہوئی ختم ہو جاتی ہے۔ باقی حیات بعد از موت کی سب باتیں ضعیف الاعتقاد لوگوں کے دل کو خوش کرنے کے لئے اچھی ہیں۔ رسل بھی اس بات کی حمایت کرتا ہے کہ مذہب انسان کے خوف کی پیداوار ہے۔ تصور خدا میں انسان کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ فطرت کی طاقت ور قوتوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا، چنانچہ پہلے اس نے ایسی ہستی (پہلے دیوتا پھر خدا) کا تصور بنایا جو قادر مطلق ہو۔ پھر اس قادر مطلق کو دعاؤں، قربانیوں، پرستش اور حمد و ثناء کے گیت گا کر ''خوش'' کیا تا کہ وہ فطرت کی قوتوں کو انسان کی مرضی کے مطابق ڈھال دے۔ یہ تھا وہ آسان نسخہ جو قدیم انسان نے فطرت کی تسخیر کے لئے استعمال کیا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ آج کے انسان کی کیا مجبوری ہے؟ آج کے انسان کے ہاتھ میں تسخیر فطرت کے لئے اس کائنات کا گہرا علم اور طاقتور ٹیکنولوجی موجود ہے۔ رسل ان تباہ کن اثرات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے جو انسان پر مذہب کے پیدا کردہ مختلف خوف جنم دیتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے خوف کوئی بھی ہو، وہ خود اعتمادی اور صلاحیتوں کی موت ہوتا ہے۔ انسان کو بزدل اور غلام بناتا ہے۔ جسے مذہبی پیشوا ذریعہ استحصال بناتے ہیں۔ سب اہل ایمان خوف کی زنجیر سے بندھے ہوتے ہیں۔ وہ آزادانہ مرضی سے ''نیک اعمال'' انجام نہیں دے رہے ہوتے بلکہ ان کے پیچھے خوف اور احساس گناہ کارفرما ہوتا ہے جو عقائد نے پیدا کیا ہوتا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں کو مفلوج کرنا، مذہب کا سب سے بڑا منفی اور افسوس ناک پہلو ہے۔ مذہب جہاں لوگوں کو پر مسرت ابدی زندگی کا تصور دے کر انہیں خوش کرتا ہے وہاں ان کی زندگی میں احساس گناہ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن خدا کو منانے کے بھی بڑے آسان نسخے وضع کر دیئے جاتے ہیں۔ تا کہ لوگ گھٹ کر ہی نہ مر جائیں۔ مثلاً سونے سے پہلے فلاں مقدس الفاظ تین بار پڑھ لینے سے...... دن بھر کا سارا احساس گناہ ثواب کے ڈھیر کے نیچے دفن ہو جاتا ہے!!

پھر رسل کہتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو، روشنی کے لاکھوں سال پر پھیلی ہوئی اس وسیع کائنات کے تناظر

میں رکھ کر دیکھے۔ تب کائنات اس کو یہ کہتی ہوئی دکھائی دے گی ''اے انسان! اس لامحدود دنیا میں ایک تو کیا ہے......'' نہ کہ آسمان کے صحرائے عظیم میں پڑے ایک ذرے سے بھی کم تر حیثیت کی زمین پر بیٹھے ہم اس جہاں کے بارے اپنے من مرضی کی تعبیریں بناتے رہیں اور خود کو ضرورت سے زیادہ ہی خصوصی اور ''اشرف المخلوقات'' سمجھنے لگیں اور آخر میں رسل اخلاقیات اور اقدار کے سوال پر کہتا ہے کہ انسان کو ہی اس کا حق ہونا چاہیے کہ وہ کیونکہ اپنی زندگی کو پرمسرت بنا سکتے ہیں۔ زندگی کے لئے ''اچھا'' اور ''بہتر'' کیا ہے۔ اس کا فیصلہ انسان کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اخلاقیات اور اقدار کی تخلیق اور ان میں تغیر و تبدل کا اختیار صرف اور صرف انسان کو ہی حاصل ہونا چاہیے۔ اخلاقیات اور اقدار کو مقدس قرار دینا، معاشروں کو جامد کرنا ہوگا۔ انسان کی ترقی اور اس کے خوبصورت بننے کے عمل کو روکنا ہوگا۔

عقائد کا مسئلہ

رسل اپنی کتاب (Human Society in Ethics and Politics) کے باب نمبر سات میں عقیدے (Faith) پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے ''ہم سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے عقیدے کو صراط مستقیم اور دوسروں کے عقائد کو خطرناک سمجھتے ہیں لیکن میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ سب عقائد ضرر رساں ہوتے ہیں۔ ہم ایمان کی تعریف یوں کر سکتے ہیں...... کسی ایسی چیز پر مضبوط عقیدہ جس کے لئے کوئی شہادت میسر نہ ہو کیونکہ جس بات کی شہادت موجود ہوتی ہے، وہاں کوئی ''عقیدے'' اور ''ایمان'' کی بات نہیں کرتا۔ جیسے ہم یہ نہیں کہتے کہ میرا عقیدہ ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں یا میرا ''ایمان'' ہے کہ زمین گول ہے۔ ثابت شدہ حقیقتوں کے لئے کسی ایمان اور عقیدے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ''ایمان'' کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جب ہم ثبوت (Evidence) کے متبادل، جذبات کو استعمال کرتے ہیں۔ ثبوت کے بدلے جذبات کا استعمال لازمی طور پر انسانوں کے درمیان جھگڑے اور تنازعات کا باعث بنتا ہے کیونکہ مختلف گروہ مختلف جذبات کو متبادل کے طور پر پیش کریں گے۔ عقیدہ کوئی بھی ہو، اس کا دفاع عقل سے تو ہو نہیں سکتا۔ اس لئے اس کا دفاع پروپیگنڈے سے کیا جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر جنگ سے، اگر ایسی بات ہے جسے عقل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن آپ کے خیال میں لوگوں کا اس پر ایمان ضرور ہونا چاہیے تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ''بات'' ہے کیا؟ جہاں آپ حکومت کو کنٹرول کر رہے ہوں گے، آپ اپنے بچوں کے کچے ذہنوں میں عقیدے کو ڈال رہے ہوں گے اور ان کتب کو جلا رہے ہوں گے یا ان پر پابندی لگا رہے ہوں گے جو مختلف رائے کی حامل ہوں گی۔ جہاں آپ کا حکومت پر کنٹرول نہ ہوگا لیکن آپ کافی طاقت مجتمع کرنے کی صلاحیت رکھ سکتے ہوں گے تو آپ فتح کے خیال سے مسلح جدوجہد کا آغاز کریں گے۔ جہاں کہیں بھی کوئی عقیدہ زیادہ طاقت پکڑ جائے گا، وہاں ایسا ہونا لازمی امر ہے۔ ورنہ آپ کو ہمیشہ کے لئے حقیر سی اقلیت کے طور پر ہی مطمئن رہنا ہوگا۔'' آگے چل کر رسل اسی مضمون میں اس بات کی سختی سے تردید کرتا ہے کہ مذہب امن اور سلامتی کے پیغامبر ہو سکتے ہیں۔ مذہبی حکومتیں

لازمی طور پر جنگ باز ہوتی ہیں اور وہ اپنے پیروگاروں میں تشدد پسندی (Militancy) کو فروغ دیتی ہیں۔ رسل دلائل پیش کرتا ہے کہ اس میں بھی کوئی سچائی نہیں ہے کہ مذہب معاشرے میں باہمی ربط (Cohesion) پیدا کرنے کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ رسل کے خیال میں تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں جب کسی جہاد (مقدس جنگ) نے انسانیت کے لئے کوئی مثبت کردار ادا کیا ہو۔ رسل کے اپنے الفاظ میں ''جنگ میں جو چیز کسی مسلک (Creed) کو موثر بناتی ہے وہ اس کا منفی پہلو ہے۔ یعنی ان کے خلاف نفرت جو اس عقیدے کو نہیں مانتے، اس نفرت کے پیدا کئے بغیر مذہب لڑائی میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتا۔ کفار (ہر مذہب کے نزدیک دوسرے مذاہب والے کافر ہوتے ہیں) کے خلاف نفرت ہی ہوتی ہے جسے نمایاں کیا جاتا ہے۔ جب دو عقائد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو وہ اپنے بدترین پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔'' رسل کے مذکورہ خیال کی تصدیق کے لئے ایک مضمون (جنگ کراچی 28/3/90 میجر محمد سعید ٹوانہ۔ ستارہ جرات) سے اقتباس پیش ہے۔ دل تھام کر دیکھئے کہ خدا کے نام پر جنگ میں نفرت کی کیسی کیسی ہولی رچائی جاسکتی ہے۔

''خالد بن ولید جیسے کمانڈر دشمن کی افواج کو خونخواری اور دہشت کے ''پریشر ککر'' میں نرم کرلیا کرتے تھے۔ جنگ دریا میں خالد بن ولید نے قسم کھائی تھی کی اگر اللہ فتح دے تو دریا کے اوپر سے دشمن کا خون بہا کر دکھا دوں گا۔ انہوں نے ستر ہزار گردنیں مار کر یہ قسم پوری کی۔ تعاقب کے بعد غول درغول دشمن پکڑ کر لائے جارہے ہیں اور دریا کے اندر کھڑے گردنیں ماری جارہی ہیں۔ ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگ رہے ہیں، قیدیوں میں خوبصورت چہرے بھی ہوں گے جوانمرد بھی ہوں گے، ہارا ہوا لشکر تلوار کی زد میں آچکا تھا۔ اگر جنگ کے بعد گھر واپس جانا ہے تو بے رحم بن جاؤ۔ خالد بن ولید اس طرح جنگ لڑکر بار بار گھر واپس آجاتے تھے۔''

رسل کے مطابق عقائد کو دوام بخشنے کے لئے ضروری ہے کہ محتاط طریقے سے اندھے پن (Blindness) کی پرورش کی جاتی رہے تاکہ تازہ ثبوت اور حقائق لوگوں کے ذہنوں تک نہ پہنچنے دیئے جائیں۔ یہ اس انسان کا کمزور اور کسی حد تک قابل تحقیر پہلو ہے جو زندگی کے جوکھوں کا سامنا مذہب کے دیئے آرام بخش قصوں میں تلاش کرتا ہے لیکن اس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات ضرور جاگزیں ہوتی ہے کہ وہ ان پر ایمان فقط اس لئے رکھتا ہے کہ یہ اسے تسلی دیتی ہے۔ خدا اور ان سے متعلقہ قصوں پر ایمان انسان کو اگر کچھ تسلیاں بہم نہ کرتا تو دنیا میں عقائد کا نام ونشان نہ ہوتا۔ لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرات نہیں ہوتی کہ وہ اس خیال کا سامنا کرے اور نہ ہی مذہبی تصورات اسے کسی منطقی نتیجے تک پہنچاتے ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ وہ اس بات سے بھی باخبر ہوتا ہے، خواہ دھندلا سا ہی کیوں نہ ہو کہ اس کے خیالات مبنی برحقیقت نہیں لہذا وہ بھڑک اٹھتا ہے جب دوسرا اس کے خیالات سے اختلاف کرتا ہے لہذا تعزیریں، سنسرشپ اور مقید ومحدود توڑی مروڑی تعلیم ریاستی ہتھیار ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی قوموں کی ''کامیابی'' اس میں ہوتی کہ ایک ڈری ہوئی، غیر مہم جو اور ترقی کے لئے نااہل آبادی پیدا ہو۔ یہ اکثر کامیاب بھی ہوجاتے ہیں اور اپنے ملکوں کو تباہی کے کنارے پہنچا دیتے ہیں۔ ''ہوسکتا ہے آپ کا عقیدہ بائبل، قرآن مجید یا مارکس کی داس کیپٹل میں سے کسی پر ہو۔ آپ کو دماغ کی آنکھیں ضرور بند کرنی پڑیں گی اور اگر آپ ایک بار ثبوت، شہادت

اور دلیل کے سامنے اپنی آنکھیں بند کرتے ہیں تو آپ بار بار اور دیگر معاملات میں بھی حقائق سے نظریں چرائیں گے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ خدا پر ایمان کچھ زیادہ مضر نہیں ہے۔ میں اس بحث میں الجھوں گا نہیں۔ صرف اتنا کہوں گا...... یہ اس نسبت سے ضرر رساں ہوتا ہے جس نسبت سے آپ اندر سے اس شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کیا یہ حقائق کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔ ایک وقت تھا جب اس پر ایمان رکھنا بالکل عقلی بات تھی کہ زمین چپٹی ہے۔ اس وقت یہ یقین برے نتائج کا حامل نہیں تھا لیکن آج اگر لوگ زمین کو چپٹی کہتے رہیں تو انہیں دلیل کے سامنے اپنے دماغوں کو تالے لگانے پڑیں گے اور ہر طرح کی بکواسیات کو گلے لگانے کے لئے خود کو تیار رکھنا ہوگا۔ اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ آپ کا ایمان مبنی بر دلیل ہے تو پھر آپ اسے دلائل سے ہی ثابت کریں گے نہ کہ جبر اور دھونس سے اور اپنے ایمان کو چھوڑ دینے کے لئے بھی تیار رہیں گے، اگر دلائل اس کے خلاف چلے جاتے ہیں لیکن اگر آپ کے یقین کی بنیاد عقیدہ ایمان ہے تو پھر آپ محسوس کریں گے کہ دلیل فضول ہے اور آپ طاقت کا سہارا لیں گے۔ ہجوم کا سہارا...... یا پھر نوخیز ذہنوں کو مذہبی ''تعلیم'' کے نام پر مسخ کر دیتے ہیں۔ عقائد زدہ لوگوں کی خاص طور پر یہ حرکت نہایت بزدلانہ ہوتی ہے کیونکہ وہ اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہیں کہ کچے ذہن اپنا دفاع کرنے سے قاصر ہیں۔ بدقسمتی سے یہ فعل کم وبیش ہر مہذب ملک کے سکولوں میں رائج ہے۔''

مضمون کے آخر میں رسل اعلان کرتا ہے کہ دنیا کو عقائد کی نہیں، سائنسی حقائق کی ضرورت ہے۔ خواہ یہ عقائد خدا کے نام پر تھوپے جائیں یا کسی اور ازم کے نام پر......

جوش ملیح آبادی اور خدا

حضرت جوش اردو زبان و ادب کی ایک ممتاز اور معروف شخصیت ہیں۔ تصور خدا پر ان کا ایک مطبوعہ مقالا بلا تبصرہ حاضر خدمت ہے۔ اس میں خدا پر بڑے ہی گہرے اور قابل غور سوالات براہ راست جس طرح اٹھائے گئے ہیں، وہ جوش جیسے خرد افروز ادیب کا ہی حصہ ہو سکتا تھا۔ جوش اس خیال کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں کہ تصور خدا انسان کے اپنے ہی پروپیگنڈے کا مرہون منت ہے۔

1- کون مدعی ہے اور کون یہ قطعیت کے ساتھ ثابت کر سکتا ہے کہ یہ دنیا ایک قادر مطلق خالق کے بغیر عالم وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھی؟

2- کہیں خود خدا ایک ایسی ہستی کی مخلوق و پیداوار تو نہیں، جس نے سب سے پہلے اس کا تصور قائم کیا تھا؟ کیا ہمیں درحقیقت احتیاج ہے......؟ یا معاملہ یہ ہے کہ ہم اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہم اس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔

3- اگر ریا کار ارباب مذہب ڈھنڈورا نہ پیٹتے تو کیا یہ ثابت کیا جا سکتا تھا کہ خدا کبھی انسانیت کا مددگار رہا ہے؟ کیا ارباب دین نے خدا کو نیستی کی زمین کھود کر باہر نہیں نکالا ہے؟ اس اسرار فطرت سے غذا بہم نہیں پہنچائی ہے؟ اور تخیلات کی تمام ممکن الحصول بلندیوں کا خلعت اسے نہیں پہنا رکھا ہے؟

4- لیکن آخر کس مصلحت کی بنا پر یہ ریا کار خدا کو اس کے گوشہ خلوت سے کھینچ کر باہر نکال لائے ہیں اور اس کے کان میں یہ پھونک دیا ہے کہ تو خدا ہے؟ کیا ان حضرات کے اس طرح کان میں پھونک دینے سے پیشتر وہ خدا نہ تھا؟

5- کیا انسان کی ہی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ خدا کی خوشامد کرے اور خدا کے ذمے یہ فرض ہے کہ وہ ان بے ہودہ خوشامدوں کو برداشت کرتا رہے؟

6- کیا خدا کے اسماء وصفات مقرر کر کے آخر اسے تنگ کیوں کیا جائے؟ کیا یہ ہمارے اور خدا دونوں کے واسطے بہتر نہ ہوگا کہ ہم اس کی تعریف (Definition) سے باز رہیں اور ان تعینات میں اسے محدود کر کے جو ہمارے اوہام کو خوش آئند معلوم ہوتے ہیں، اس لامحدود قوت کی قطع و برید نہ کریں؟ اس ذات مطلق کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ''صرف اتنا یا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔'' کتنی ہولناک حماقت کا ارتکاب کرنا ہے۔

7- اگر خدا کوئی ایسی شے ہے جو اب تک ہمارے احاطہ علم میں نہیں آتی تو آخر ''خدا'' کہنے کے عوض ہم اسے ''نامعلوم

شے'' کے نام سے پکارنا شروع کردیں...... کیونکہ ''خدا'' کا لفظ کیا اس قدر کافی غلط طور سے استعمال نہیں کیا جا چکا کہ اب اسے بدل دینا ہی قرین مصلحت ہے۔

8- یہ بات درجہ حماقت تک لغو ہے کہ ہم ایک ایسے شخصی خدا کے باب میں مباحثہ کریں جو تشخص کے ساتھ بے پایانی کی بھی نمائندگی کرسکتا ہے لیکن آج بھی کتنے ہیں جو اس عقیدے کے قائم رکھنے پر اصرار کررہے ہیں۔

9- کیا بیل کا خدا اس کے نزدیک ایک ایسا عظیم الجثہ جانور نہیں ہے کہ اس کے سینگ ان تمام جانوروں میں سے جو اس نے اب تک دیکھے ہیں، سب سے زیادہ لانبے اور اس کا کوہان سب سے زیادہ اونچا واقع ہوا ہے؟

10- کہا جاتا ہے کہ اکثر خدا ہمیں دوسروں کے ذریعے سے نفع ونقصان پہنچایا کرتا ہے۔ اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو فرماں روا اپنی ذمہ داریوں کا بار دوسروں پر ڈال کر خود کو تمام ذمہ داریوں سے بچانے کا خوگر ہوتا ہے اس سے بالعموم نفرت کی جاتی ہے لیکن حیرت ہے ہمارا خدا آئے دن یہی کیا کرتا ہے اور پھر بھی ہم سے کہا جاتا ہے کہ وہ خدائے عدل پرور ہے اس کے سامنے سربسجود ہو جاؤ!

11- ایسے خدا کے وجود سے کیا فائدہ جس کی غذا اور حفاظت کا انتظام ہم خود کرتے ہیں، حالانکہ اس کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ وہ خود محافظ کائنات ہے۔

12- اگر خدا ''قادر مطلق'' ہے تو کیا ہم زندگی کے ہر قدم پر اس سے غلط فائدہ نہیں اٹھاتے اور اس کی اہانت نہیں کرتے؟

13- یہ ماہر دینیات آخر ''خدا جمیل ہے، خدا جمیل ہے'' کی رٹ کیوں لگایا کرتے ہیں؟ کیا انہیں یہ خوف ہے کہ اگر وہ اس کے جمال کا آوازہ بلند نہ کرتے رہیں گے تو ہمیں اس کی ذات سے جو دلچسپی ہے وہ بہت جلد ضائع ہو جائے گی۔

14- خدا کا عقیدہ ہمیں عقدہ کائنات کے وا کرنے میں تو مددگار ہے لیکن خود اس کی ذات کا عقدہ اس اعتقاد سے حل نہیں ہوتا۔

15- خارجی اشیاء کی پرستش ''بت پرستی'' ہے اور ''بے شکلی'' کی پرستش ''حدود شکل'' کے اندر ناممکن ہے، تم کس مسلک کے پیرو ہو؟

16- ایک ہاتھا پائی کرتی ہوئی نامراد دنیا کو مرغوں کی طرح لڑتے ہوئے دیکھنا ایک دہشت ناک مسرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور علی الخصوص اس عالم میں جب ہم ایک ایسے وجود مطلق کے قائل ہیں جس کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ ایک آن میں اس تمام فتنہ وفساد کو ختم کرنے کی قوت رکھتا ہے۔

17- جب ہم انسانیت اور دیگر حیوانات پر نظر ڈالتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ قوی ہمیشہ کمزور کو لقمہ بنا لیا کرتا ہے تو اس وقت کیا ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور نہیں ہو جاتے کہ یہ دنیا ایک عادل اور شفیق باپ کا ایک بھیانک اور سفاکانہ کھیل ہے؟

18- وہ لازمی طور پر کس قدر احمق منیجر ہوگا جو خوبصورتی کو بدصورتی اور بدصورتی کو خوبصورتی کے حوالے کیا کرتا ہے۔ جو کوے کی چونچ میں انگور دیتا ہے اور انگور کی بیل کو بھینسوں سے چرواتا ہے۔

19- بیشتر آسمانی کتابیں تکرار ہیں مقدس وقدیم نام نہاد مسودات الہامات کی جن میں کہیں کہیں تھوڑی بہت عقل عامہ کی جھلک بھی پائی جاتی ہے اور یہ تھوڑی بہت عقل عامہ کی جھلک ہی ہے جو ارباب فراست کو ان کی جانب متوجہ کر سکتی ہے۔

20- جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ وہ قادر مطلق جو سب سے زیادہ سنجیدہ اور خود دار ہے اپنے خوشامدیوں کی بکواس کو، جو خود اس کے منہ پر اس کی خوشامدیں کیا کرتے ہیں، خاموشی وصبر کے ساتھ برداشت کر لیتا ہے تو ہمیں اچھا خاصا مسخرا معلوم ہوتا ہے اور ہم قہقہے مارتے مارتے بے دم ہو جاتے ہیں۔ کوئی صاحب زکاوت ہستی خوشامدیوں کی دل سے عزت نہیں کر سکتی۔

21- اپنے محبوب دوستوں اور عزیزوں کی محبت کو خدا کی محبت پر قربان کر دینا صرف احمقانہ فعل ہی نہیں بلکہ مجرمانہ ارتکاب بھی ہے کیونکہ حاضر و ناضر خدا ان سب کے اندر موجود نہیں ہے؟

22- اگر حکم خدا کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو قتل کے جرم میں سولی کیوں دی جائے؟ خدا کے لئے بتاؤ قاتل کو قتل کا اشارہ کیا خدا ہی نہیں کرتا؟

23- جنت کیوں تعمیر کی گئی ہے؟ اس لئے کہ اس لالچ میں اچھے کام کرے۔ کیا اسے رشوت کے نام سے منسوب نہیں کیا جا سکتا؟

24- ارباب مذہب کی تاویلیں اور موشگافیوں کے جال اس لئے ڈالے جاتے ہیں کہ ہم حقائق کو بھول جائیں۔

25- کیا انسان کا خدا سے وہی تعلق ہے جو آقا کا غلام سے ہوتا ہے؟

26- کیا خدا کی سی سب سے زیادہ نمایاں ہستی کے لئے کسی کو یہ کہتے پھرنے کی ضرورت ہے کہ دیکھو وہ کس قدر عظیم اور دیکھو وہ اس قدر بلند مرتبہ ہے۔

27- اگر تمہیں صرف پروپیگنڈا کرنے کا گر آجائے تو تم خدا کو معزول کر کے خود اس کے تخت پر بیٹھ سکتے ہو۔ بہت سے افراد اس کاروبار میں کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔

28- ہم میں سے وہ لوگ جو خدا کو ثابت کرنے کی بوکھلاہٹ میں اس کی تعریف ''نیچر'' سے کرتے ہیں، وہ اس کے ساتھ شدید ناانصافی کر رہے ہوتے ہیں۔ خدا کے متعلق ہمارا تصور رحیم، پاک، بلند اور ان تمام صفات حسنہ کا مجموعہ ہے جو انسانی ادراک میں آسکتے ہیں لیکن نیچر غیر معقول، بداخلاق اور ہر قدم پر ظالم واقع ہوئی ہے جس سے خالق کی سیرت کا دامن داغدار نظر آنے لگتا ہے۔ کیا ہمارے سامنے دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ یعنی (1)۔ یا تو ایک بے نیچر خدا پر ایمان لائیں۔ (2)۔ یا ایک بے خدا نیچر پر؟

29- کیا یہ بات خدا کے نوٹس میں ابھی تک نہیں لائی گئی ہے کہ اس کے نام سے کیا کیا فائدے اٹھائے جا رہے ہیں۔ کتنے ''دین دار'' ہیں جو اپنی ناپاک عباؤں کے متعلق یہ مشہور کرتے پھر رہتے ہیں کہ یہ عبائیں خدا کے خاص درزیوں نے ان کے واسطے تیار کی ہیں جنہیں فرشتے طبق زر میں رکھ کر ان کے پاس لائے تھے۔ اور کیا آسمانی حکومت کے کسی مخبر نے بارگاہ ایزدی تک یہ شرمناک خبر ہنوز نہیں پہنچائی ہے کہ اس کے مقدس و برگزیدہ ارباب مذاہب خود اس کو اپنی دوکان کا بورڈ بنائے ہوئے ہیں۔ اس کا مول تول کر رہے ہیں۔ اس کی خرید و فروخت ہو رہی ہے اور داڑھیوں کے سائے میں اس نیلام میں چڑھا کر بولیاں بولی جا رہی ہیں۔

دامن یزداں اور اقبالؒ

ہمارے مسلم قومی اور ملی مزاج میں آزادانہ، معروضی اور سائنسی طرز فکر کی کوئی مضبوط روایت دکھائی نہیں دیتی۔ جذباتی اور کنزرویٹو مزاج اگر کسی قوم کے اعصاب پر غالب ہو جائیں تو کسی مفکر کی فکر کو آگے بڑھانے والی (Forward Looking) نظروں سے دیکھنے کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ سرزمین مشرق میں جو بھی مفکر و فلاسفر خال خال پیدا ہوئے، وہ کفر کے فتوؤں میں دفن کر دیئے گئے یا پھر تقدس کے سنگھاسن پر بٹھا کر ان پر سائنسی تنقید کے دروازے ہی بند ہو گئے۔ جب کسی فکر پر مقدس لبادہ چڑھتا ہے تو وہ سمجھ اور عمل دونوں سے باہر ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف مغربی اقوام فکر کے طوفان برپا کرتی، زقندوں سے تاریخ کی منزلیں طے کرتی رہی ہیں۔ ادھر ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ تو دوسرے ہی لمحے چودہ سو سال پیچھے والی اقوام کو بھی شرمندہ کر دیتے ہیں۔ اپنے مفکرین کی ٹانگ پیچھے کی طرف کھینچنے میں تو ہمیں کمال حاصل ہے۔ اقبالؒ مشرق کے ان دانشوروں میں سے تھا جس پر پہلے کفر کے فتوے برسائے گئے اور پھر اسے مقدس بنا کر ''اشعار زریں'' کے چوکھٹے پر لٹکا دیا گیا۔

اقبالؒ کے بارے کہنا مشکل ہے کہ بنیادی طور پر شاعر تھا یا فلاسفر لیکن اسے فلسفیانہ موشگافیوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور فلسفے کا وسیع مطالعہ بھی رکھتا تھا۔ اقبالؒ نے جامعہ میونخ میں ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالہ پیش کیا، وہ فارسی مابعدالطبیعات کے موضوع پر تھا۔ جرمن زبان، ادب اور فلسفہ کے مطالعے کے دوران نیٹشے اور برگساں کے پیہم حرکت وتغیر کے نظریئے نے اقبالؒ کی فکر پر گہرے اثرات چھوڑے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں فلسفہ پر لیکچر دینے کی دعوت دی گئی تو اقبالؒ نے وہاں اسلام میں مذہبی فلاسفی کی تعمیر نو پر سیر حاصل گفتگو کی، جس میں صوفی فکر کی چھاپ واضح تھی۔ اقبالؒ کا شاعرانہ مزاج رومی کے قریب تھا وہ بھی رومی کی طرح اسی دور سے گزر رہا تھا جب متضاد افکار کی بہت سی لہریں مسلم دنیا کو بہائے لے جا رہی تھیں۔ اقبالؒ کے افکار پر عقل ودانش پر محبت کی برتری کا خیال، آفاقی ارتقاء وتغیر اور آزادی کے نظریہ کے علاوہ سب سے بڑھ کر مرد کامل کا تصور چھائے نظر آتے ہیں۔

اقبالؒ اپنی فطرت میں بت شکن تھا، چنانچہ بتوں کے بت، خدا کا دامن بھی اس کے ہاتھوں چاک ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اقبالؒ کے انہی ریڈیکل افکار اور اسلامی عقائد کی تشریح نو پر GIBB تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''بے شک اگر اقبالؒ کی ہندوستانی مسلمانوں میں بطور شاعر اور قائد کی حیثیت سے عزت نہ ہوتی، تو پھر یہ بات مشکوک ہے کہ اقبالؒ کا اتنا انقلابی اور

مسلمہ عقائد کے خلاف کام کبھی چھپ نہ سکتا۔'' اقبالؒ عقائد کے معاملات اور مذہب کی تعمیل میں تقلید پسند نہ تھا۔ اقبالؒ نے برملا اظہار کر دیا کہ جنت اور دوزخ نام کے مقامات کا کوئی وجود نہیں بلکہ یہ روح کی حالتوں کے نام ہیں، جس پر عقیدہ پرستوں نے اسے اپنے غضب کا نشانہ بنایا۔ اقبالؒ عقائد کو جوں کا توں ماننے سے منکر تھا اور دلیل پیش کرتا تھا کہ ''انبیاء کرام بھی کبھی نئے راستوں کی کھوج نہ نکال پاتے اگر روایات پر بلا مشروط عمل کرنا کوئی اعلیٰ ترین نیک عمل ہوتا...... گویا اقبال انبیاء کو رائج شدہ عقائد سے انکار کرنے پر ''کفر کے اوّلین ارتکاب کنندوں میں شمار کرتا ہے۔ اقبالؒ کا زرخیز ذہن زمانہ طالب علمی میں ہی خدا کے وجود پر شک اور دہریت کے عمل سے گزرنے لگا۔ ان کے متجسس ذہن نے تلاش حق کے سفر ارتقاء میں کسی بات کی صحت اور صداقت کو دوسروں کی سند کے حوالے سے تسلیم نہیں کیا۔ روایت کی تنگ اور محدود فضا کو خیر باد کہہ دینے پر اقبالؒ ہمیشہ آمادہ رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ تخلیقی عمل میں مصروف گنہگار، بے حس پاک بازوں سے بہتر ہے۔ انہیں اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ سائنسی علوم سے عاری ہماری مذہبی تعلیم مسلمانوں کو غلامانہ اطاعت جیسی منفی اور انفعالی نیکیوں کا خوگر بنا دیتی ہے۔ اقبالؒ نے گناہ اور تقویٰ کے درمیان تقابل کرتے ہوئے کہا ''کم از کم ایک لحاظ سے گناہ تقویٰ سے بہتر ہے، گناہ میں تخیلی عنصر موجود ہے جو تقویٰ میں مفقود ہے۔'' کم از کم کے الفاظ اشارہ دیتے ہیں کہ اقبالؒ دوسری کئی لحاظ سے بھی گناہ کو تقویٰ سے افضل سمجھتے تھے۔ اسی طرح ایک جگہ ''نیک لوگوں'' کے بارے فرماتے ہیں ''گناہ کی اپنی ایک تعلیمی قدر و قیمت ہے۔ نیک لوگ اکثر سادہ لوح، احمق (Stupid) ہوتے ہیں'' صاف ظاہر ہے گناہ کا مطلب کسی مقدس ضابطے کی خلاف ورزی ہوتا ہے اگر غلط اور صحیح کے معیار کو صدیوں تک باندھ دیا جائے اور نسل در نسل لوگ انہی بندھے ٹکے ضوابط پر بلا سوچے سمجھے اور بے چون و چرا چلتے رہیں تو اس سے لوگ ''متقی'' تو ضرور بن جاتے ہیں لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے فارغ ہو جاتے ہیں، جو اعلیٰ ترین صفت انسانی ہے۔ چنانچہ اقبالؒ کا کہنا بجا ہے کہ تقویٰ انسان کو سادہ لوح اور احمق بناتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بلا سوچے مقدس روایات کے سامنے سر تسلیم خم کرواتا ہے۔ اور ''گناہ'' کے تقابلی علم اور تجربے سے محروم رکھتا ہے، جس سے صورت حال کی اصل نوعیت واضح ہوتی ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے جس قوم کو زندگی کے سارے سبق بنے بنائے دے دیئے جائیں، اس کی قوت تخیل اور تخلیقی صلاحیتیں کیسے پنپ سکتی ہیں۔ چنانچہ زندگی کے ہر معاملے میں مذہب کو گھسیٹ کر لے آنے اور مذہبی روایات سے راہنمائی لینے والے...... کم از کم ذہین ہرگز نہیں کہلائے جا سکتے۔ کسی مسئلے پر مذہب کو بطور سند لے آنا...... ذہانت کا نہیں، اندھی تقلید کا مظہر ہوتا ہے۔ خدا اور اس کے متعلقین کے نام کا فرمان جاری کر کے کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ عقل کو تالا لگا لیں کہ اب نہ مسئلے کے تجزیئے کی ضرورت ہے اور نہ کسی محاسن و نقائص کو جاننے کی۔ گویا تقویٰ لوگوں کو اندھوں کی ایک ایسی قطار میں بدل دیتا ہے جو ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چل رہے ہوتے ہیں! اقبالؒ کا گناہ کی تعلیمی قدر و قیمت کی بات کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ انسان کو سکھاتا ہے کہ اچھائی کیا ہے، بری چیز بری کیوں ہے اور اسے بہتر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ گناہ سوچنے سمجھنے کے نئے نظام کو کھولتا ہے۔ آپ خود نئی قدروں کو تخلیق کرتے ہیں۔ ذہین آدمی ''متقی'' نہیں ہو سکتا، کہ وہ سوال کرے گا...... خود تجربے سے گزر کر کسی نتیجے تک پہنچنا چاہے گا۔ کسی کی بنائی اور بتائی دنیا پر چلنے کی بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی آرزو رکھے گا اور

یہیں سے تقویٰ کا سارا نظام دھڑام سے نیچے آ گرتا ہے۔ چنانچہ اسے ایسے سادہ لوح لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو تقدیس کے نام پر بے قوف بنے رہنے پر آمادہ ہوں۔ جنت اور دوزخ کے تصور کو بھی اقبالؒ اسی لئے رد کرتا ہے کہ انہیں اگر سچ مچ (Literally) ایسے ہی سمجھ لیا جائے جیسے بتایا جاتا ہے تو جنت کی نہایت پرتعیش لیکن ساکن اور بے مقصد زندگی کسی ذہین انسان کے لئے باعث کشش نہیں ہوسکتی اور نہ ہی دوزخ کا تصور باعث عبرت ہوسکتا ہے کہ جس کی بے مطلب ابدی سزائیں کسی تشدد پسند مریضانہ ذہن کی تخیل پرواز کی کرشمہ دکھائی دیتی ہیں۔ گویا اقبالؒ کا خیال تھا کہ عقائد پرست گروہ صرف سادہ لوح اور احمق لوگوں پر ہی مشتمل ہوسکتا ہے اور جب صورت یہ ہو تو ان حضرات کا تصور خدا بھی اقبالؒ کو کیسے مرغوب ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ''خدا کے وجود'' کے عنوان سے ان کی تحریر کا ایک اقتباس کچھ یوں ہے ''میرے احباب مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں ''کیا تم خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہو؟'' میرا خیال ہے کہ جواب دینے سے پہلے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ اس سوال میں جو کلمات استعمال ہوئے ہیں ان کا مطلب معلوم کرلوں۔ اگر میرے احباب اپنے سوال کا جواب چاہتے ہیں تو انہیں پہلے یہ واضح کر دینا چاہیے کہ ''خدا''، ''وجود'' اور ''ایمان'' سے ان کی کیا مراد ہے؟ مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کلمات کو نہیں سمجھتا اور جب کبھی میں ان سے جرح کرتا ہوں، تو دیکھتا ہوں کہ میری طرح وہ بھی نہیں سمجھتے۔'' مذکورہ تحریر میں اقبالؒ نے اہل ایمان کی بے علمی کا پول جس خوبصورتی سے کھولا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن ''خدا''، ''وجود'' اور ''ایمان'' کے الفاظ کی تعریف (Definition) کرنے کا جو سوال اٹھایا ہے وہ فکر کے بڑے گہرے اور باکمال در کھولتا ہے۔ اقبالؒ جانتا تھا کہ ان تینوں الفاظ کی الگ الگ تعریف اور پھر انہیں باہم مربوط کرنے جب نکلیں گے تو ایسے گورکھ دھندے کا سامنا ہوگا کہ ایمان کی ''بڑھک'' مارنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ایک جگہ اقبالؒ خدا کے وجود پر دل اور عقل کے درمیان مکالمہ یوں کرواتے ہیں۔

دل: یہ امر یقینی ہے کہ خدا وجود رکھتا ہے۔

عقل: لیکن عزیز من! ''وجود'' تو میرے معقولات میں سے ہے اور تمہیں اس کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔

دل: یہ تو اور بھی اچھا ہے ارسطوئے من!

مذکورہ مکالمے میں اقبالؒ یہ واضح کر دیتا ہے کہ خدا پر ایمان دل کا معاملہ ہے، عقل کا مسئلہ نہیں اور یہی وہ اہم ترین نکتہ ہے جس پر تمام مفکر متفق ہیں۔ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے، ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ تصور خدا کا سائنس، عقل اور چارسو پھیلی ہوئی فطرت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ اس کے ''وجود'' کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ خدا پر ایمان کا سوال دل کی دنیا یعنی انسانی تخیل اور جذبات کا پیدا کردہ ہے۔ چنانچہ اس پر بحث ہی فضول ہے لیکن لوگ اکثر خدا کے ''وجود'' کو عقل کے ذریعے ثابت کرنے پر مصر رہتے ہیں اور خدا پر ''ایمان'' لانے کی بات بھی کرتے ہیں، حالانکہ ایمان کا مطلب ہی زبردستی ہے۔ ورنہ جس چیز کا ''وجود'' برحقیقت ہو۔ اس پر ایمان لانے کا سوال نہیں اٹھتا۔ محولہ بالا مکالمے میں عقل جب دل پر یہ اعتراض کرتی ہے کہ تم فزیکل دنیا کے لفظ ''وجود'' کو کیوں استعمال کر رہے ہو، تو اس پر دل کہتا ہے ''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔'' اس سے مراد یہی ہے کہ چلو اچھا ہوا۔ تصور خدا کی لفظ وجود یعنی عقل سے جان چھوٹی۔ جس کے بعد خدا پر ایمان کا سوال...... دل کی دنیا تک محدود، انفرادی اور ذاتی

نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے میں اہل ایمان کے لئے اترانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی حقیقت مطلق پر ایمان رکھتے ہیں جو خارجی حقیقت ہے بلکہ یہ ان کے دل کا معاملہ ہے۔ جس میں ذاتی پسند اور اپنی خواہش شامل ہے۔ تصور خدا مقدس وراثت کی شکل میں ملا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسے قائم رکھنا اور ثابت کرنا...... اپنی ذات اور انا کا مسئلہ ہوتا ہے لیکن اقبالؒ دل کی دنیا پر عقل کے پہرے بٹھانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ کسی بھی وجدانی اور مذہبی تجربے کی تصدیق کے لئے ان کی علمی آزمائش (Intelectual Test) پر بہت زور دیتا ہے۔ اس آزمائش کے مطابق

A Proposition to be True,
Should be consistent with some chosen
Corpus of Proposition

ایک خوبصورت قضیہ (قول) اسی وقت صداقت کے ترازو پر پورا اتر سکتا ہے جب وہ قضیے کی منتخب کردہ مجموعہ تحریروں کے ساتھ ہم آہنگی رکھتا ہو، جو لوگ ''خدا کو پانے'' اور اس کی ''تجلیوں'' کو دیکھنے کے مدعی ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے قوت تخیل کی اتنی طاقت ور ہو جاتی ہے جس پر وہ نہایت اخلاص کے ساتھ یقین کرنے لگ جاتے ہیں کہ انہیں شاید کسی خارجی حقیقت کا تجربہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ابن عربی جیسے مفکر کا حوالہ دینا مناسب ہوگا جس کی رائے کے مطابق جبرائیل دراصل نبیوں کی اپنی تخیل کی پیداوار تھا۔ حتیٰ کہ الفارابی کا بھی یہی خیال ہے۔ کٹر عقائد کے حامل اقبالؒ کے علمی آزمائش کے کلیے پر یک طرفہ ہونے کا الزام لگاتے ہیں کہ اقبالؒ جس منتخب مواد کو پیمانہ بناتے ہیں، ہوسکتا ہے وہی جھوٹا ہو یا قضیہ پرانوں کے ساتھ فٹ نہ ہوتا ہو۔ چنانچہ سچ کو جاننے کے لئے صرف ہم آہنگی (Consistency) دیکھنا ضروری نہیں۔

اقبالؒ فرائڈ کے نظریہ مذہب سے تو اتفاق نہیں کرتا البتہ فرائڈ کے ایک مقلد ماہر نفسیات ''یونگ'' (Jung) سے متفق ہوتا نظر آتا ہے۔ جس کا کہنا تھا'' یہ فقط سائیکی ہی ہے جس کے ذریعے ہم اس یقین پر پہنچتے ہیں کہ خدا ہم پر کارفرما ہے...... ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ آیا خدا اور لاشعور دو مختلف ہستیاں ہیں۔'' گویا ''یونگ'' کے مطابق تصور خدا انسانی نفسیات کی ہی تخلیق ہے۔ بقول ''یونگ'' زندگی کا ڈرامہ جس سرے کی طرف حرکت کرتا نظر آتا ہے اسے خود (Self) ہی کہا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ کا بھی یہی کہنا ہے کہ خدا کو اپنے اندر دیکھو اور اپنے کو اس کے اندر...... خودی کی پیدائش، اجتماعی شعور اور انفرادی آگہی کی دنیا کے درمیان تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کی انفرادی ہستی کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو لیکن انسان کی اپنی حدود، نفسیاتی تضاد و تناقص (Inconsistency) اور دوسروں کے مفادات کے ساتھ ٹکراؤ (جن کا بذات خود مقصد بھی وہی ہوتا ہے) اس عمل کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اقبالؒ کے مطابق زندگی کا مقصد خدا کو پانا یا اس میں ضم ہو جانا نہیں بلکہ تمام عمل و حرکت اور حیات کا مقصد شخصیت کی نشوونما اور تکمیل (Integration) ہے۔ اقبالؒ ایک خط میں ڈاکٹر نکلسن کو لکھتا ہے کہ انسان کا روحانی اور اخلاقی آئیڈیل...... ذات کی نفی نہیں بلکہ توثیق ذات ہے اور اس آئیڈل کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہے جب زیادہ سے زیادہ منفرد اور لاثانی بنا جائے۔'' اقبالؒ خدا کو حریف انسان کے طور پر دیکھتا ہے، چنانچہ وہ انسانی خودی کو اتنا بڑا کر دیتا ہے کہ کائنات میں خدا کے ادا کرنے کا کوئی رول ہی باقی نہیں بچتا۔ اقبالؒ کا یہ بڑا کمال

کام تھا کہ اس نے خودی کے فلسفے کو پیش کر کے خدا کے برتر واعلیٰ ہونے کے تصور کو بے اثر (Neutralize) کر دیا، بالکل نیٹشے کی طرح جیسے وہ خدا کا Murder کر کے انسان کو ''سپر مین'' بنا دیتا ہے۔ خودی کی بلندی یقینی طور پر کسی بھی ہستی کے سامنے جھکنے سے انکار کرے گی جب کہ سربجود ہونا روایتی تصور خدا کی اساس ہے۔ اقبالؒ کا متغیر اور آزاد دماغ خدا کی مطلقیت اور برتری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسے تو کائنات میں بھی ہزار خامیاں نظر آتی ہیں۔ ''خطاب انسان خدا کے نام'' کی نظم میں اقبالؒ بطور انسان اپنی سپریم خود اعتمادی کا اظہار کرتا ہے۔ خدا انسان پر الزام لگاتا ہے کہ میں نے یہ ساری دنیا مٹی اور پانی سے بنائی، تم نے اسے جغرافیائی خطوں میں بانٹ دیا۔ میں نے لوہا بنایا اور تم نے اس تلواریں اور تیر بنائے۔ میں نے جنگل بنایا اور تم نے کاٹنے کے لئے کلہاڑا۔ میں نے پرندے بنائے اور تم نے قفس۔ انسان جواب دیتا ہے ''تم نے رات بنائی میں چراغ، تم نے مٹی بنائی میں نے صراحی، تم نے صحرا، میں نے گلشن، تم نے پتھر میں نے آئینہ، تم نے زہر میں نے تریاق۔ تب خدا لاجواب ہو جاتا ہے۔ ''یہ دنیا ایسی ہی ہے مزید سوال مت کرو'' جواباً انسان کہتا ہے ''ہاں یہ ایسی ہی ہے لیکن اسے ایسی ہونا چاہیے نہ کہ ایسی جیسی کہ وہ ہے۔'' یہی موڈ اقبالؒ کی ایک اور نظم میں یوں دکھائی دیتا ہے ''اے خدا تم نے بہت محنت کر لی، تخلیق کے عمل نے تمہیں تھکا دیا ہوگا، میرے دل میں اتر کر ذرا بھر آرام کر لو...... تنہا و اکیلا، پرہیزگاری کی زندگی گزارنے سے اچھا ہے کہ تمہیں مجھ جیسا (انسان) دوست مل جائے۔''

ہم دیکھتے ہیں، اقبالؒ ذات خدا کی تشخیص اور اس سے اپنے رشتے کے متعین کرنے میں الجھے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبالؒ کا مختلف مکاتیب خیال کے علمبرداروں سے واسطہ پڑا۔ اس میں افلاطون، ابن عربی (وحدت الوجود)، نیٹشے اور ورڈز ورتھ شامل ہیں۔ اقبالؒ کا استاد میکنا گارٹ بی منکر خدا تھا۔ اقبالؒ شناس حضرات اقبالؒ کے نظریہ خدا کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ اقبالؒ اپنے شباب کے رومانوی دور میں خدا کو ایک ''ابدی اور مطلق حسن'' کے طور پر دیکھتا ہے۔ ایک مکمل ترین آئیڈیل، یہ افلاطونی نظریہ کا اثر تھا۔ جس کے مطابق ابدی حسن ہر شے کی اصل ہے۔ اسے کائنات کے ہر رنگ اور روپ سے حسن پھوٹتا نظر آتا ہے اور جب چار سو حسن ہی حسن کا فرما دکھائی دینے لگ جاتا ہے تو اس پر وحدت الوجود کا نظریہ غالب ہونے لگتا ہے، جہاں موضوع اور معروض کا فرق فریب نظر بن جاتے ہیں۔ خالق و مخلوق ایک ہو جاتے ہیں۔ ''کثرت میں ہو گیا وحدت کا راز مخفی'' کے ترانے بجنے لگتے ہیں لیکن اقبالؒ کو جلد ہی پتہ چلتا ہے کہ حسن ازلی نہیں زوالی ہے۔ اس کی حیثیت محض اضافی ہے۔ حسن تمنا کو مہمیز اور تخیل کو رفعت تو بخشتا ہے لیکن اضافی اور زوالی پذیر حسن خدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اقبالؒ دوسرے مرحلے پر ''حقیقت'' کو حسن کی بجائے حرکت سے تعبیر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے نظر آتا ہے کہ حقیقت مطلق بھی اتنی ہی سرگرم عمل ہے جتنا کہ میں مصروف کار۔ یہاں اقبالؒ کی نظر میں حقیقت مطلق کسی فریب نظر کا نام نہیں بلکہ وہ خودیوں (Selves) کا ایک نظام اور مجموعہ ہے۔ ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں، وہ ''خودی'' کی پوشیدہ قوتوں کا اظہار ہے۔ یہی ''خودی'' تصور و تخیل اور وسیع امکانات کی ایک کائنات ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیتی ہے۔ گویا کائنات کی بھی ایک خودی ہے جو حرکت و تغیر سے خود کو وجود میں لا کر اظہار کرتی ہے۔ خدا، تنظیم وحدت کا اصول (Organizing Principle of

(Unity بن جاتا ہے جو تخلیقی مقاصد کے لئے سارے جہان کو باندھے رکھتا ہے۔ اب ''خودی کی زد میں ہے ساری خدائی'' کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ اقبالؒ کو خودی کی جلوتوں میں مصطفائی اور اس کی خلوتوں میں ہی کبریائی نظر آنے لگتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک ہستی دراصل خودی (ایغو) ہے جو انسانی وجود میں درجہ کمال حاصل کرتی ہے۔ خوف کی اساس پر بنا خدا ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان خوف خدا کے عمل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اب خدا کی نہیں......خودی کی تلاش، مقصد حیات قرار پاتا ہے۔ احساس پستی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اعتماد اور حوصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ کمند ڈال کر یزداں کے شکار کی بات ہوتی ہے۔

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

چونکہ مذہبی پیشوا خدا کے ''احسانات'' جتلا کر انسان کو اس سے مرعوب کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ خدا نے تمہارے لئے یہ بنایا، خدا نے تمہارے لئے وہ کیا۔ اقبالؒ خدا کے احسانات'' کا قصہ یوں پاک کرتا ہے۔

پھوک ڈال یہ زمیں و آسماں مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کر

اے انسان! تم خدا کی دی ہوئی ان ادھار نعمتوں کو آگ لگا دو۔ اپنا جہاں تم خود پیدا کرو کہ یہی خودی کا تقاضا ہے۔ اقبالؒ ذات خدا پر طنز کرتا ہے کہ یہ عالم جو تو نے بنایا ہے۔ ایسے کئی عالم میرے خیال میں غنچہ کی طرح چٹک جاتے اور پھول کی طرح کھل جاتے ہیں۔ بات اور آگے بڑھتی ہے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیر اہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

سچ تو یہ ہے کہ انسان جب سے اس زمین پر پیدا ہوا ہے، وہ اسے سنوار رہا ہے انسان نے آج تک جو رول ادا کیا ہے، اس سے نظر آتا ہے کہ فطرت کی پیدا کردہ کج رویوں کا خاتمہ انسان کا بنیادی مشن ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی صنعائی سے فطرت کو نئے رنگ ہی نہیں معنی بھی دیئے ہیں۔ فکر جہاں اگر ہے تو صرف انسان کو، ورنہ مالک دو جہاں ہونے کا مدعی بوقت ضرورت ''بے نیاز'' بن جاتا ہے۔ پھر یہ بات بھی بڑی واضح ہے کہ اس دنیا میں انسان نے علم اور تخلیق کی جتنی بھی رعنائیاں وضع کی ہیں وہ انسان کی سیکولر (غیر مذہبی) فکر کا اعجاز ہیں۔ مذاہب عالم کی شکل میں ''خدائی فکر'' جتنی بھی سامنے آئی۔ اس دنیا کو خوبصورت بنانے اور انسان کی زندگی سہل اور بہتر کرنے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

اقبالؒ خدا پر یوں برستا ہے کہ اس میں تو مصالحت کا کوئی رنگ اور آشنائی کا پہلو نظر نہیں آتا۔ انسان کا قصور اتنا کہ دانہ گندم کھالیا اور شیطان کی تقصیر اتنی ایک سجدے سے انکار کر دیا ''تم مجھ پر پابندیاں عائد کر کے اس دنیا کی دلچسپیوں سے محروم رکھنا چاہتے ہو، ذرا یہ تو بتا کہ شیطان آیا کہاں سے اور وہ کس کی مخلوق ہے؟ روز حساب اگر تم نے رکھا ہی ہے تو ضروری نہیں کہ وہاں صرف تھر تھر کانپنے والے غلامی کے خوگر، منافقانہ زندگی گزار کر آنے والے، جہنم کی آگ سے خوفزدہ اور بہشت بریں کو للچائی نظروں سے دیکھنے والے ''اہل ایمان'' ہی اکٹھے ہوں گے۔ یاد رکھنا انسان سے تمہارا سامنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

روز حساب پیش ہو جب میرا دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اقبالؒ نے فن کی باریکی اور منطق کے زور سے قیامت کی متھ کی ساری بنیاد ہی الٹ کر رکھ دی ہے۔ اس متھ کے مصنفین نے قیامت کے روز خدا کے مقابل انسان کو بطور مجرم پیش کر کے اس کی تذلیل کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اسے عظمت انسان کا داعی کوئی بھی مفکر ہرگز قبول نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اقبالؒ بمقابلہ خدا انسان کی نمائندگی کا حق ادا کر دیتا ہے۔ جب انسان کا دفتر عمل کھلے گا تو بات خدا کے اپنے کردار (Role) تک بھی پہنچے گی۔ قادر مطلق اس کائنات اور زندگی میں ہونے والے اس خیر و شر کے تماشے میں خود اپنی ذمہ داری سے کیسے بچ پائے گا۔ طاقت ور نے ہمیشہ کمزور کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا ہے لیکن اس متھ کے مصنفین کو معلوم نہ تھا ''روز قیامت'' آنے تک انسان اس دنیا و کائنات کے بارے میں کتنا علم اور کتنی دسترس حاصل کر چکا ہوگا کہ دلائل کا جب دفتر کھلے گا تو بات خدا کی شرمساری پر آ کر ختم ہو جائے گی...... اور مزے کی بات ہے کہ اقبالؒ نے بات کو خدا کی شرمساری پر ہی ختم نہیں کیا ''مجھ کو بھی شرمسار کر'' کہہ کر انسان کو اخلاقی طور پر اور بھی بلند کر دیا...... ظاہر ہے کسی بڑے کو شرمسار کرنا انسانی اخلاقیات کے خلاف ہے۔

خدا کے مقابل انسان کے عظیم تر ہونے کا اظہار اقبالؒ کے ہاں یوں بھی ملتا ہے کہ اسے خدا کے تنہا ہونے پر افسوس ہوتا ہے اور اسے پارسائی چھوڑ کر انسان بننے کا مشورہ دیتا ہے۔ اقبالؒ ''حقیقت خدا'' کی وضاحت یوں کر دیتا ہے ''دیر و حرم کی تعمیر کر کے تیرا امیج بنانے والا میں خود ہی ہوں...... ! تو میری ہی آرزوں اور جستجوؤں کا پروردہ ہے!'' اقبالؒ بزبان انسان خدا کو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ خودی اور خودداری کے جوہر کے بعد یہ میرے لئے ممکن نہیں کہ میں گدھے کو گھوڑا کہوں!! کائنات کی لامحدود وسعتوں کے مقابلے میں انسان نے اپنی محدود صلاحیت کار کی فطری مجبوری کو جس شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اسے بھی اقبالؒ نے خدا کے خلاف دلیل کے طور پر یوں استعمال کیا ہے۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں، میرے لئے چار سو

لامکاں میں بیٹھ جانا تو آسان کام ہے لیکن زمان و مکان کی پابندیوں میں رہ کر زندگی گزارنا دوسری بات، چنانچہ خدا اور انسان کے درمیان اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو خدا کو انسان پر حکم آخر جاری کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ اس لئے اقبالؒ خدا پر ایک اور وار کرتا ہے۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اقبالؒ خدائی حجاب کے بھی سخت خلاف نظر آتا ہے، وہ خدا کو آشکارا دیکھنا چاہتا ہے اور فطرت کی آخری حقیقت تک پہنچنا اس کی آرزو ہے تاکہ خدا کے متعلق کنفیوژن کا خاتمہ ہو۔ اقبالؒ نکلی ہوئی چنگاریوں کی بجائے دبی ہوئی چنگاریوں کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اقبالؒ جب خدا کی تلاش میں نکلتا ہے تو جہاں کہیں ڈھونڈتا ہے، اسے انسان کا ہی پتہ چلتا ہے، خدا کا نہیں...... اس لئے کہ علم کی سب راہوں پر انسانی شعور کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اقبالؒ دنیائے چمن کی آرائش اور کوہ وصحرا کے نقش ونگار انسانی نگاہوں کے معیاروں کے مطابق بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ معلوم ایسے ہوتا ہے کہ اقبالؒ کی خواہش ہے کہ ''خدا کی بنی ہوئی دنیا'' پر انسان کی بنائی ہوئی دنیا کی چھاپ بیٹھ جائے۔

اقبالؒ نے جہاں کہیں خدا کے ساتھ مکالمہ کیا ہے، اس میں طنز حتیٰ کہ ''گستاخی'' کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؒ
کرتا کوئی اس بندہ گستاخ کا منہ بند

بات سیدھی سی تھی کہ سائنس اور علوم کی بیسویں صدی میں آخر خدا اور انسان کے درمیان ایک مطلق حاکم اور محکوم کا کلاسیکل مذہبی رشتہ اب مزید قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اقبالؒ کا ایک اور خوبصورت طنزیہ وار دیکھئے جس میں فکر کے کئی پہلو پنہاں ہیں

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اے خدا تو نے انسان کو بہشت سے بے آبرو کر کے نکالا تو تھا...... سنبھالے رہو مجہول فرشتوں اور حوروں کی مورتیوں سے بھری یکسانیت کی ماری جنت کو...... یہ سوچنا کم نگاہی تھی کہ انسان پھر اسی فردوس گم گشتہ میں واپسی کی پناہیں ڈھونڈے گا۔ انسان اس مادی کائنات کے اندر روز نت نئی فردوس و بہشت تعمیر کرنے کے لامتناہی سلسلے میں مشغول ہو چکا ہے۔ جاؤ اب انتظار کرتے رہو۔

اندازہ لگایئے کیا آج کے انسان کا روایتی مذہبی ڈسپلن کی کوٹھڑی میں دم نہیں گھٹنے لگے گا جب اس کے علم کی گہرائی اور شعور کی نزاکتوں کی حالت یہ ہو جائے، جہاں اقبالؒ کہہ اٹھتا ہے۔

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اس طرح ایک فارسی نظم میں اقبالؒ اس طرح خدا سے خطاب کرتے ہیں کہ ''اگر تو چاہتا ہے کہ میں اپنی ذات کا تعین تیرے نظارے کے لئے کھو بیٹھوں تو یہ سودا بڑا مہنگا ہے۔'' یہ کام تیرے فرشتوں کو ہی مبارک ہو، اس لئے کہ

مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبالؒ کہا کرتا تھا۔ ''خدا سے وفاداری کا مطلب انسان کی خود اپنی فطرت کے ساتھ وفاداری ہے۔'' لیکن دیکھنا یہ ہے جب منتہا و مقصود اپنی ہی فطرت کے ساتھ وفاداری ہو تو کیا ''خدا سے وفاداری'' کے الفاظ عملاً اضافی نہیں ہو جاتے۔ اس طرح اقبالؒ خدا کی تلاش کو بالآخر ''انکشاف انسان'' سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے خدا ''انا'' کی نئی نئی قوتوں کی دائمی تخلیق میں ملتا ہے۔ ''مسلسل تخلیق'' کا عمل ہی ''خدا کا وجود'' ہے۔ اس کی صفت کائنات کو تغیر پذیر رکھنا ہے۔ محبت اور حیات جب تخلیق اور تجدید ترک کر دیں گے تو ان کا وجود باقی نہ رہے گا۔

اقبالؒ کی مابعد الطبیعات بس اتنی سی تھی جس میں وہ رائج شدہ مذہب سے بدکتا اور سرکتا نظر آتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نئی چیز کی تلاش کرو، خواہ وہ گناہ آلودہ (Sinfull) ہی کیوں نہ دکھائی دے۔ اس میں کچھ نہ کچھ نیکی ضرور ہو گی۔ اقبالؒ کہتا ہے کہ ایک مقدس و پرہیزگار آدمی کے مسجد میں مبہوت بیٹھنے سے بہتر ہے وہ کافر جو اپنے بت کے سامنے جاگتے دل کے ساتھ کھڑا ہے۔

اقبالؒ نے اختلاف کیا تھا کہ خدا ''خبیر و علیم'' کی صفت کا حامل ہے۔ اس نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ خدا آنے والے واقعات کو پہلے سے ہی جانتا ہے۔ اقبالؒ کا کہنا تھا کہ اس سے ایک بند کائنات، ایک ساکن و ثابت مستقبل، پہلے سے طے شدہ، غیر متغیر خصوصی واقعات کا ایک ایسا نظام بن جاتا ہے جو برتر تقدیر کے کھیل کے طور پر خدا کی ساری تخلیقی سرگرمی اور سمتوں کو متعین کر دیتا ہے۔ روایتی عقائد کے حامل نقاد اقبالؒ پر معترض ہوتے ہیں کہ اقبالؒ پیش بینی (Fore Knowledge) اور مقدر (Predestination) کو مکس کر رہا ہے۔ وہ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ ایک آب و ہوا کا ماہر ہوا کے دباؤ کو دیکھ کر پیش گوئی کرتا ہے لیکن اسے متعین نہیں کرتا۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ خدا کی پیش خبری کا مطلب نہیں کہ وہ واقعات کے ہونے کا سبب بھی ہے۔ محض پیش علمی کسی چیز کے تعین کی وجہ قرار نہیں دی جا سکتی لیکن یہی لوگ دوسری ہی سانس میں خدا کی صفات بیان کرتے ہوئے کہہ دیں گے کہ خدا بطور خالق کی حیثیت سے واقعات کے وقوع ہونے کے اسباب کو پیدا بھی کرتا ہے اور ان کا تعین بھی...... نہ صرف یہ لوگ اقبالؒ کے اعتراض کے جواب میں ماہر موسمیات کی بودی مثال کیوں کر دے پاتے ہیں، شاید اس لئے کہ مذہب کے اندر متضاد باتوں پر ایک ساتھ ایمان عام سی بات ہوا کرتی ہے لیکن اقبالؒ تسلیم نہیں کرتا کہ خدا اس حالت میں ہے کہ وہ پہلے دیکھ سکے کہ کون سے امکانات حقیقت کا روپ دھارنے والے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا خدا اس سے زیادہ نہیں جان سکتا...... جتنا کہ انسان...... بقول اقبالؒ خدا کا علم اتنا ہی ہے...... جیسے یہ کون نہیں جانتا کہ نارمل انسانی بچہ اپنی بلوغت کو پہنچنے کے بعد سیدھا کھڑا ہو جائے گا۔ بامعنی الفاظ بولے گا اور ہوا میں نہیں اڑ سکے گا۔ اقبالؒ خدا کی پیش بینی اور پیش علمی سے اس لئے انکار کرتا ہے کہ تخلیق کے عمل میں آزادی، بے پایاں تنوع اور اصلیت (Originality) قائم رہ سکے۔ کٹر پرست اقبالؒ پر الزام لگاتے ہیں کہ اقبالؒ بھول گیا تھا کہ خدا صرف علیم ہی نہیں، خالق

مطلق بھی ہے! لیکن اقبالؒ دیانتدارانہ طور پر سمجھتا تھا کہ خدا کا پیشگی علم اس کائنات کے سارے عمل کو اندھی تقدیر کا غلام بنادے گا اوراس سے ساری ندرت، جدت، اپج چھین لے گا۔کوئی بھی تخلیق طبع زاد نہیں رہے گی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ''اگر تاریخ کو صرف یوں سمجھا جائے کہ یہ پہلے سے طے شدہ واقعات کا ایک نظام ہے، جس کی تصویریں آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں تو پھر اس میں ندرت اور پیش رفت کی کوئی جگہ باقی نہیں رہ جاتی۔'' گویا اگر خدا کو جوں کا توں مان لیا جائے جیسے مذہبی پیشوا اس کے بارے بتاتے ہیں تو اقبالؒ کی دلیل تھی کہ پھر تخلیق کا مطلب ہی کوئی نہیں رہ جاتا۔ وہ ایک بے رحم ڈرامہ اور مضحکہ خیز کھیل بن کر رہ جاتا ہے بلکہ اقبالؒ سوال اٹھاتا ہے کہ پہلے سے طے شدہ چیز کو دیکھنے میں خدا کو بھی کیا دلچسپی ہوسکتی ہے......اس کا کوئی رول ہی نہیں رہتا، اسے سوجانا چاہیے۔ چونکہ خدا کامل مطلق ہے تو پھر کائنات کی تخلیق بھی کامل اور نقائص سے پاک ہے لیکن یہ دعویٰ کون کرسکتا ہے کہ یہ کائنات نقائص سے پاک ہے اوراس کے پاس پیمانہ کیا ہوگا۔ نقص کے تصور کے بغیر خوبی کا لفظ وجود ہی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ انسان سے بہتر کوئی مخلوق پیدا نہیں ہوسکتی تھی......اور وہ بھی خدا سے......

اقبالؒ تقدیر پر یوں حملہ آور ہوتا ہے ''مستقبل اس لئے نہیں دیا گیا کہ ایک طے شدہ راستہ ہے جسے آپ نے قدموں سے سر کرنا ہے۔ بلکہ یہ اپنی فطرت میں کھلا امکان ہے، چنانچہ کسی چیز کی قسمت کا مطلب اس کا باہر سے بندھا ہوا مقدر نہیں بلکہ وہ قابل حصول امکانات ہیں جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں پنہاں ہیں اور کسی خارجی جبر کے بغیر انہیں حقیقت میں بدل کر وقوع پذیر کرنا ہے۔ لہٰذا اقبالؒ تقدیر کے کسی ایسے نظریئے سے منکر ہے جس کے مطابق اس دنیا و کائنات میں ہونے والے واقعات کسی فلم کی ریل (Reel) کی طرح ہیں، جو حقیقت مطلق کے رحم میں بند ہیں اور اس میں سے ایک ایک دانے کے طور پر گر رہے ہیں۔ جیسے (Hour Glass) سے ریت گرتی ہے۔ اقبالؒ تقدیر کو کسی چیز کے مستقبل کے امکانات سمجھتا ہے جنہوں نے ابھی حقیقت کا روپ دھارنا ہے۔ چنانچہ بقول اقبالؒ ''جو کچھ خدا جانتا ہے اسے انسان بھی جان سکتا ہے......'' اور یوں اقبالؒ نے رائج شدہ مذہبی تصور خدا سے بہت بڑا انحراف کر کے ملت اسلامیہ کو روایات سے نہیں عقل سے سوچنے کی ترغیب دی...... باوجود اس احساس کے کہ وہ ایسی قوم میں پیدا ہوا جہاں کے لوگ آزادانہ فکر و خیال کرنے بجائے ذہنی غلامی پر ہی رضامند ہیں۔

دورِ حاضر کا انسان اور خدا

اب تک انسانی شعور کے نا معلوم (Unknown) سے معلوم (Known) تک کے ارتقائی سفر کے دوران تصور خدا میں ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ انسان کا یہ سفر تا حال جاری ہے۔ انسانی شعور کو تہذیب کے مختلف مراحل پر فطرت کے ساتھ اپنے رشتے کو سمجھنے میں جن سوالوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کے جوابات کی تلاش کے لئے اس نے اپنی تمام قوتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ فہم و ادراک کے اس عمل میں جو خلا (Gaps) رہ جاتے، انہیں اساطیر، دیو مالا، نوع بہ نوع عقائد اور مذاہب پر کرتے۔ دوسری جانب محنت کے عمل کے دوران فطرت کی قوتوں کے راز افشاء ہونے پر خود ساختہ خداؤں کی تسخیر بھی ہوتی رہی۔ اس طرح انسان کفر و ایمان کے اپنے ہی بنے جال میں گرفتار خود اپنے شعور سے الجھتا رہا اور بالآخر وقت آ گیا جب وہ اپنے شعور کی نوزائیدگی سے بلوغت تک کی کہانی خود بیان کرنے کے قابل ہو گیا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ انسان آج اپنے شعوری بلوغت کے دور میں ان سوالوں سے کیسے نپٹ رہا ہے جو کبھی تصور خدا کی تخلیق کا باعث بنے تھے۔ عقیدہ خدا کے لئے جو عوامل مرکزی کردار ادا کرتے رہے ہیں ان میں فطرت کی سرکش قوتوں اور حالات کے سامنے بے بسی کے علاوہ تخلیق کائنات کا مسئلہ پیش پیش رہے ہیں۔ ایک ماورائی قوت کا تصور انسان کا اس وقت نفسیاتی سہارا بنتا ہے جب وہ کسی مسئلے سے دوچار ہو کر بے کسی کی دہلیز پر آن کھڑا ہوتا ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جب تک بے بسی کی حد نہیں آتی، انسان کو خدا کے تصور کے سہارے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بے بسی روزمرہ کے معاشی و سماجی حالات و واقعات کے دوران بھی ہو سکتی ہے اور تفہیم کائنات کے عمل کے دوران بھی...... معمول کی کسی بیماری میں مبتلا ہوں تو کسی کو خدا یاد نہیں آئے گا البتہ جان لیوا بیماری میں جو کسی حد تک موجودہ وسائل کے مطابق لاعلاج ہو تو خدا کا نام نفسیاتی سہارا بن کر لبوں پر اتر آتا ہے۔ اس طرح کوئی معاشرہ جتنا علم سے بے بہرہ اور معاشی طور پر پس ماندہ ہو گا، اس کی بے بسی کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں عقیدہ خدا کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خدا کا ''وجود'' اہم رول ادا کر رہا ہوتا ہے اور جن معاشروں کا معیار زندگی بلند ہے، لوگ عمومی طور پر تعلیم یافتہ ہیں اور زندگی کی شب و روز سرگرمیوں میں ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال ہو رہا ہے، وہاں عقیدہ خدا کسی میوزیم ''پیس'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

آج کا جدید انسان اقتصادیات، اخلاقیات اور فزکس کی دنیا کے سوالوں کے جواب کے لئے خود کو بے بس محسوس نہیں کرتا۔ اس کے پاس سائنسی بنیادوں پر نہایت گہرا، معیاری منظم اور ہمہ جہت علم کا وسیع خزانہ موجود ہے۔ وہ اس اربوں

نوری سال پر پھیلی ہوئی کائنات کے لامتناہی سلسلے کے مقابلے میں اپنی محدود صلاحیت کار سے بھی اچھی طرح آگاہ ہے لیکن اپنی کمزوری کا یہ احساس اتنا زیادہ نہیں کہ اسے کسی توہم پرستی یا مفروضے کا سہارا لینا پڑے بلکہ مذکورہ بے بسی اسے اور جستجو کرنے اور علم کی مزید سرحدیں پار کرنے پر اکساتی رہے گی۔ آیئے دیکھتے ہیں آج سائنس اس کائنات کی ساخت اور تخلیق کے بارے ہمیں کیا معلومات فراہم کرتی ہے کہ تصور خدا بہرحال اس طرح کے سوالوں سے گہرے طور پر جڑا ہوا ہے کہ یہ دنیا آئی کہاں سے؟ کس طرح اور کیونکر اس کا آغاز ہوا؟ کیا یہ ختم ہو جائے گی اور کیسے؟ ایک زمانہ تھا ان سوالوں پر عقائد کا راج تھا۔ چنانچہ مختلف مذاہب اور عقائد نے لامحدود قصے اور کہانیاں پیش کیں جن پر خدا کے ہونے کی ساری عمارت کھڑی تھی۔ خبر نہ تھی کہ ایک دن یہ کائنات نہ صرف ان سوالوں کا جواب خود پیش کرے گی بلکہ انسان تخلیق کائنات کے ابتدائی لمحات و واقعات نہ صرف اپنی آنکھ سے دیکھ سکے گا بلکہ ہمیشہ کے لئے انہیں کیمرے کی آنکھ میں بند بھی کیا جاسکے گا (29 مارچ 1996ء کو بی بی سی ٹی وی نے دنیا بھر کو خبر دکھائی اور سنائی کہ تخلیق کائنات کے ابتدائی لمحات کا نہ صرف نظارہ کیا بلکہ اس کی تصویریں بھی کھینچ لی گئیں) کچھ عرصہ پہلے تک یہ عام خیال تھا کہ کائنات ہمیشہ سے اسی طرح وجود میں ہے، جیسی آج دکھائی دے رہی ہے یا پھر کبھی ماضی میں معین وقت پر اس کی تخلیق ہوئی تھی جس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سینٹ آگسٹائن نے مذہبی کتب کی روشنی میں کائنات کی تخلیق کی عمر پانچ ہزار سال قبل از مسیح بتائی جب کہ ارسطو اور دیگر یونانی فلاسفر تخلیق کے نظریئے کو نہیں مانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان اور دنیا ہمیشہ سے ہیں۔ سینٹ آگسٹائن سے ایک دفعہ پوچھا گیا ''تخلیق کائنات سے پہلے خدا کی کیا مصروفیات تھیں؟'' آگسٹائن نے جواباً یہ تو نہیں کیا کہ وہ ان لوگوں کے لئے دوزخ بنا رہا تھا جو اس طرح کے سوال پوچھتے ہیں بلکہ اس کا جواب تھا ''وقت موجود کائنات کی خصوصیت ہے جو خدا کی بنائی ہوئی ہے، چنانچہ زمان کائنات سے پہلے وجود نہیں رکھتا تھا۔'' اسی طرح نیوٹن کے اپنے دریافت کردہ قوانین کے مطابق جب مطلق مکان اور مطلق پوزیشن کا تصور باطل ہو گیا تو اس پر اسے پریشانی لاحق ہو گئی کیونکہ اس طرح اس کے مطلق خدا کے عقیدے پر زد پڑتی تھی، چنانچہ اس نے کسی مطلق مکان کے نہ ہونے کے خیال کو ماننے سے انکار کر دیا، حالانکہ خود اس کے قوانین کے مطابق ایسا نتیجہ نکل رہا تھا۔ ارسطو اور نیوٹن دونوں زمان (Time) کے مطلق ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ بقول ان کے زمان، مکان سے مکمل طور پر آزادانہ وجود رکھتا ہے۔ بہرحال یہ آئین اسٹائن تھا جس نے زمان اور مکان کا سارا تصور ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس نے کہا، زمان اور مکان سیدھے (Flat) نہیں بلکہ توانائی (Energy) اور مادے کی کمیت (Mass) نے ان میں انحنا (curvature) اور خم (Warp) پیدا کر رکھا ہے، چنانچہ اجسام فلکی کشش ثقل کی وجہ سے نہیں بلکہ مکان کے منحنی ہونے کی وجہ سے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔ سورج کے (Mass) نے مکان کو یوں ٹیڑھا کر رکھا ہے کہ زمین اپنے طور پر سیدھے رستے پر چل رہی ہے لیکن ہمیں ایسا لگتا ہے کہ وہ گول مدار میں چکر کاٹ رہی ہے۔ اس طرح بڑے کمیتی جسم (Massive Body) کے ساتھ وقت (زمان) بھی آہستہ چلتا ہے۔

اب کائنات کی وسعت پر تھوڑی سی بات ہو جائے۔ سورج کے بعد ہمارے قریب ترین ستارہ اتنی دور ہے کہ اگر کوئی

راکٹ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلے تو اسے اس ستارے تک پہنچنے میں ساڑھے چار سال لگیں گے۔ ہماری کہکشاں ایک لاکھ روشنی کے سال کے فاصلے پر محیط ہے اور ستارے اس کے گرد کئی سوملین سال میں ایک چکر مکمل کرتے ہیں، جب کہ اس کائنات میں کئی سو ہزار ملین کہکشائیں موجود ہیں۔ ایک کہکشاں کئی سوارب ستاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہمارا سورج ایک اوسط سائز کا عام ستارہ ہے جو اپنی کہکشاں کے ایک چکر دار بازو کے اندرونی کنارے پر واقع ہے۔ 1929ء میں (Edwin Hubble) نے اپنے اس مشاہدے کا اظہار کیا کہ ہم کائنات کو جہاں سے بھی کھڑے ہو کر دیکھیں، وہ ہم سے دور بھاگتی نظر آتی ہے۔ کائنات کا یہ پھیلاؤ ایک ہزار ملین سال میں 5% سے لے کر 10% تک ہوتا ہے۔ تخلیق کائنات کا عمل کوئی 15 ارب سال پہلے ایک ''بگ بینگ'' Big Bang سے شروع ہوا تھا۔ اس سے پیشتر کثافت اور حرارت کے لامحدود (Infinite) حد تک چھوٹا ہونے سے کائنات کا سائز صفر تھا اور سائنس کے تمام مروجہ قوانین معطل تھے۔ ''بگ بینگ'' کے صرف ایک سیکنڈ بعد کائنات کا درجہ حرارت دس ہزار ملین ڈگری گر گیا۔ اس وقت کائنات زیادہ تر نیوٹرن، الیکٹرون اور فوٹون اور ان کے (Anti-Particles) پر مشتمل تھی۔ کائنات کے وجود میں آنے کے 100 سیکنڈ کے بعد نیوٹرون سے ایٹم کے Nucli بننا شروع ہو گئے جن میں ایک پروٹان اور ایک نیوٹران تھا۔ پھر ان سے Helium Nuclie بنا۔ بگ بینگ کے چند گھنٹوں کے بعد ہیلیم اور دیگر عناصر بننا بند ہو گئے اور اگلے دس لاکھ سال تک کائنات یونہی پھیلتی رہی۔ جہاں اوسط سے زیادہ کثافت (Density) ہوئی، وہاں مادے نے بیرونی کشش کی وجہ سے گھومنا (Rotate) شروع کر دیا۔ اس تیزی سے گھومتے ہوئے مادے سے کہکشاؤں نے جنم لیا۔ ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس ان کہکشاؤں سے ٹوٹ کر چھوٹے بادلوں میں تبدیل ہو گئی۔ سکڑاؤ کے عمل سے ایٹم ٹکرائے۔ اس ایٹمی عمل نے ہائیڈروجن کو ہیلم گیس میں منتقل کیا۔ گیس کے یہی بادل روشنی اور حرارت کے دو منبع ہیں، جنھیں ہم ستارے کہتے ہیں اور جو لمبی مدت تک اپنی حالت کو مستحکم رکھتے ہیں۔ انھی بادلوں سے بھاری عناصر کا کچھ مادہ اکٹھے ہو کر وہ اجسام بن گئے جنھیں سیارے (Planets) کہتے ہیں، جو اپنے ستارے کے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ ہماری زمین بھی ایک سیارہ ہے اس کی عمر تقریباً پانچ ارب سال ہے۔ شروع میں بہت گرم تھی، پھر یہ ٹھنڈی ہوئی، چٹانوں سے نکلنے والی گیس سے اس کی فضاء بننی شروع ہوئی۔ یہ وہ فضا نہیں ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں بلکہ زہریلی گیسوں پر مشتمل تھی۔ آکسیجن بھی مفقود تھی۔ تین سو کروڑ سال گزرنے کے بعد بیالوجی (حیاتیات) کا ابتدائی عمل شروع ہوا۔ پہلے حیات کی ابتدائی ترین اشکال بنی، حیات کی نمو سمندروں سے شروع ہوئی۔ ایٹموں کے اتفاقیہ اتصال سے کچھ بڑے ڈھانچے تخلیق پائے جنھیں میکرو مالیکول کہتے ہیں۔ جو اس قابل تھے کہ وہ دوسرے ایٹموں کو بھی اکٹھا کر کے ایک جیسی ساختوں میں ڈھال دیتے تھے۔ انھوں نے پیدائش کا عمل (Reproduction) شروع کر دیا۔ ان کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ارتقائی عمل سے زیادہ سے زیادہ پیچیدہ اشکال بننے لگیں۔ ابتدائی حیات کی شکلوں نے مختلف مواد کو اپنی خوراک بنایا اور ہائیڈروجن سلفائیڈ اور آکسیجن کو چھوڑا، جس سے زمین کی فضا بدلنے لگی اور اعلیٰ درجے کی مخلوقات کی پیدائش کا عمل شروع ہوا۔ پہلے مچھلیاں، رینگنے والے جانور، دودھ پلانے والے جانور اور بالآخر انسان کی نمود ہو گئی۔ گو کچھ سوال ابھی جواب طلب ہیں لیکن

کائنات کے بننے کے مذکورہ بالا خاکے کی وہ تمام مشاہداتی شہادتیں تصدیق کرتی ہیں، جو آج ہمارے پاس ہیں۔

کیا کائنات ہمیشہ کے لئے یونہی پھیلتی رہے گی...... سائنس اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پھیلاؤ کی رفتار کم ہو رہی ہے اور حرارت (Thermodynamics) کے قانون نمبر 2 کے مطابق ستاروں کی حرارت صرف ہو کر ایک دن ختم ہو جائے گی۔ دور بھاگتی کہکشاؤں کی باہمی کشش ثقل کمزور ہو کر پھیلاؤ کے عمل کو سست کر دے گی اور ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ عمل نہ صرف رک جائے گا بلکہ کائنات الٹا سمٹنا شروع کر دے گی۔ ان اندازے کے مطابق بگ بینگ سے 40 ارب سال بعد کائنات سکڑنا شروع ہوتی ہے اور اگلے 40 ارب سال میں کائنات ایک (Big Crunch) میں تبدیل ہو کر اگلے بگ بینگ کا پیش خیمہ بنے گی جس سے پھر کائنات کا از سر نو آغاز ہوگا...... چنانچہ جس ''بینگ'' نے ''ہماری'' کائنات کا آغاز کیا تھا، اسی بینگ نے کسی پچھلی کائنات کا خاتمہ کیا تھا۔ ہماری کائنات کے خاتمہ پر کسی دوسری کائنات کا آغاز ہوگا، چنانچہ وقت (زمان) کا خاتمہ، وقت کا آغاز بھی ہے۔ کائنات کی عظیم الشان گھڑی اپنے پھیلاؤ اور سکڑاؤ کا چکر 80 ارب سال میں پورا کرتی ہے۔ کتنی بار یہ کائنات بن چکی ہے۔ James Hutton کا کہنا ہے ''ہمیں آغاز کا کوئی نشان نہیں ملتا نہ کوئی انجام کا امکان نظر آتا ہے۔''

عالمی شہرت یافتہ علم الطبیعات کا سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ (Stephen. W. Hawking) کائنات کے آغاز وانجام کے انہی بنیادی سوالوں کے جواب کی تلاش میں ''خدا کے ذہن'' کو پڑھنے جب نکلتا ہے تو جس نتیجہ پر پہنچتا ہے، اسے وہ اپنی ریکارڈ بکنے والی کتاب ''وقت کی ایک مختصر تاریخ'' (A Brief History of Time) میں یوں بیان کرتا ہے ''کیتھولک مذہب کے مرکز ویٹیکن نے سائنس دانوں کو دعوت دی کہ وہ فلکیاتی سائنس پر آ کر اپنا نقطہ نظر پیش کریں جو چند صدیوں پہلے گلیلیو کو صرف یہ کہنے پر اذیتیں پہنچا چکا تھا کہ سورج نہیں، زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ کانفرنس کے اختتام پر سائنس دانوں کی پوپ کے ساتھ ملاقات کروائی گئی جہاں پوپ نے سائنس دانوں کو مشورہ دیا کہ ''بگ بینگ'' کے بعد کائنات کے ارتقاء پر تحقیق کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ انہیں بگ بینگ پر تحقیق نہیں کرنے چاہیے کیونکہ تخلیق کا وہ لمحہ...... خدا کا فعل تھا'' اس پر مجھے خوشی ہوئی کہ پوپ کو اس بات کا کوئی علم نہیں کہ میں نے ابھی ابھی کس موضوع پر لیکچر دیا ہے...... یعنی اس امکان پر کہ زمان و مکان محدود لیکن کناروں (Boundries) کے بغیر ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نقطہ آغاز نہیں، لہٰذا کوئی لمحہ تخلیق بھی نہیں...... میری کوئی خواہش نہ تھی کہ میرا حشر بھی گلیلیو جیسا ہو، جس کے ساتھ میری ذات کا رشتہ پہلے ہی اس اتفاق سے ملا نظر آتا ہے کہ میں اس کی موت کے ٹھیک تین سو سال بعد پیدا ہوا تھا'' اسٹیفن ہاکنگ کا کہنا ہے ''کائنات کے بننے کا فرمان جاری کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ خدا نے کائنات کو قوانین طبیعات کے مطابق چلنے پر چھوڑ دیا ہے اور وہ اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔'' چنانچہ اسٹیفن ہاکنگ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کائنات کے سارے حرکت و عمل میں خدا کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ سائنس کی ساری تاریخ اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ واقعات یونہی یک طرف طور پر وقوع پذیر نہیں ہوتے، ان کی سطح کے نیچے ایک نظم نظر آتا ہے جسے خدائی فیضان کی دین بھی کہا جا سکتا ہے اور نہیں بھی، لیکن کچھ سائنس دانوں کی رائے یہ

بھی ہے کہ کائنات کا آغاز ایک عظیم انتشار (Chaos) سے شروع ہوا تھا، چنانچہ ہماری مشاہداتی دنیا میں جو نظم نظر آتا ہے یہ اس طرح کا اتفاق ہے، جیسے بہت سے بندر ٹائپ رائٹر پر ہاتھ ماریں تو ایک دور کا امکان ہے کہ ان سے اتفاقیہ طور پر شیکسپیئر کی تحریر کا کوئی ٹکڑا رقم ہو جائے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ یہ کائنات ایسی کیوں ہے جیسی ہمیں نظر آتی ہے تو اس کا سادہ جواب یہی ہے، اگر یہ مختلف ہوتی تو ہم کہاں ہوتے؟ چونکہ ہم وجود رکھتے ہیں لہٰذا کائنات کو یونہی دیکھتے ہیں۔

We See the Universe, the Way it is Because We exist.

اسٹیفن ہاکنگ کا کہنا ہے کہ مذہب کے اس دعوے پر یقین کرنا بڑا مشکل ہے کہ یہ وسیع و عریض کائنات خدا نے صرف انسان کے لئے بنائی ہوئی ہے۔ وہ دلیل پیش کرتا ہے ہمارا نظام شمسی تو بہر حال ہمارے وجود کے لئے ضروری تھا اور اس میں زیادہ سے زیادہ اپنی کہکشاں کو شامل کیا جاسکتا ہے، جس کے ابتدائی ستاروں نے ان بھاری عناصر کے بننے میں مدد کی...... جس کے بعد سیاروں کی تخلیق ہوئی لیکن اس کائنات کی دوسری اربوں کہکشاؤں کی ضرورت کی کوئی تک نظر نہیں آتی، نہ اس کی کوئی وجہ نظر آتی ہے کہ اسے اتنے بڑے پیمانے پر چاروں طرف یکساں بنا دیا جائے اور پھر بگ بینگ کی ابتدائی شرح پھیلاؤ ایسی رکھی کہ یہ شروع ہوتے ہی ختم (Recollaps) ہو کر دوبارہ بلیک ہول نہ بن جائے۔ یہ یقین کرنا بڑا مشکل ہے کہ یہ سب کچھ محض خدا کا عمل تھا جو انسان کو پیدا کرنے کے لئے کیا گیا تھا......! جس کے بعد سے خدا کو 16 سو کروڑ سال تک انسان کے پیدا ہونے کا انتظار کرنا پڑا......!! اور وہ بھی صرف انسان کی چار روزہ زندگی کے دورانئے میں یہ دیکھنے کے لئے...... کہ وہ کوئی برے کام تو نہیں کر رہا......!

سائنس سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ اتنا سارا مادہ کہاں سے آیا؟ اس کا جواب (Quantum Theory) یوں دیتی ہے کہ ذرات (Particles) کو توانائی سے (Anti Particles) کے جوڑوں (Pairs) کی شکل میں تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ سوال ہوگا کہ اتنی توانائی آئی کہاں سے؟ اس کا جواب یوں ہے کہ دراصل کائنات کی مجموعی توانائی صفر (Zero) ہے۔ کائنات کا سارا مادہ مثبت توانائی سے بنا ہے۔ مادہ کشش ثقل کی وجہ سے ایک دوسرے سے جڑا رہتا ہے۔ مادے کے دو ٹکڑے جو ایک دوسرے کے قریب ہوں کم توانائی رکھتے ہیں، بہ نسبت اس کے جب وہ بہت دور ہوں کیونکہ انہیں کشش ثقل کا زور توڑنے کے لئے توانائی صرف کرنی پڑتی ہے یعنی کشش ثقل کے زیر اثر دائرے **(Gravitational Field)** منفی توانائی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کائنات مکان میں تقریباً یکساں (Uniform) ہے۔ لہٰذا ثابت کیا جاسکتا ہے کہ منفی توانائی، مثبت توانائی (جو مادے کی نمائندہ ہے) کو ٹھیک مساویانہ طور پر منسوخ کر دیتی ہے۔ چنانچہ کائنات کی حاصل جمع توانائی صفر (Zero) ہو جاتی ہے۔ اب صفر اور صفر کو جمع کریں، جواب صفر ہی آئے گا۔ چنانچہ کائنات مثبت توانائی کو دوگنا کر سکتی ہے اور ایسے ہی اپنی منفی توانائی کو بھی...... جس سے نتیجہ صفر ہی رہے گا۔ اس طرح کائنات کے پھیلاؤ کے ساتھ مادے میں اضافہ بھی ممکن رہتا ہے۔ کائنات (توانائی) کی اس عجیب خصوصیت پر سائنس دان Guth کا بڑا خوبصورت تبصرہ ہے۔ اس نے کہا۔

It is That There is No Such Thing As a Free

Lunch. But Universe is the Ultimate Free Lunch.

''افسوس، کہ مفت کے لنچ جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی، جب کہ یہ ساری کائنات بالکل مفت کا لنچ ہے۔''

ہمارا ذہن اکثر سوچتا ہے کہ اس کائنات کے پرے کیا ہے؟ اس لئے خدا کا خیال (Otherness) سے جڑا ہوا ہے لیکن آئینن اسٹائن کا کہنا ہے کہ زمان و مکان محدود (Finite) ہونے کے باوجود کوئی کنارہ (Boundary) نہیں رکھتے۔ لہٰذا کنارے یا اس سے پرے کیا حرکات و سکنات ہو رہی ہیں؟ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... یہ کائنات قطعاً (Self-Contained) یعنی اپنے آپ میں سالم و مکمل ہے۔ اس کی ذات سے باہر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہو رہی...... بلکہ بے کنار دنیا سے ''باہر'' کا سوال غیر منطقی بھی ہے اور غیر سائنسی بھی۔ یہ کائنات نہ تخلیق ہو سکتی ہے نہ ختم۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اسٹیفن ہاکنگ نے سوال اٹھایا تھا۔

What Place, Then, For a Creator?

خالق کائنات کی پھر جگہ ہی کہاں رہ جاتی ہے؟ کیا اس عالم کون و مکان کو کسی خالق کی ضرورت ہے اور اگر ہے تو اس خالق کا اس کائنات پر کوئی اور اثر ہے؟ اور پھر اس کو کس نے تخلیق کیا تھا......؟ مادے اور فطری مظاہر کی سائنسی توجیہات سامنے آنے کے بعد انسان پر یہ بات کھلتی گئی کہ اس حیات و کائنات کا سارا نظام کسی ماورائی طاقت (Divine Power) کی مرضی و منشاء سے نہیں چل رہا بلکہ کچھ قوانین فطرت (Laws of Nature) ہیں جو سارے عمل و حرکت کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ چنانچہ اگر فطرت کو مسخر کرنا ہے تو کسی روحانی یا ماورائی قوت کی طرف رجوع کرنے کی بجائے ان قوانین فطرت کو سمجھنا ہوگا۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسا سیکولر کلچر پیدا ہوا جس میں خدا کا دائرہ کار اور حلقہ اثر محدود ہوتے ہوتے صرف خالق کائنات کی حیثیت تک رہ گیا۔ اہل عقائد نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دی کہ قوانین فطرت بھی تو آخر خالق کائنات (خدا) نے ہی بنائے ہیں، چنانچہ مذہب ذاتی روحانی عمل (Private Spiritual Matter) تک محدود ہو گیا۔ زندگی اور دنیا کی ساری جدوجہد سائنسی علوم کی روشنی میں ہونے لگی، البتہ خدا اس سارے نظم جہاں کے سپریم خالق کے طور پر دیکھا جانے لگا لیکن بیسویں صدی کے دوران طبیعات (Physics) اور فلکیات (Cosmology) کے علوم نے اتنی ترقی کر لی اور ایسے حقائق سامنے آ گئے کہ تخلیق کائنات کا سوال بھی سائنسی کے دائرہ کار میں چلا آیا اور سائنس دانوں میں بحث و مباحثے شروع ہو گئے اور اس سوال کے ایسے سائنسی جواب سامنے آئے کہ مذہبی حلقوں میں تشویش لاحق ہوئی کہ خدا کا بطور خالق کائنات کا آخری منصب بھی اب خطرے میں ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دہریئے بھی سائنس کی اس حرکت پر خوش نہ ہوئے...... وجہ یہ تھی کہ جیسے اہل عقائد کا کہنا تھا کہ خدا ہمیشہ سے ہے کیوں کہ اس کا کوئی جواب نہیں ہے کہ خدا کہاں سے آیا، اسی طرح دہریئے بھی یہ کہہ کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے کہ یہ مادی کائنات ہمیشہ سے ہے۔ اس لئے کہ ان کے پاس بھی کائنات کہاں سے آئی کا جواب نہیں تھا۔ لیکن سائنس اس سوال پر جرأت مندانہ قدم اٹھا چکی ہے اور آج کے علم اور ٹیکنالوجی کے حساب سے اس کے پاس تخلیق کائنات سے وابستہ سوالوں کے جواب اور ثبوت موجود ہیں اور اس پر سائنس دانوں کے درمیان اکثریتی اتفاق رائے بھی پایا جاتا ہے۔

خدا مقابلہ انسان دراصل معلوم بمقابلہ نامعلوم تھا۔ خدا علامت تھی (Otherness) کی۔ یعنی انسان کے علم و ادراک کے باہر جو کچھ تھا وہ خدا سے منسوب تھا۔ جہاں انسان کا بس اور علم ختم ہوتا، وہاں خدا کی فرمانروائی شروع ہوتی۔ جوں جوں انسان کے علم و ادراک اور قوت و اختیار میں اضافہ ہوتا گیا۔ خدا کی خدائی چلی گئی اور آخر کار بات آخری سوال تک آن پہنچی، لیکن افسوس تا حال کسی ماورائی طاقت کا وجود یا اس کے کسی طرح کے اثرات اس کائنات کے چلانے میں تو کجا...... تخلیق کائنات کے سوال پر بھی نہیں ملے! زیر نظر مضمون میں تخلیق کائنات کے سلسلے میں سائنس کی ''بگ بینگ'' کی تھیوری کا مختصر احوال پیش کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں کئی طرح کے جو سوال ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں، اب ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس ان کا کیا جواب دیتی ہے ہے مثلاً سائنس کا یہ کہنا کہ کائنات پھیل رہی ہے تو سوال پیدا ہوگا کہ اس کائنات سے باہر کوئی ''مکان'' موجود ہے جہاں سے یہ مزید جگہ لے رہی ہے۔ جب کہ سائنس کا یہ کہنا کہ کائنات سے ''باہر'' نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ سائنس کہتی ہے بات ایسی نہیں کہ بگ بینگ کے وقت کوئی لامحدود خالی (Void) جگہ تھی کہ دھماکہ ہوا اور کہکشائیں اس کی گہرائیوں میں پھیلتی اور منتشر ہوتی چلی گئیں۔ آئین اسٹائن کا عمومی نظریہ اضافیت (General Theory of Relativity) یہ بات ثابت کر چکا ہے کہ ''مکان'' (Space) کسی ثابت و ساکن میدان کا نام نہیں بلکہ یہ پھیلنے (Stretch) اور خم (Warp) کھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ''مکان'' اصلاً کشش ثقل کے میدان (Gravitational Field) کا دوسرا نام ہے اور جب بات کائنات کی سطح کی ہوتی ہے تو کشش ثقل کے میدان کے خم کھانے کا یہ عمل مکان کی شکل میں واقع ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ پھیلتا چلا جاتا ہے، چنانچہ یہ کائنات ایک غبارے کی مانند ہے جو اندر سے پھولتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ ''مکان'' کی تخلیق بھی بگ بینگ کے ساتھ شروع ہوئی اور عدم (Nothing) سے چارسو بڑھتی کائنات کی ناقابل تصور وسعتوں تک پھیل گئی۔

دوسرا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اس داغ اول یا بلیک ہول کا محل وقوع (Location) کیا تھا جہاں سے یہ کائنات پھوٹ پڑی تھی؟ سائنس کا کہنا ہے ک وہ بلیک ہول کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کے اردگرد خالی جگہ ہو کیونکہ وہ ''مکان کی تخلیق کا بھی لمحہ تھا۔ بیشتر جو لامحدود حد تک دب چکی تھی اور نہ ہی وہ داغ لامحدود دورانیے کے لئے بیٹھتا ہے وہ پلک جھپکنے میں عدم سے ظاہر ہوتا ہے اور فوری طور پر پھیل جاتا ہے۔ بگ بینگ سے قبل دورانیے کی بات یوں بھی نہیں ہو سکتی کہ خود وقت (زمان) کا جنم بھی بگ بینگ کے ظہور سے شروع ہوتا ہے۔ سائنس یہ بات زور دے کر کہتی ہے کہ زمان اور مکان اس مادی کائنات کا حصہ ہیں نہ کہ کائنات ان کے اندر اپنا وجود رکھتی ہے۔ کائنات کی ابتدا ہی زمان و مکان کا نقطہ آغاز تھا۔ چنانچہ یہ کہنا بے معنی ہے کہ بگ بینگ سے ''پہلے'' کیا تھا لیکن یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ ''کچھ نہیں'' تھا بھی تو ''کچھ نہ کچھ'' تھا...... ایک تجریدی حالت (Abstract State) میں ''لامکان'' جس سے مکان نے جنم لیا۔ چنانچہ اہل عقائد دعویٰ کرتے ہیں کہ ''کچھ نہیں''، ''عدم'' یا ''لامکان'' جو بھی تھا وہی خدا تھا لیکن سائنس اس کی تردید کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اس کے ''کچھ نہیں'' سے مراد ''قطعاً کچھ نہیں'' (Absolute Nothing) ہے۔ اسے ''لامکان'' یا ''عدم'' نام کی کسی چیز یا حالت سے تعبیر نہ کیا جائے۔ اسی الجھن کو اسٹیفین ہاکنگ نے یہ سوال کر کے سمجھایا کہ ''قطب شمالی کے شمال میں کیا ہے؟'' جواب ہوگا ''کچھ نہیں'' کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ قطب

شمالی کے شمال میں ''کچھ نہیں'' نام کی کوئی پراسرار جگہ واقع ہے بلکہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ جس منطقے کی طرف اشارہ کیا گیا، اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ نہیں کہ کوئی جسمانی وجود نہیں ہے بلکہ منطقی لحاظ سے بھی عدم وجود ہے۔ ایسی ہی حالت بگ بینگ سے قبل کی تھی۔ اس پر کچھ لوگ معترض ہو سکتے ہیں کہ سائنس دان ہم سے لفظوں کا کھیل کھیل کر اور منطق کی مار دے کر کچھ چالبازی کر رہے ہیں۔ وہ شبے میں پڑ سکتے ہیں کہ سائنس دان کائنات کی آخری حقیقت بتانے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ وہ زمان و مکان کے وجود اور عدم وجود کے گنجلک چکروں میں ڈال کر اپنے مخالفین کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ اس کے جواب میں سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ایسے سوالات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ہمارے ذہن علت ومعلول کی اصطلاح میں سوچنے کے عادی ہیں۔ چونکہ نارمل حالات میں پہلے کوئی مادی سبب زمان کے اندر پیدا ہوتا ہے اور اس سبب سے پھر ایک اثر (Effect) چلتا ہے لیکن آج کی فلکیاتی سائنس (Cosmology) کائنات کے ابتدا کے سوال پر جب ہمیں دعوت فکر دیتی ہے تو اس کے پیچھے کوئی ایسا سبب یا علت موجود نہیں جو عام فہم (Normal Sense) کے دائرے میں آ سکے۔ اس لئے نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی مافوق الفطرت علت (Cause) ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا قبل از زمانہ (Prior Epoch) وجود ہی نہیں رکھتا، جس میں علت پیدا کرنے والی کوئی ایجنسی......خواہ وہ فطری ہو یا ماورائے فطرت......عمل پیرا ہو سکے یعنی کائنات کے وجود میں آنے سے قبل کوئی دور یا زمانہ ہوتا تو پھر یہ سوال اٹھتا......کہ وہ خدا تھا یا کوئی مادی وجوہ جس نے بگ بینگ کے عمل کو متحرک کر دیا لیکن ٹھہریئے بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی کہ سائنس صرف ماقبل دور (Preceding Epoch) کے عدم وجود کا سہارا لے کر ہی تخلیق کائنات کی تشریح کرتی ہے کیونکہ سوال وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے کہ آخر اچانک زمان اور مکان کا سوئچ آن کیسے ہو گیا۔ اس سلسلے میں جو جدید ترین سائنسی سوچ ہے اس کا کہنا ہے کہ یک لخت بلاتحریک غیر مکان وزمان کا پیدا ہو جانا (Qantum Mechanics) کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ علم طبیعات کی وہ شاخ ہے جس سے ایٹمی ذرات کا مطالعہ Heisenberg کے اصول غیر یقینی (Principle of Uncertainity) کو لاگو کر کے کیا جاتا ہے جس کے مطابق تمام مشاہداتی مقداروں میں اچانک اور ناقابل پیش گوئی اتار چڑھاؤ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مذکورہ کوانٹم اتار چڑھاؤ (Quantum Fluctuations) کے پیدا کرنے میں قطعاً کسی چیز کا ہاتھ نہیں ہوتا، وہ حقیقی طور پر از خود پیدا ہوتے ہیں اور اپنی گہری ترین سطح تک فطرت میں جبلی طور پر پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب کوانٹم کے اصول زمان، مکان پر لاگو کئے جاتے ہیں تو اس بات کا امکان ایک سائنسی حقیقت اختیار کر لیتا ہے کہ زمان و مکان کا سوئچ کسی وقت بھی آن ہو سکتا ہے یا وہ بھک سے وجود میں آ سکتے ہیں بغیر کسی سبب اور علت کے۔ ہاکنگ کی تھیوری کے مطابق زمان ومکان سے مسلسل نکلتا رہتا ہے اور کوئی خاص (Specific) پہلا لمحہ نہیں ہوتا جہاں سے وقت شروع ہوتا ہے اور نہ ہی وقت کو پیچھے کی طرف ابدیت تک لے جایا جا سکتا ہے۔

اب یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ سائنس جنہیں قوانین فطرت (Laws of Physics) کہتی ہے، وہ کیا کائنات کے رو پذیر ہونے سے پہلے ہی وجود رکھتے تھے؟ سائنس کہتی ہے یہ قوانین زمان ومکان کے اندر وجود نہیں رکھتے۔ وہ دنیا کو صرف بیان کرتے ہیں خود اس ''میں'' نہیں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ کائنات کے ساتھ ایک پیکج کے طور پر

عدم سے وجود میں آ گئے تھے کیونکہ اس طرح ہم ان قوانین سے نہیں پوچھ سکتے کہ کائنات کا آغاز کہاں سے ہوا تھا، لہٰذا تخلیق کائنات کو سائنسی طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان قوانین کو ایک تجریدی اور ابدی خصوصیت عطا کریں۔ سوال یہ ہے کہ یہی قوانین کیوں بنے اور طرح کے قانون کیوں نہ بن گئے۔ سائنس دان اس مابعدالطبیعاتی مسئلے میں مختلف رویے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ان قوانین کو ایک ننگی حقیقت کے طور پر قبول کر لینا چاہیے۔ کچھ کہتے ہیں قوانین وہی ہونے چاہئیں جو منطقی ضرورت کو پورا کریں اور کچھ سائنس دانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ بہت سی دنیاؤں میں سے ایک ہے اور یہاں پر ایسے قوانین کا وجود محض اتفاق ہے اور کچھ شکی لوگ تو اس حد تک جاتے ہیں کہ ان قوانین کا وجود ہی نہیں۔ یہ انسان کی اپنی ایجاد ہیں تاکہ اس مادی دنیا کو سمجھا جا سکے، لیکن وہ تمام سائنس دان جو بنیادی مسائل پر تحقیق کر رہے ہیں وہ ان قوانین کو کسی حد تک خودمختار حقیقت کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے یہ دلیل دینی ممکن ہو جاتی ہے کہ مذکورہ قوانین فطرت منطقی طور پر اس کائنات سے پہلے موجود تھے جنہیں یہ بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس موڑ پر پہنچ جاتے ہیں کہ تخلیق کائنات کے سوال کو روایتی سلسلہ علت (Causal Chain) سے سمجھنے کی بجائے تشریحی سلسلے (Explanatory Chain) کے اصول کو اپنائیں۔

المختصر ہم اس مقام پر آ چکے ہیں جب خالق کائنات کی بحث فلسفے سے نکل کر سائنس کی لیبارٹری میں داخل ہو چکی ہے۔ کائنات اور انسانی شعور اس سے وابستہ سوالوں کے جوابات کیا دے رہے ہیں۔ اس کتاب کے گذشتہ صفحات میں مختصراً جائزہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے، جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسانی ذہن اور عملی حقائق مذہب کے پیش کردہ تصور خدا سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ جب تک وجود خدا کی حتمی تصدیق عقل اور سائنس کی طرف سے نہیں آ جاتی، اس وقت تک عقیدے کا دعویٰ بہرحال کمزور اور مشکوک ہی سمجھا جاتا رہے گا......